تذکرہ

سنہ ۱۹۱۹ء

کے ایڈیشن کے مطابق

مرتبہ

فضل الدین احمد مرزا

ابوالکلام آزاد

هٰذہ تذکرہ

تذکرہ

یعنی

مولانا ابوالکلام

اور ان کے خاندان کے بعض اکابر و شیوخ
کے سوانح و حالات جس کا پہلا حصّہ تمامتر
انہی کی تصنیف ہے!

مرتبہ

فضل الدین احمد مرزا بی، اِس سی۔
ای، ام۔ ایف، جی، اس (دیوکو)

کتابی دنیا ⭑ لاہور

پہلے اڈیشن میں مولانا نے جن غلطیوں کے متعلق اشارہ کیا
تھا۔ اُن کی حتی الوسع تصیح کر دی گئی ہے

قیمت : سات روپے

چوہدری سلطان محمد برنٹر پبلشر نے کوآپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر کتابی دنیا میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا

اعتذار

یہ اجزا جس وقت لکھے گئے، اس وقت وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس قدر جلد اور اہم تالیفات سے پہلے شائع ہوجائیں گے۔ متعدد حصے نظرِ ثانی کے محتاج تھے۔ ضمنی مطالب میں بھی بہت طول ہوگیا۔ نہیں معلوم نظرِ ثانی کے بعد کتاب کی صورت کیا ہوگی؟ لیکن مرزا فضل الدین احمد صاحب نے بلا میرے علم ومشورہ کے اصل مسودہ چھاپنا شروع کردیا۔ مجھے جب اطلاع ملی تو دو ثلث سے زیادہ حصہ چھپ چکا تھا۔ مرزا صاحب کی تعجیل ان کے شوق وذوق محبت کا نتیجہ ہے ان کا شکر گذار ہوں۔ کتاب کے نقائص میرے نقص کار وضعفِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے شرمسار ومعافی خواہ ہوں۔ چونکہ کتاب کا بڑا حصہ چھپ چکا تھا، اس لئے بقیہ اجزا کی نظرِ ثانی وتہذیب پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ لوگوں نے اپنی دل جمعی وفراغ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنی پریشان خاطری اور پراگندگی طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے

بگذارید کہ ایں نسخہ مجزا ماند!

(۲) کتاب جس قدر صحیح چھپی ہے، وہ اردو ٹائپ کی مشکلات تصحیح دیکھتے ہوئے نہایت تعجب انگیز ہے۔ "الہلال" وغیرہ کا پروف میں خود دیکھتا تھا۔ مگر پھر بھی غلطیاں رہ جاتی تھیں عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ لیتھو کے کاپی نویسوں کے مقابلہ میں کمپوزیٹروں سے معاملہ کس قدر مشکل ہے؟ جا بجا جو غلطیاں رہ گئی ہیں، زیادہ تر عبارت اور حروف وروابط کی غلطیاں ہیں جو فہم مطالب میں مخل نہیں۔ یا عربی الفاظ وتراکیب کی ایسی غلطیاں جن کو پڑھنے والے خود محسوس کرلیں گے۔ مثلاً "ما احسن قول الشاعر" کی جگہ "ما احسن القول الشاعر" وغیرہ۔ البتہ چند مقامات کی نسبت اشارہ ضروری ہے:

(۳) بعض مقامات میں حرف "کو" کا استعمال اس طرح ہوا ہے، جس کو خلاف فصاحت

سمجھتا ہوں۔ مثلاً "فلسفہ پڑھا" کی جگہ "فلسفہ کو پڑھا" یا "یہ ننگ کیوں قبول کرنے لگے" کی جگہ "اس ننگ کو کیوں قبول کرنے لگے" یا "دو قسمیں املاء اور تحدیث قرار دی ہیں" کی جگہ "املاء اور تحدیث کو قرار دیا ہے" یا "غلطیاں اپنے دامن میں رکھتی ہے" کی جگہ "غلطیوں کو اپنے دامن میں رکھتی ہے"۔ معلوم نہیں میں خود ہی ایسا لکھ گیا ہوں یا طباعت کے تصرفات ہیں؟ بہرحال صحیح کر لینا چاہیئے۔ اسی طرح ایک جگہ "ہمیں مار ڈالو" کی جگہ "ہم کو مار ڈالو" ہے۔ حالانکہ فصیح اوّل الذکر ہے۔

(۴) کتاب میں جابجا مختلف علوم اور مختلف جماعتوں کا ذکر آگیا ہے۔ ممکن ہے بعض مقامات کے نقد و تعقب میں زیادہ سختی و تلخی محسوس ہو۔ اب دیکھتا ہوں تو خود بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ اس طرح کا نشیب و فراز ان تحریروں میں ضرور ہو جاتا ہے جو مختلف حالات و اثرات میں لکھی جاتی ہیں۔ نظرِ ثانی کی ضرورت ایسی ہی باتوں کے لیئے ہوتی ہے۔ معہذا اگر ان مباحث میں کتاب کی اصلی حیثیت پیشِ نظر رہی تو یہ معاملہ موجب تشویش خاطر نہ ہوگا۔

کتاب میں جہاں کہیں اس قسم کا تذکرہ آگیا ہے، وہ محض ناقدانہ و باحثانہ ہی نہیں ہے بلکہ اصلاح و تذکیر کا مقصد بھی پیشِ نظر ہے۔ دونوں کی راہ اور کاروبار ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئے ہیں۔ مجرد علم و نظر کا طریقہ دوسرا ہے۔ اصلاح و دعوت کا دوسرا۔ ایک ناقد و باحث صرف حقیقت کے کشف و علم کا طالب ہوتا ہے، لیکن ایک داعی صرف انکشاف پر قناعت نہیں کر سکتا۔ عملی و فعلی نفوذ و ظہور کا بھی طالب ہوتا ہے۔ ناقد و باحث کا فرض یہ ہوتا ہے کہ جب کسی معاملہ پر بحث کرے تو علم و نظر کی بنا پر جس قدر ضعف و قوت یا حسن و قبح نظر آئے، بلا کسی تاثر و احساس کے ٹھیک واضح کر دے۔ وہ اس کام میں جس قدر اپنے تئیں بے اثر، بے حس، بے میل، ظاہر کرے گا، اتنا ہی زیادہ صحیح النظر سمجھا جائے گا۔ یعنی اس کا کام محض حسن و قبح کی تمییز و تحقیق ہے۔ خود اس کو نہ حسن سے عشق ہے، نہ قبح سے نفرت۔ برخلاف اس کے ایک مصلح و داعی کا اصل مقصود عشق محاسن و بغض قبائح ہوتا ہے، اور چونکہ یہ معاملہ بغیر امتیاز و کشف کے ممکن نہیں، اس لیئے ضمناً بحث و نظر کی منزل سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔

یہ اثر سب سے پہلے خود مصلح و داعی پر طاری ہوتا ہے۔ پھر وہ چاہتا ہے کہ اسی قوت اور نفوذ کے ساتھ دوسری پر بھی چھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بحث و نظر کی راہ میں جذبات کی شرکت نقص ہے مگر دعوت و تبلیغ کی راہ سرتاسر جذبات سے معمور ہوتی ہے۔

بحث و نظر حکماء کی حکمت ہے، اور دعوت و تبلیغ انبیاء کرام کی حکمت یؤتی الحکمۃ من یشاء۔ ومن یؤت الحکمۃ، فقد اوتی خیراً کثیراً۔ وما یذکر الا اولوا الالباب!

پس یہ امر پیش نظر رہے کہ کتاب میں جہاں کہیں اس قسم کے مطالب آگئے ہیں، مقصود اصلی ان سے اصلاح و دعوت ہے، اور اس لئے ضروری ہے کہ مکروہات کے بیان میں یک گونہ تشدد اور محاسن کے تذکرہ میں ایک حد تک استغراق نمایاں ہو۔ طلب صرف علم و نظر ہی کی نہیں ہے۔ عمل کی ہے۔ پس برائی کا منظر جس قدر زیادہ بھیانک اور مکروہ دکھایا جا سکے عین مطلوب، اور اچھائی کا سراپا جس قدر بھی دلفریب کھینچا جا سکے عین مقصود۔ یہاں ارباب بحث و نظر کی طرح مقیاس و میزان ہاتھ میں نہیں رکھا ہے۔ صرف حسن پرست دل پہلو میں ہے۔ اگر غلو و اغراق اسی کا نام ہے، تو اس سے نہ انکار ہے نہ گریز:

طربنا التعریض العذول بذکرکم

فنحن بواد والعذول بواد

(۵) ایک فصل میں مسئلہ نفاذ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً کا ذکر آگیا ہے۔ یہ امر پیش نظر رہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ مسئلہ کی اس تشریح و تعبیر سے تعلق رکھتا ہے۔ جو بعض علماء حیل کے طرف سے بیان کی گئی ہے۔ باقی رہا اصل مسئلہ اور ہمارے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جانب اس کی نسبت، سو اول تو اس نسبت کی صحت میں نظر ہے ثانیاً مسئلہ کی اصل حقیقت و صورت متاخرین کی نکتہ سنجیوں میں گم ہو گئی ہے۔ بات کچھ تھی اور رفتہ رفتہ سوء تعبیر سے کچھ ہو گئی۔ کتاب کے آخر میں بعنوان مستقل اس پر ایک مفصل فصل لکھ چکا ہوں۔ چونکہ کتاب دو حصوں میں بٹ گئی، اس لئے وہ فصل اب دوسری جلد کے ساتھ شائع ہو گی۔ جن حضرات کیلئے یہ بحث تشویش خاطر کا موجب ہو ان کو دوسری جلد کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہیئے۔

رانچی

احمد

اکتوبر ۱۹۱۹ء

مقدمہ

فیضی حسنت از یں عشق، کہ دوران امروز
گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را!

سنہ ۱۹۱۲ء

سنہ ۱۹۱۲ء کا زمانہ بھی ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ ایک یادگار زمانہ رہے گا۔ یہی زمانہ ہے جب مسلمانانِ ہند کی مذہبی و سیاسی حالت میں یکا یک ایک انقلاب عظیم رونما ہوا، اور قوموں کی زندگی میں جو تبدیلی بتدریج برسوں کے اندر پیدا ہو سکتی ہے وہ بظاہر چند مہینوں کے اندر تمام قوم میں پیدا ہو گئی!

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانانِ ہند من حیث القوم پولیٹکل جد و جہد سے بالکل الگ تھلگ رہنے کو اپنی قومی پالیسی سمجھتے تھے، اور ملک کی سیاسی زندگی کا پورا میدان صرف ہندوؤں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی مگر اس کا پالیٹکس بھی صرف یہی تھا کہ ملک کی عام سیاسی ترقی کی روک تھام میں دفتری اقتدار کا ہاتھ بٹائے اور جہاں تک ممکن ہو حرکت اور ترقی کو روکے۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ مسلمانوں کا پولیٹکل کام یہ نہیں ہے کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کرے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہندوؤں کی پولیٹکل جد و جہد کی

مخالفت کرے۔ مسلمانوں میں سے گنتی کے چند افراد جو انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہوتے تھے، ان کے سامنے بھی خود اپنی کوئی راہ نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف کانگرس میں شریک ہو جانا، اور ہندوؤں کی دیکھا دیکھی طلب حقوق اور ملکی حالت کی تبدیلی پر زور دینا، اور ہر کام میں ان کا نمونہ سامنے رکھنا مسلمانوں کے لیئے ترقی کی بڑی سے بڑی معراج ہے۔

مذہبی حالت جو عام طور پر ہو رہی تھی، علی الخصوص تعلیم یافتہ جماعت کی، وہ محتاج بیان نہیں مذہب کے علم و عمل سے سب یک قلم بے بہرہ تھے، اور عموماً ایک عام بے پروائی اور بے تعلقی چھائی ہوئی تھی۔ اسلام کا علاقہ محض ایک برائے نام قومی رشتہ سمجھا جاتا تھا، اور وہ بھی بہت سی طبیعتوں پر سخت شاق تھا۔ ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو مذہب اور مذہب کے ہر خیال کی تحقیر کرنا اور اس کو خلاف عقل و تہذیب تبلانا اپنا قابلِ فخر کارنامہ سمجھتے تھے۔ یہ بات عام طور پر مسلم ہو چکی تھی کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اور اسکول و کالج کی تعلیم اور مذہبی زندگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھا ہوا نماز پڑھتا نظر آجاتا، یا قرآن شریف کی کوئی آیت اس کی زبان و قلم سے نکل جاتی، تو لوگوں کو ایک نہایت تعجب انگیز اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا۔ ایک خاص واقعہ کی طرح اس کا ذکر کیا جاتا کہ فلاں شخص نے کالج میں تعلیم پائی ہے اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتا ہے! یہ تعجب بیجا بھی نہ تھا۔ جن لوگوں کو مذہب کی ضرورت اور خدا کی ہستی میں بھی شک ہو، اُن سے مذہبی معلومات اور نماز روزہ کی پابندی کی کیا امید کی جا سکتی ہے؟

غیر انگریزی خواں طبقہ اگرچہ بظاہر اس قدر مذہب سے بیگانہ نہ تھا، لیکن مذہب کی حقیقی زندگی اس میں بھی مفقود تھی، اور اصلی مقصد کا اس کو بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ یہ خیال ہر شخص پر چھایا ہوا تھا کہ اسلام کی تعلیم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا کو ترک کر دو اور صرف نماز روزہ اور ورد و وظائف میں زندگی بسر کر دو۔ اگر اتنا نہیں ہو سکتا تو خیر لباس اور کھانے پینے رہنے سہنے کے معاملات میں کوئی نئی بات اختیار نہ کرو۔ کسی عالم یا پیر صاحب سے آمد و رفت جاری رکھو، اور اللہ اللہ کرتے دنیا سے چل بسو۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات

نہیں جس کی اسلام تعلیم دیتا ہو اور جس کی ایک مسلمان کو ضرورت ہو۔

زبان سے اگرچہ ہمیشہ کہا جاتا تھا کہ دین و دنیا کی کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جو قرآن شریف نے نہ بتلائی ہو، لیکن یہ محض ایک خوش اعتقادی کی بات تھی جو رسماً زبان سے کہی جاتی تھی۔ نہ تو اس پر کسی کا دلی یقین تھا۔ نہ کسی نے اس کو عملاً ثابت کر کے دکھلایا تھا۔ جو لوگ سچے دل سے اس کو مانتے تھے، وہ بھی کبھی اس کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دیتے تھے کہ گو قرآن میں سب کچھ ہے مگر اس کو بڑے بڑے اماموں اور ولیوں کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔ اور نہ اس پر غور کرنے یا عمل کرنے کی تمام مسلمانوں کو ضرورت ہے!

قوم کا سب سے زیادہ محترم طبقہ علماء و مشائخ کا ہے۔ لیکن اس جماعت کا یہ حال تھا کہ گویا اس کو مسلمانوں کی موت وحیات سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ قوم کا جاہل سے جاہل اور ادنیٰ سے ادنیٰ طبقہ بھی دنیا کے حالات اور مسلمانوں کے قومی زوال کی جتنی خبر رکھتا تھا، اتنی بھی ہمارے دین و دنیا کے ان پیشواؤں کو نہ تھی۔ دنیا میں کیا انقلابات ہو رہے ہیں؟ مسلمانانِ عالم پر کیا گزر رہی ہے؟ ان کی قومی زندگی کس کس طرح مٹائی جا رہی ہے؟ خود ہندوستان میں ہمارا روز بروز کیا حال ہو رہا ہے! یہ تمام باتیں اس مقدس گروہ کے نزدیک دنیا اور دنیا داری کی باتیں تھیں جن کا وہم و گمان بھی ایک عالمِ دین کے لئے باعثِ عار تھا۔ قوم قوم پکارنا یا مسلمانو کی قومی و ملکی حالت کی فکر کرنا، اور اس کے لئے لوگوں میں تحریک پیدا کرنا بھی ان حضرات کے نزدیک نیچریت میں داخل تھا جس سے ہر متقی پرہیزگار مسلمان کو پناہ مانگنی چاہیئے۔ عام طور پر اس گروہ کا اعتقاد یہ تھا کہ ہمارا کام صرف "دین" ہے۔ اور "دین" کا مطلب یہ ہے کہ نماز روزہ کے مسائل بتا دیئے جائیں، یا کفر کے فتووں پر مہریں کر دی جائیں، یا شاگردوں کو چند کتابیں پڑھا دی جائیں۔ باقی رہی مسلمانوں کی قومی زندگی اور ان کی موت وحیات، تو یہ تمام باتیں "دنیا داری" کی باتیں ہیں، یا "سیاسی" علماء دین اور مشائخِ طریقت کو ان سے کیا واسطہ؟

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند　　گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اگر ان میں سے کسی بزرگ کو چند لمحوں کے لئے قوم کی حالتِ زار پر توجہ بھی ہوتی تھی تو یہ کہہ کر خود اپنے اور اپنے معتقدین کے دلوں کو تسکین دے دیتے تھے کہ اب ہماری تمہاری کوشش سے کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو قیامت قریب ہے اور مسلمانوں کی تباہی لازمی۔ سارے کاموں کو حضرت امام مہدی کے نکلنے کے انتظار میں ملتوی کر دینا چاہیئے۔ اس وقت ساری دنیا خود بخود مسلمانوں کے لئے خالی ہو جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ مذہب اور قرآن کا ذکر ہمیشہ ان بزرگوں کی زبانوں پر جاری رہتا تھا، مگر قرآن کو جیسی شکل میں خود انہوں نے دیکھا تھا ویسی ہی شکل دوسروں کو بھی دکھلاتے تھے۔ وہ شکل اس قابل تو ضرور تھی کہ قیمتی کپڑوں میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دی جائے، مگر ایسی نہ تھی جو ہمارے دلوں میں گھر کرتی، اور خدا سے پھرے ہوئے سروں کو پھر خدا کے سامنے گرا دیتی!

قوم کے جو بعض سربرآوردہ اشخاص آج نئی قومی زندگی کے رکن سمجھے جاتے ہیں، خود ان سب کا بھی یہی حال تھا۔ "کامریڈ" کلکتہ سے نکل چکا تھا، اور اس کی مخصوص انگریزی انشاپردازی نے تمام ملک میں شہرت پیدا کر لی تھی۔ لیکن پالیسی اور تحریک کے اعتبار سے وہ بھی اس پرانی روش کا نقیب تھا اور قوم کے لئے کوئی نیا نصب العین سامنے نہیں رکھتا تھا۔ وہی کانگرس اور ہندوؤں کی مخالفت اور وہی پالیٹکس میں قناعت و توکّل کی تعلیم اس کے صفحات پر بھی نظر آتی تھی۔

اسی اثنا میں دہلی دربار ہوا اور تقسیمِ بنگال کی منسوخی کا اعلان کیا گیا۔ اس واقعہ نے تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں پر یہ حقیقت روشن کر دی کہ ان کی پولیٹکل پالیسی لائق تبدیلی ہے۔ لیکن پھر بھی نہ تو کوئی نئی راہ کھلی اور نہ کوئی ایسا قدم آگے بڑھا جو مسلمانوں کو دوسری قوموں کی پیروی سے ہٹا کر خود انکی اپنی راہ ان کو دکھلا دیتا۔

"الہلال"

یہ حالت تھی، کہ یکایک کلکتہ سے "الہلال" نکلا۔ اور اس شان سے نکلا، کہ تمام ملک

کی نظریں بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کی ہر بات انقلاب انگیز تھی اور ہر بات نئی۔ ظاہری شکل وصورت بھی نئی۔ اور باطنی محاسن بھی نئے۔ ابھی دو چار نمبر ہی نکلے تھے کہ عام وخاص، ادنیٰ اعلیٰ، سب کی زبانوں پر اسی کا نام تھا، اور ہر گروہ اور ہر طبقہ کے لوگوں نے اس کے سوا سب کو بھلا دیا تھا!

اس کی سب سے بڑی یادگار خصوصیت اُس کا سرتاپا مجتہدانہ انداز تھا، اور اسی نے اس کو چند ہفتوں کے اندر وہ مقبولیت و عزت دے دی جو برسوں میں بھی بمشکل نصیب ہو سکتی ہے۔ ظاہری وضع وشکل سے لیکر مضامین ومطالب تک، ہر بات میں وہ اپنی راہ سب سے الگ رکھتا تھا، اور اپنے رنگ میں سب سے نرالا تھا۔ اس نے کسی چھوٹی سے چھوٹی اور جزئی سے جزئی بات میں بھی دوسروں کی تقلید نہ کی، بلکہ تقلید وپیروی کے لئے خود اپنا نمونہ پیش کیا۔ مذہبی دعوت وتبلیغ، پولیٹکل پالیسی، علمی وادبی مباحث، طرز تحریر و انشا، الفاظ وتراکیب، کوئی بات ایسی نہیں ہے جس میں اُس نے اپنا مجتہدانہ انداز ہاتھ سے دیا ہو۔ اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ یکایک ملک کے تمام پچھلے رنگ مٹ گئے، اور ہر بات میں صرف اسی کا رنگ غالب آگیا۔ لوگ بے اختیار اپنی راہیں چھوڑ کر اسی کی راہ اختیار کرنے لگے، اگرچہ کسی سے بھی آج تک اس کی ادھوری تقلید بھی بن نہ آئی۔

عام مذہبی انقلاب

"الہلال" کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ تاریخ ہند میں یادگار رہے گا، وہ پائدار مذہبی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں اس کی دعوت حق سے پیدا ہو گیا۔ لاکھوں کروڑوں مسلمان ہمیشہ قرآن شریف پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں مگر قرآن کی تعلیم کی اصلی حقیقت سب سے پہلے اسی نے آشکارا کی، اور یکایک سب کے دل میں یہ بات اتر گئی کہ ہماری دینی ودنیوی فلاح وترقی کی صرف وہی راہ صحیح ہو سکتی ہے جو اس کی رہنمائی سے کھلی ہو۔ رسمی طور پر یہ بات پہلے بھی کہی جاتی تھی، لیکن اس طرح کسی نے نہیں بتلائی تھی کہ جاہل سے لیکر عالم تک، سب کے

دلوں کو مسحور کرلے، اور سب بے اختیار ہو کر اس کی طرف کھنچ جائیں۔ اس نے نہ صرف اس کی پکار بلند کی، بلکہ قومی زندگی کی ہر بات میں قرآن کی تعلیم دنیا کے آگے پیش بھی کر دی، اور ہر طرف سے ہٹا کر قوم کو صرف مذہب کی سچی راہ پر لگا دیا۔ سیاست، معاشرت، تعلیم، ساری باتوں کی اصلی بنیاد صرف مذہب اور قرآن کی تعلیم قرار پا گئی۔ گو ابتدا میں بہت سے لوگوں نے مخالفتیں بھی کیں، لیکن رفتہ رفتہ سب نے اس کے آگے سر جھکا دیا، اور آج تمام مسلمانوں پر جو رنگ چھایا ہوا ہے، خواہ اس کا ظہور سیاسی مباحث میں ہو، یا کسی دوسری شکل میں، مگر سب چل رہے ہیں اسی راہ پر!

سب سے زیادہ یادگار اور تعجب انگیز اثر اس نے دو جماعتوں پر ڈالا، اور یہی دونوں جماعتیں تمام قوم کے لئے بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہیں۔ یعنی علما و مشائخ کا گروہ، اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت۔ اگر "الہلال" شائع ہو کر اور کوئی کام نہ کرتا۔ صرف ایک عالم، ایک پیر، ایک با اثر جدید تعلیم یافتہ شخص کو اس رنگ میں رنگ دیتا جس میں اس نے تمام قوم کو رنگ دیا ہے، تو صرف یہی کارنامہ اس کی انقلابی قوت کے اعتراف کے لئے کافی تھا علما و مشائخ کا گروہ جو اپنے مدرسوں اور حجروں سے کبھی جھانک کر بھی دنیا کی حالت پر نظر نہیں ڈالتا تھا، الہلال نے ان کو یکایک نکال کر جد و جہد کے میدانوں میں کھڑا کر دیا، اور ان میں سے ہر شخص

نے محسوس کر لیا کہ ہم اپنے اصلی فرض کو آج تک بھولے ہوئے تھے۔ تعلیم یافتہ جماعت کا یہ حال ہوا کہ یا تو یہ گروہ مذہب کے نام سے متوحش تھا، یا اب ہزاروں سر خدا کے آگے جھک گئے، اور بعض کا تو یہ حال ہوا کہ بڑے بڑے عابدوں زاہدوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ شب و روز قرآن کی صدائیں ان کی زبانوں سے نکلنے لگیں۔ اس بارے میں جیسے جیسے عجیب واقعات دیکھے اور سنے گئے ہیں، اور "الہلال" کے ایک ایک مضمون بلکہ ایک ایک سطر نے جیسے جیسے ہوشربا اثر لوگوں پر ڈالے ہیں، ان کو اگر بیان کیا جائے تو ایک پورا رسالہ بن جائے۔ مثال کے طور پر میں صرف چند محترم ناموں کا ذکر کر دوں گا۔ طبقۂ علما میں سے حضرت مولانا

محمود الحسن صاحب دیوبندی کا یہ قول خود مولانا ابو الکلام نے ایک مرتبہ مجھ سے نقل کیا تھا کہ "ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے۔ الہلال نے یاد دلایا" یہ جملہ انہوں نے اس موقعہ پر کہا تھا جب ایک شخص نے الہلال میں تصویروں کے ہونے کی شکایت کی تھی۔ تعلیم یافتہ جماعت میں فدائے قوم مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی خاں، اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ان دونوں اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اسی نے دکھلائی، اور بتدریج اپنے رنگ میں یک قلم رنگ دیا۔ ورنہ ہم لوگوں کو وہ زمانہ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ جب نیا نیا "الہلال" نکلا تھا اور مسلم یونیورسٹی کے متعلق مسٹر محمد علی نے اس کی مخالفت میں مضامین لکھے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہی "الہلال" والی صدا یونیورسٹی کے متعلق انہوں نے بھی بلند کی۔ مسٹر شوکت علی کا تو اس بارے میں عجیب حال ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ "ابو الکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ تبلا دیا" ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقاید میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے، اس کے مقابلہ میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" فی الحقیقت "الہلال" ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔

خاکسار شاید ان معدودے چند لوگوں میں سے ہے، جو ایڈیٹر "الہلال" سے "الہلال" کی اشاعت کے بعد نہیں، بلکہ بیشتر سے واقفیت رکھنے کا فخر رکھتے ہیں۔ میری ان سے پہلے پہل ملاقات ۱۹۰۲ء میں ہوئی جب وہ مشغولِ تعلیم تھے۔ کامل اٹھارہ برس اس واقعہ پر گذر گئے۔ زمانے کے حالات حوادث نے مجھے ہندوستان کے مختلف گوشوں اور پھر ہندوستان سے باہر پہنچا دیا۔ وہ کلکتہ سے بمبئی اور پھر حجاز و بغداد چلے گئے اور اس اثنا میں بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں، لیکن یہ علاقہ بدستور محکم رہا اور میں اس تمام عرصے میں انکی زندگی کے تغیرات کا مطالعہ کرتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں جب "الہلال" کی شہرت کمال درجہ تک پہنچ چکی تھی اور ہر شخص اس عجیب و غریب شخصیت کے حالات معلوم کرنے کا خواہشمند تھا جس نے یکایک ظاہر ہو کر تمام قوم میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا، تو مجھے پہلی مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر ان کی زندگی کے حالات قلمبند ہو جائیں تو وہ کئی اعتباروں سے نہ صرف نہایت دلچسپ بلکہ نہایت نتیجہ خیز و مفید ہوں گے۔ چنانچہ

میں نے یہ خیال ان پر ظاہر کیا اور عرض کیا کہ وہ خود اپنے ہی قلم سے اپنے حالات قلمبند کردیں لیکن انہوں نے اوّل تو کئی بار اپنی عادت کے مطابق مذاق میں بات ٹال دی۔ پھر صاف صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح و حالات نہیں لکھے گئے۔ ان کو چھوڑ کر میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی۔"

لیکن جس کام کو وہ "تمسخر انگیز" کہتے تھے (اس کو دلی محبت و ارادت کا نتیجہ سمجھا جائے یا حقیقت حال کا) میں ہر طرح اس کو ایک نہایت ضروری کام سمجھتا تھا، اور چونکہ ایک عرصہ کی واقفیت کی وجہ سے حالات کا بڑا حصہ پیش نظر تھا، اس لئے سمجھتا تھا کہ ان کی پچیس برس کی زندگی میں ایسے ایسے عظیم الشان تغیرات موجود ہیں جو بڑی بڑی طویل زندگیوں میں بھی نہیں پیش آتے، اور اسلئے ان کا مطالعہ ہزاروں انسانوں کیلئے رہنمائی و ہدایت کا ذریعہ ہوگا۔

گو انہوں نے انکار کر دیا، لیکن میں نے اپنا اصرار برابر جاری رکھا اور برابر اس کیلئے خطوط لکھتا رہا۔ اپریل ۱۹۱۶ء میں جب گورنمنٹ بنگال نے بنگال سے باہر چلے جانے کا آرڈر جاری کیا اور وہ رانچی چلے گئے تو مئی میں میں ان کی ملاقات کے لئے رانچی گیا۔ اس واقعہ نے جو اثر تمام ملک پر ڈالا تھا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کا اشتیاق عام طور پر اور زیادہ ہو گیا تھا۔ جن جن لوگوں سے اس کا ذکر آیا، سب نے بالاتفاق کہا کہ کسی نہ کسی طرح ان کے حالاتِ زندگی خود انہی سے لکھوانے چاہئیں۔ چنانچہ اس مرتبہ میں نے سخت کوششوں کے بعد ان سے وعدہ لے ہی لیا، اور ساتھ ہی یہ شرط بھی کر لی کہ جس قدر وہ لکھتے جائیں بلا انتظار تکمیل مجھ کو بھیجتے رہیں، اور کوئی ہفتہ اس سے خالی نہ جائے۔ البتہ ان کو اصرار تھا کہ بلا ان کے علم کے کتاب شائع نہ کی جائے۔ اس کے ماننے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوا۔

اس کے بعد میں رائے پور چلا گیا اور دو ہفتہ کے بعد سولہ صفحے انہوں نے لکھ کر بھیج دیئے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اپنے خاندانی حالات قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر مجھے مزید مسرت ہوئی کہ ضمناً ایک مستقل کتاب بزرگانِ سلف کے حالات میں ان کے

قلم سے مرتب ہو جائے گی لیکن جوں جوں سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ نئی نئی بحثیں نکلتی آئیں۔ اور ہر مبحث کو وہ اپنی عادت کے مطابق تفصیل سے لکھنے لگے۔ اس پر مجھے خوف ہوا کہ کہیں اس ضمن میں اصلی مقصد نہ رہ جائے۔ چنانچہ میں نے بار بار اختصار کے لئے اصرار کیا۔ لیکن انہوں نے لکھا کہ "میری طبیعت میں رکاوٹ پیدا نہ کرو۔ جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے۔ بھیج دیتا ہوں۔ جمع کرتے جاؤ۔ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔"

جون ۱۹۱۶ء سے ۱۰/ا۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ درمیان میں کبھی کبھی رک جاتا اور پھر مجھے دو چار خط لکھنے پڑتے۔ جس قدر صفحات وہ لکھتے، بھیجدیتے۔ مطالب میں کسی طرح کی قرار دادہ تقسیم و ترتیب نہ تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ نہ تو ایک سلسلے میں لکھی گئی نہ مسودہ خود ان کے سامنے تھا۔ جہاں کہیں کوئی نیا مطلب شروع ہو جاتا تھا۔ "فصل" کا لفظ لکھ دیتے تھے۔ اس کے ساتھ نمبر و شمار کی کوئی ترتیب نہ تھی۔

مگر مجھ کو اصلی کاوش خود ان کے حالات کی تھی۔ خاندانی حالات کے مسودہ کو دیکھا تو متوسط سائز کے کاغذ پر اصل مسودہ پانچ سو صفحوں سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اور یہ بھی اس وجہ سے کہ بار بار اختصار پر زور دیتا رہتا تھا۔ ورنہ نہیں معلوم ان کے دماغ کی آمد کہاں کہاں انہیں لے جاتی اور کتاب ختم بھی ہوتی یا نہیں؟ جب انہوں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی ختم کر دیئے تو اب میں منتظر ہوا کہ حسب وعدہ اپنے حالات لکھنا شروع کریں گے۔ لیکن اس کے بعد بالکل خاموشی رہی۔ اور کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی عذرات کئے گئے جو پہلے بارہا ہو چکے تھے جب میں نے پھر لگاتار اصرار شروع کر دیا تو بیس صفحوں میں ایک فصل لکھ کر بھیجدی اور لکھا کہ اس سے زیادہ میں اپنا حال نہیں لکھ سکتا۔" یہ فصل اسی حصہ کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔ اس کو دیکھا تو اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس پر حالات کا اطلاق ہو سکے۔ البتہ اپنے مخصوص طرز میں کچھ اشارات کئے ہیں، اور پھر شاعرانہ پیرایہ میں بات ٹال دی ہے۔ اصل میں ان کو میری درخواست منظور کرنی ہی نہ تھی۔ سخت اصرار دیکھ کر چاہا کہ اپنے خاندانی حالات پر اس بہانے ایک کتاب لکھ دیں۔ اور جب خود اپنے ذاتی حالات کا موقعہ آئے تو کسی نہ کسی طرح ٹال دیں

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس میں مصلحت کیا ہے؟ یقیناً ان کا فیصلہ میرے فیصلہ پر ترجیح پانے کا مستحق ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اتنے انتظار و امید کے بعد یہ مایوسی میرے لئے بہت ہی رنجدہ تھی اور ایسی تھی کہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو یقیناً اس کام سے بالکل دست بردار ہو جاتا۔

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں خود ان کے حالات قلمبند کروں۔ اسی اثنا میں یکایک وہ نظر بند کر دیئے گئے۔ اس کی وجہ سے خط و کتابت کی سہولت و آزادی بھی جاتی رہی۔ بالآخر فروری ۱۹۱۷ئ؁ میں ایک طویل مہلت اپنے کاموں سے نکال کر رانچی گیا، اور متصل چھ ماہ تک انکی خدمت میں مقیم رہا۔ میں نے ان کے حالات زندگی کے متعلق ۱۵ سوال لکھ لئے تھے۔ سخت سعی و اصرار سے ان کے جوابات لکھوائے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ جہاں ایک مرتبہ اس موضوع پر ان کا قلم اٹھ گیا، پھر کسی تحریک کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور ان کی جوش فکر کا سیلاب کسی کے روکے بھی نہیں رک سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور گو نہایت بے توجہی اور بے مزگی کے ساتھ وہ سوالات کے جوابات لکھنے پر مستعد ہوئے، لیکن پھر بھی ان ۱۵ سوالوں کی تحریک نے ان کے قلم سے ان کے خیالات کو جنبش دی، اور حالات کا ایک معتد بہ حصہ ان کے قلم سے بے اختیار نکل گیا۔ سوالات کے جوابات لیکر میں رانچی سے پورو اپس آیا۔ جہاں تک ممکن تھا، جابجا خود انکی تحریر کو بجنسہ درج کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے حالات میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ ان سے بھی مدد ملی۔ اور اس طرح ایک کتاب مرتب ہو گئی۔ اس کا تو مجھے ابتدا سے اعتراف رہا ہے کہ ان کے حالات لکھنے کے لئے جیسے دماغ و قلم کی ضرورت ہے وہ مجھے کہاں میسّر؟ اور اسی لئے میری ابتدا سے خواہش تھی کہ وہ خود ہی اوّل سے آخر تک لکھیں اگر ایسا ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ اردو لٹریچر میں ایک یادگار چیز ہوتی۔ لیکن بہرحال، نہ ہونے سے ایک مفید کام کا ہو جانا بہتر ہے۔ ہزاروں انسانوں کی طرح میرا بھی یقین ہے کہ مولانا نے اپنی اس قلیل عمر میں جس قدر علمی و عملی خدمات انجام دی ہیں، فی الحقیقت یہ ان کے آنے والے کارناموں کی محض ایک ابتدائی قسط ہے۔ اللہ تعالیٰ ابھی عرصہ تک ان کے وجود کو قوم میں قائم رکھے گا، اور نہیں معلوم کیسی کیسی عظیم الشان خدمتیں ان کے ہاتھوں انجام پائیں گی؟ پس وہ وقت قریب ہے

جب بڑے بڑے لوگ ان کے حالات زندگی کی ترتیب پر مستعد ہوں گے، اور ایسے ہاتھوں سے یہ کام انجام پائے گا۔ جو ہر طرح اس کے اہل ہوں گے۔ عجب نہیں کہ میری یہ پہلی اور ناچیز کوشش اس وقت ان بزرگوں کے کچھ کام آجائے، اور اس طرح میری کئی ماہ کی محنت ضائع نہ جائے۔

چند الفاظ اس کتاب کی اشاعت کی نسبت بھی کہنا ضروری ہیں۔ جس وقت مولانا نے اکی تصنیف کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ شرط بھی کرالی تھی کہ بلا ان کی اجازت کے شائع نہ کیا جائے۔ ان کا قصد یہ تھا کہ آئندہ کسی فرصت کے موقعہ پر نظر ثانی کریں گے، اور اس کے بعد کتاب شائع ہوگی۔ میں نے سال بھر تک اس موقعہ کا انتظار کیا۔ جب اوائل ۱۹۱۹ء میں رانچی گیا تو بہت کوشش کی کہ کسی طرح میری موجودگی میں نظر ثانی ہو جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے برابر تساہل و اغماض سے کام لیا۔ بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ "محض تمہارے اصرار سے مجبور ہو کر یہ دفتر لکھ دیا تھا۔ یہ مقصود ہی کب تھا کہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے گا" وہ مصر تھے کہ مسودہ ان کے حوالے کر دیا جائے۔ فرصت کے وقت درست کر دیں گے۔ لیکن چونکہ خوش قسمتی سے میں ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو ان کی اصطلاح "بوقت فرصت" کے معانی سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے میں اس کی تعمیل نہ کر سکا۔ اگر کرتا تو اس کے معنی صرف یہ تھے کہ برسوں تک کیلئے یہ کتاب بھی اسی ذخیرۂ نسیان کے سپرد ہو جاتی جس کا ایک پورا صندوق "وقت فرصت" کے انتظار میں ہمیشہ ان کے ہمراہ رہا کرتا ہے!

اس میں شک نہیں کہ جن اہم تصنیفات کی تکمیل میں وہ آج کل شب و روز مشغول رہتے ہیں۔ مثلاً تفسیر القرآن، ان کے مقابلہ میں یہ کتاب چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ تاہم اگر وہ چاہتے تو یقیناً وقت نکال سکتے تھے۔ اور چند دنوں کے اندر پوری کتاب پر نظر ثانی ہو جا سکتی تھی۔ جو شخص بلا کسی سامان و مواد کے محض قلم دوات لیکر ایک شب و روز میں پورا ایک رسالہ لکھ دے، اس کے لئے ایک لکھی ہوئی چیز پر نظر ثانی کر دینا کیا مشکل تھا؟ مگر افسوس ہے کہ وہ ہر کام کو اپنے معیارِ نظر سے جانچتے ہیں۔ دوسروں کی خواہشوں کی اس بارے میں کچھ پروا نہیں کرتے۔ یہ پوری کتاب محض بطور تفریح دماغ کے انہوں نے قلم برداشتہ لکھ دی۔ اپنے خیال میں اس کو

محض ایک بے حقیقت چیز سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظرثانی و اشاعت کے معاملہ میں ان کو کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ لیکن کاش ان کو معلوم ہوتا کہ ان کا معیارِ نظر جس قدر بلند ہے، ہمارا نہیں ہے۔ ان کی قلم برداشتہ تحریریں ایک طرف، اور اوروں کی برسوں کی محنت و جانکاہی ایک طرف۔ اسی کتاب کو دیکھ لیا جائے کہ کس بے سروسامانی و بے توجہی کے ساتھ قلم برداشتہ لکھی گئی ہے۔ جس قدر اوراق لکھے جاتے تھے، میرے پاس بھیجد یتے تھے، اور آئندہ ربط تحریر کے لیے صرف آخری صفحہ کی آخری سطر یا بعض حالات میں صرف چند الفاظ ایک سادہ صفحہ کی پیشانی پر باقی رہتے تھے۔ درمیان میں ہفتوں دوسری تصنیفات جاری رہتیں پھر جب کبھی کسی وجہ سے دماغ آرام لینا چاہتا اور تفسیر وغیرہ کا سلسلہ رکتا، تو دو چار گھنٹے کے لیے اس طرف متوجہ ہو جاتے۔ ہمارے بڑے بڑے مصنف شاید اس طرح ایک خط بھی نہ لکھ سکیں۔ چہ جائیکہ ایک پوری مرتب کتاب۔ چھ سات سو صفحوں سے زیادہ!

جب نظرِ ثانی کی طرف سے مایوس ہو گیا تو ارادہ کر لیا کہ خواہ وہ خوش ہوں یا ناراض، مگر بلا ان کے علم کے مسودہ کو اصلی حالت ہی پر شائع کر دینا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی ہوا کہ "نظرِ ثانی" کا انتظار بھی دراصل اشاعت روکنے کا حیلہ ہے۔ ورنہ آج تک کسی تحریر پر مصنفوں کے طریقہ کے مطابق ان کو نظرِ ثانی کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ "الہلال" و "البلاغ" میں کیسے کیسے معرکتہ الآرا مضامین ہمیشہ نکلتے رہے؟ لیکن میں نے خود دیکھا ہے کہ ہمیشہ محض قلم برداشتہ لکھے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کمپوزیٹر کمپوز بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک صفحہ پورا ہوا اور کمپوز کے لیے گیا۔ البتہ ایک پروف وہ خود دیکھتے تھے، اور اس میں کچھ تبدیلیاں ضرور کر دیتے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ پروف میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ بعض الفاظ بدلے جا سکتے ہیں

بہرحال میں نے کتاب کو خود اپنی نگرانی میں چھپوانا شروع کر دیا۔ کتاب کے ۴۰ صفحے چھپ چکے تھے اور مولانا کو اس کی طباعت کا بالکل علم نہ تھا۔ جب جنوری ۱۹۱۹ء میں میں نے اخبارات میں ایک ابتدائی اطلاع اس کی نسبت شائع کی تو اُن کو معلوم ہوا، اور جیسی توقع

پیشتر سے بھی، سخت اصرار کر کے انہوں نے چھپائی کا سلسلہ موقوف کرا دیا اور لکھا کہ کتاب ہرگز ہرگز شائع نہ کی جائے۔ تاہم اب مجھے پورا اطمینان تھا کہ جب کام یہاں تک پہنچ چکا ہے تو کسی نہ کسی طرح ان کو اجازت دینی ہی پڑے گی۔ پانچ ماہ اس میں نکل گئے۔ بالآخر میں رانچی گیا اور مجبوراً ان کو اشاعت پر راضی ہونا ہی پڑا۔ میں ان صدہا شائقین سے جنہوں نے ابتدائی اعلان دیکھتے ہی درخواست بھیجدی تھی، اس تاخیر کے لئے خواستگار معافی ہوں، اور یقین دلاتا ہوں کہ اس بارے میں میری مجبوریاں بڑی ہی سخت تھیں۔

اصل مسودہ میں میں نے کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ مجبوراً کتاب کی ضخامت کو معتدل کرنے کے لئے بعض مقامات سے بعض ٹکڑے نکال دینے پڑے۔ مولانا کے جوش فکر کا یہ حال ہے کہ جس جانب قلم کی باگ مڑ گئی، پھر اس کا رکنا مشکل ہے۔ علاوہ بریں کتاب اس طرح لکھی گئی کہ مسودہ خود ان کے پیش نظر بھی نہ تھا۔ دس بارہ صفحے لکھے اور میرے پاس بھیجدیئے۔ ان کو خود اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کونسا مضمون کتنے صفحوں تک پہنچ چکا ہے، جابجا فٹ نوٹس شروع کر دیتے تھے اور وہ بیس بیس پچیس پچیس صفحوں تک چلے جاتے تھے مجبوراً میں نے چار مقام سے تین فصلیں اور چار بڑے بڑے فٹ نوٹس نکال دیئے۔ اور دو فٹ نوٹ اصل کتاب کے آخر میں مستقل فصل کے عنوان سے شامل کر دیئے۔ اسی طرح بعض نوٹ اصل کتاب میں ملا دیئے گئے۔ ناظرین یقین کریں کہ ان کے دلوں میں مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر کی جس قدر وقعت و عزت ہو گی، اس سے وہ چند میرے دل میں ہے، اور میں ہرگز ایسا نہ کرتا اگر سامان طبع کی بے حد گرانی نے مجھے اختصار پر سخت مجبور نہ کر دیا ہوتا۔ یہ جس قدر فصلیں اور حواشی نکالے گئے، سب محفوظ ہیں، اور بجائے خود مستقل مضمون کا حکم رکھتے ہیں انشاء اللہ ان کو بھی کسی نہ کسی عنوان سے عنقریب شائع کر دوں گا۔ یا بشرط گنجائش دوسری جلد کے آخر میں بطور ضمیمہ کے درج کر دینے کی کوشش کروں گا۔

جب کتاب پریس میں دی گئی، تو ارادہ تھا کہ ایک ہی جلد میں شائع کی جائے گی، لیکن کمپوز شروع ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ میرا اندازہ ضخامت کے بارے میں غلط تھا۔ اگر ایک ہی

جلد میں کتاب شائع کی جائے گی تو عجب نہیں سات آٹھ سو صفحوں تک ضخامت پہنچ جائے مجبوراً کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد کے پہلے حصے میں مولانا کے خاندانی حالات کا بقیہ حصّہ ہے۔ دوسرے حصے میں خود مولانا کی سوانح عمری ہے جو خاکسار نے ترتیب دی ہے اور اس کا بھی اکثر حصّہ سوالات کے جواب میں خود ان کا لکھا ہُوا ہے۔

مولانا کا فوٹو

آخر میں مجھے ایک خاص معاملہ کی نسبت چند الفاظ کہنے ہیں۔ اس کتاب کا ایک ضروری جزو یہ بھی تھا کہ مصنف کی تصویر سے مزیّن ہوتی۔ موجودہ زمانے میں کسی شخص کی سوانح عمری کا بغیر فوٹو کے شائع کرنا ایک ایسی بے قاعدگی ہے جس کو کوئی خوش مذاق آدمی گوارا نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں مولانا کے ہزاروں ارادت مند ہیں جن کو بڑی مایوسی ہوتی اگر کتاب ان کے فوٹو سے خالی ہوتی۔ اس لئے میں نے کوشش کی کہ مولانا کا سب سے آخری فوٹو حاصل کر کے درج تذکرہ کروں۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنی تصویر کی اشاعت کی انہوں نے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ "الہلال" میں دنیا جہان کی تصویریں نکلتی رہیں مگر لوگوں کے سخت اصرار پر بھی انہوں نے کبھی اپنا فوٹو شائع نہیں کیا۔ انجمن اعانت نظربنداں دہلی نے بار بار ان سے فوٹو طلب کیا مگر انہوں نے نہ بھیجا۔ سید فضل الرحمٰن نے اخبار "جمہور" کلکتہ میں ان کے فوٹو کا اعلان شائع کیا تھا اس پر وہ سخت برہم ہوئے اور بڑا ہی سخت خط ان کو لکھا۔ پھر مجھے لکھا کہ جس قدر کاپیاں انہوں نے طیار کی ہیں میری طرف سے خرید کر کے رکھ لو اور شائع نہ ہونے دو۔ پھر جب قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر "جمہور" ان سے ملنے رانچی گئے تو ان سے بھی وعدہ لیا کہ اخبار میں ایک نوٹ اس مضمون کا درج کر دیں گے کہ یہ کارروائی بلا ان کے علم کے ہوئی ہے، مگر انہوں نے درج نہیں کیا۔ میں ان تمام موقعوں پر یہی سمجھتا رہا کہ یہ مخالفت یا تو انکسارِ طبع کی بنا پر ہے، یا ان کی طبیعت کے اس عام خاصہ کا نتیجہ ہے کہ جو بات عام طور پر

لوگ کر رہے ہوں اس سے خود پرہیز کرتے ہیں لیکن اس کا تو کبھی خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا تصویر کھنچوانے اور رکھنے کو شرعاً ناجائز سمجھتے ہوں گے۔ خود "الہلال" انہوں نے باتصویر نکالا اور ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی تصویر بھی کھنچوائی، لیکن جب میں نے تصویر کی نسبت کہا تو انہوں نے لکھا کہ "تصویر کا کھنچوانا، رکھنا، شائع کرنا، سب ناجائز ہے۔ یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھنچوائی تھی اور الہلال کو باتصویر نکالا تھا۔ میں اب اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں، میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہیئے۔ نہ کہ از سرِ نو انکی تشہیر کرنی چاہیئے"

لیکن اس جواب سے میری تشفی تو نہ ہوئی۔ میں علم شریعت کا ماہر نہیں، اور علی الخصوص مولانا کے فتوے کے مقابلے میں تو مجھے دم مارنے کا وہم بھی نہیں گذر سکتا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتی کہ آج تک مولانا کو شریعت کے اس حکم کی خبر نہ تھی اور جس کام کو علانیہ کرتے رہے ہیں، وہ اب یکایک ناجائز نکل آیا ہے۔ خود "الہلال" میں مولانا نے شیخ الاسلام قسطنطنیہ، شیخ محمد عبدہٗ مصری، مولانا شبلی نعمانی، اور کتنے ہی علماء و مشائخ کی تصویریں شائع کی ہیں۔ تعجب ہے کہ شریعت کا حکم ایسے مشاہیر علماء کو معلوم نہ تھا۔ بہرحال مولانا کے اس حکم کی میں تعمیل نہ کر سکا اور کتاب کے ساتھ ان کا سب سے آخری فوٹو شائع کر رہا ہوں یہ فوٹو رانچی میں لیا گیا ہے، اور مولانا کی بریت کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ کم سے کم اس کے کھنچوانے میں خود مولانا کے ارادہ کو کچھ دخل نہ تھا۔ وہ بالکل مجبور تھے۔

کلکتہ
۱۶- اگست سنہ ۱۹۱۹ء

فضل الدین احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصۂ اوّل

حکایت از قدِ آں یارِ دلنواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

الحمد للہ الذی وفق فی دینہٖ من اجتباہ، والصلوٰۃ علیٰ خاتم رسلہٖ وجمیع انبیاہ۔ والعاقبۃ للمتقین، ولاعدوان الا علی الظالمین۔

میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم وفضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت وجاہ کی اگرچہ ان میں سے کسی نے خواہش نہیں کی، لیکن دنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ ان کے سامنے پیش کیا اور کبھی انہوں نے قبول کیا، اور کبھی رد کر دیا۔

میری والدہ حضرت شیخ محمد بن ظاہر وتری مفتی مدینۂ منورہ کی بھانجی تھیں جو گذشتہ دور کے اکثر علماء حجاز کے استاذ حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکہ معظمہ کے آخری محدث

تھے۔ ان کے بعد اس درجے کا کوئی شیخ حدیث حرمین میں پیدا نہیں ہوا۔

میرے دادا مولانا محمد ہادی دہلی مرحوم کے ایک مشہور خاندان علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے، جس میں بہ یک وقت پانچ پانچ علماء درس و افتاء و اصحاب سلوک و طریقت پیدا ہوئے ہیں۔

والد مرحوم کے نانا رکن المدرسین مولانا منور الدین اپنے عہد کے مشاہیر اساتذہ علم و درس اور اصحاب طریقت و سلوک میں سے تھے، اور ان مخصوص اصحاب کمال میں سے جن کو اللہ تعالیٰ علوم ظاہر و باطن کی جامعیت عطا فرماتا ہے۔ ان کا شمار حضرت شاہ عبد العزیز کے اجلۂ تلامذہ میں تھا، اور سلطنتِ مغلیہ کے آخری "رکن المدرسین" تھے۔ ان کے شاگردوں اور مریدوں میں ایسے ارباب کمال ہوئے جو اپنے عہد کے ممتاز بزرگوں میں سے شمار کئے گئے۔ ان کے والد مولانا رشید الدین صوبۂ لاہور کے قاضی القضاۃ اور احمد شاہ ابدالی کی جانب سے نائب السلطنت پنجاب کے مشیر تھے۔ اور ان کے والد شیخ صدر الدین ہرات کے مشائخ طریقت میں معدود، اور وہاں کے خاندان قضا کے ایک رکن تھے۔

یہ تین مختلف خاندانی سلسلے ہیں جو میرے خاندان میں جمع ہوئے ہیں؛ اور ان میں سے ہر سلسلہ، سلسلۂ علم و ارشاد ہے۔ اگر خاندان کوئی فخر و شرف کی چیز ہے تو یہ واقعات کچھ نہ کچھ وزن ضرور رکھتے ہیں؛ اور اگر چاہوں تو اس قسم کے الفاظ بول سکتا ہوں، جو غرور نسب و خاندان کے استخوان فروشوں نے اختیار کر رکھے ہیں لیکن میں نے شرطیہ جملہ استعمال کیا۔ اس لئے کہ حقیقت اس کے خلاف ہے، اور الحمد للہ اس تمام مدت عمر میں جو گذر چکی ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ نسب فروشی کی دکان آراستہ کر کے نقد عزت و شرف کی جستجو کی جائے۔ اسلام نے ساری نسبتوں اور امتیازوں کو مٹا کر صرف ایک اپنی نسبت نوع انسانی کو عطا کی اور اس نسبت سے بڑھ کر اور کونسی نسبت ہو سکتی ہے جس کی ایک مسلمان کو تلاش ہو؟ ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین؟ انسان کے لئے معیار شرف جوہر

ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیئے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں؟ اربابِ ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت و رفعت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔ نپولین کا ایک قول مجھے نہیں بھولتا۔ فتح پروشیا کے بعد جب فریڈرک اعظم کی قبر پر گیا تو دیکھا کہ فریڈریک کی تلوار قبر پر لٹک رہی ہے۔ نپولین نے تلوار اٹھا کر ایک ساتھی کے حوالے کی اور کہا کہ پیرس کے عجائب خانے کی نذر کر دوں گا۔ یہ سنکر جنرل نے کہا "اگر مجھ کو ایسی با عظمت اور تاریخی تلوار ملتی تو کبھی کسی دوسرے کو نہ دیتا" نپولین نے کہا۔ "کیا میرے پاس میری تلوار نہیں ہے؟"

پس سچی عظمت کی راہ یہ نہیں ہے کہ فریڈرک کی عظمت یافتہ تلوار لوگوں کو دکھلائیں سچی عظمت وہ ہے جو خود ہماری تلوار کو ہماری نسبت سے ملی ہو۔ اور اگر ایسا ہوگیا ہے تو یہ بس کرتا ہے۔ ہم کو اپنی نیام میں صرف اپنی ہی جوہردار تلوار رکھنی چاہیئے۔ دوسروں کی تلواروں کی نمائش سے اگر دیکھنے والوں کا تعجب و احترام حاصل بھی کر لیا گیا تو اس کے اصلی مالک ہم نہیں ہیں، تلوار کا مالک ہے!

خاندان کے فخر کا بت بھی دنیا کے عہد جاہلیہ کی ایک یادگار مشئوم ہے، اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کل کو ایک نو مسلم چمار اپنے حسن عمل سے وہ مرتبہ پائے جو شیخ الاسلاموں کی اولاد کو نصیب نہ ہو۔ یہ کل کو ہونے والی بات ہے، اور آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ "عمل" کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے:

کاندریں راہِ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست!

بلال حبشی اور صہیب رومی کی نسبت اس سے زیادہ ہم کیا جانتے ہیں کہ مسلمان تھے اور سلمان فارسی سے جب اس کے خاندان کا حال پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ "سلمان بن اسلام"

بلال سے اللہ کا رسول کہا کرتا تھا "ارحنا یا بلال" اور جب فاروقِ اعظم کے جنازہ پر نماز کی صفیں کھڑی ہوئیں تو ہزاروں قریشی اور ہاشمی مقتدی تھے اور صہیب رومی امام!
لیس لاحد فضل علیٰ احد الابدین و تقوی۔ والناس کلھم بنوا آدم و آدم من تراب

حسن زبصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم
زخاک مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبیست؟

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرتی ترقی اور قدرتی حقوق کے قیام کے لئے نسب و خاندان کے امتیاز باطل سے بڑھ کر اور کوئی روک نہیں ہو سکتی۔ یہی چیز ہے جو انسان کو اس کی ذاتی قوتوں کے استعمال اور ان کے ثمرات سے محروم رکھنا چاہتی ہے، اور اس خلاف فطرت راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ ایک شخص کو باوجود عدم استحقاق ذاتی مستحق شرف سمجھا جائے، اور دوسرے کو باوجود استحقاق ذاتی محروم کر دیا جائے۔ اسلام نے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم اور لیس للانسان الا ما سعیٰ کے قانون عام کا اعلان کر کے اسی مہلک انسانیت روک کو مٹانا چاہا، اور قرآن نے بتلایا کہ دنیا کی تمام قدیم صداقتیں بھی اسی قانون کی طرف دعوت دیتی رہی ہیں۔ صحف ابراہیم و موسیٰ میں بھی یہی تھا: ان لا تزر وازرۃ وزر اخری اور وان سعیہ سوف یریٰ لیکن افسوس کہ غرور نسل و وطن کے بت کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پھر جوڑ لئے گئے، اور نئے نئے بھیسوں میں پھر اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ اب بہت کم سر ملیں گے جو نشۂ باطل سے سرگراں نہوں۔ الا ما شاء اللہ

پس الحمد للہ کہ نہ اس کی طلب ہے اور نہ اس پر اعتماد، اور نہ نا اہلوں کے اس فریب عزت اور سراب شرف کی ضرورت۔ طلب جس گوہر مقصود کی ہے وہ توفیق عمل ہے اور اگر کچھ اعتماد ہے تو اپنی عجز و شکستگی اور اس کی نظر کرم کی عاجز نوازیوں پر۔ جہاں کا معاملہ یہ سننے میں آیا ہو کہ "رب اشعث مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرہ" وہاں ان افسانوں کو کون پوچھتا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر سرگشتۂ فریب و سفاہت کون ہوگا۔ جو ان پر ایک لمحہ کے لئے بھی اعتماد کرے؟

مجوبہ محمل شاہی کہ در ولایت عشق
گدا بہ تخت نشانند و پادشہ گیرند!

البتہ اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں میں سے جن کے ذریعہ وہ اس دنیا میں اپنے بندوں کو سعادت بخشتا ہے، ایک بڑی نعمت آباءِ صالحین کے لئے یہ ہے کہ اولاد صالح عطا فرمائے کہ رب هب لی من الصالحین اور ووهبنا له اسحاق و یعقوب کلا هدینا۔ الخ اور اولاد کے لئے یہ ہے کہ والدین صالح ہوں۔ سورۂ کہف میں جب موسیٰ علیہ السلام نے ایک گری ہوئی دیوار کو چند یتیموں کے دفینہ کی حفاظت کی تو فرمایا "وکان ابوهما صالحاً"، اور حضرت یوسف کی نسبت آں حضرت نے فرمایا، "انما الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم" اور یہ ظاہر ہے کہ کسی خاندان میں عرصے تک علم و صلاح کا باقی و جاری رہنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ان دونوں نعمتوں سے فیض یاب ہو۔ آباء کو اولاد صالح، اور اولاد کو آباءِ صالح نصیب ہوں۔ پس بلاشبہ اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یقین کرتا ہوں کہ مجھ کو ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس میں صدیوں سے سلسلۂ علم و ارشاد قائم و جاری ہے، اور جس کے اسلاف کرام کے اعمال صالحہ کا پاک ورثہ یکے بعد دیگرے اخلاف تک منتقل ہوتا آیا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے اخلاف کو حق گوئی و حق پرستی اور طریق استقامت و عشق حق میں سرفروشی و جاں سپاری اور مغروران تاج و تخت و بندگان مال و جاہ کے مقابلے میں بے نیازی و سرگرانی ہمیشہ اپنے اسلاف کے ورثہ میں ملی ہے۔ اسی کو اپنا موروثی خزانہ اور اسی کو اپنا خاندانی تاج و تخت سمجھتا ہوں:

ہرچند کہ نیست رنگ و بویم
آخر نہ گیاہ باغ اویم!

اگر یہی غرور و نسب و خاندان ہے تو اس کے اعتراف میں مجھے کچھ باک نہیں۔ بلاشبہ اسلاف کے ورثہ علم و حق پرستی کو دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں،

اور نہیں چاہتا کہ کبھی اس نشہ سے میرا دماغ خالی ہو:

سبک زجائے نگیری کہ بس گراں گہرست
متاع من کہ نصیبش مبـاد ارزانی!

بڑی سے بڑی آرزو جس کو اپنے دل میں رکھ سکتا ہوں یہی ہے کہ زندگی کی آخرین گھڑیوں تک، اپنے اسلاف کرام کے طریق صدق وحق پر مستقیم رہنے کی توفیق پاؤں، اور اپنی ساری زندگی اسی راہ کی کوچہ گردی میں بسر کردوں جس کا نشان رہروانِ سفر وہ اپنی یادگار میں چھوڑ گئے ہیں۔ خدمت علم وحق کا ایک سرمایۂ سعادت ہے جو مجھ تہی دست تک پہنچا ہے میری محرومی ہے اگر اس کو نہ بچا سکا، اور فضل الٰہی کی بخشش ہے اگر اس کی عزت اور نام نیک کو آنے والوں کے لئے محفوظ چھوڑ گیا: رب ھب لی حکما والحقنی بالصالحین واجعل لی لسان صدق فی الاٰخرین!

احب الصالحین ولست منھم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا!

بہر حال ایک دوست عزیز کے اصرار سے اپنے خاندانی حالات قلمبند کرتا ہوں۔ صرف قریبی حالات اور بعض نمایاں اور نتیجہ خیز واقعات کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ مفصل حالات کے لئے والد مرحوم کا ایک مستقل رسالہ موجود ہے اور مہلت ملی تو اشاعت کی نوبت آئے۔

پہلے والد مرحوم کے آبائی سلسلہ کے کچھ حالات لکھتا ہوں۔ اس کے بعد ان کے نانا مولانا منورالدین مرحوم کا حال لکھوں گا۔

باب

حضرت شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ

والد مرحوم کے جدی سلسلۂ نسب میں سب سے پہلے جو بزرگ علم و طریقت میں سر برآوردہ ہوئے ہیں، وہ ان کے دادا حضرت شاہ محمد افضل رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے والد شیخ محمد محسن مرحوم تھے جن کے حالات آیندہ لکھوں گا۔ لیکن حضرت شاہ محمد افضل کے مادری سلسلہ کے ایک مورث اعلیٰ حضرت مولانا جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی ہیں جن کے حالات سب سے پہلے لکھتا ہوں۔ افسوس کہ شیخ موصوف کے تفصیلی حالات مجھے نہیں ملے۔ والد مرحوم نے بحوالۂ سیر الاصفیاء و مکتوبات حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی و تذکیر الطالبین بتذکرۃ الصلحاؑ والواصلین جو کچھ لکھا ہے، اس میں اصل حالات بہت کم ہیں اور زیادہ تر مناقب و فضائل کا تذکرہ ہے۔ تذکیر الطالبین میرے پیشِ نظر ہے۔ لیکن شاہ عبدالحق کے رسائل کا جو مجموعہ ارسال المکاتیب والرسائل کے نام سے مشہور ہے، اس میں شیخ موصوف کے حالات نہیں ہیں۔ شاید شاہ صاحب کے مکتوبات کا کوئی اور مجموعہ بھی ہو۔ بہر حال کتب مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وطن دہلی تھا، اور عہدِ اکبری کے مشاہیر علماء اور اصحاب سلوک و طریقت میں سے تھے۔ سلوک و طریقت کی تکمیل حضرت شیخ محمد داؤد جھنی وال رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کی تھی اور علوم معقول و منقول میں سید رفیع الدین سلامی الشیرازی کے شاگرد تھے۔

سید رفیع الدین شیرازی نویں صدی کے اعاظم محدثین اور کملاءِ روزگار سے ہیں، اور

بہ یک واسطہ ان کا سلسلۂ تلمذ حافظ ابن حجر عسقلانی تک پہنچتا ہے۔ وہ حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد ہیں۔ حافظ سخاوی حافظ عسقلانی کے معقولات کی تحصیل خود علامہ جلال الدین دوانی سے کی تھی۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ ان کا خاندان شیراز میں اس درجہ محترم تھا کہ علامہ دوانی خود ان کے مکان پر آکر درس دیتے تھے۔ حافظ سخاوی نے ملاقات سے پہلے پچاس کتابوں کی تحریری اسناد بھیجدی تھیں، اور لکھا تھا کہ آپ جیسے صاحب کمال کے لئے درس و تلقین ضروری نہیں، لیکن ان کے شوق علم نے اس پر قناعت نہ کی۔ خود قاہرہ پہنچے۔ اور عرصے تک حافظ موصوف کی خدمت میں رہے۔ حافظ سخاوی نے ضؤالامع فی اعیان القرآن تاسع میں ان کا مفصل ترجمہ لکھا ہے۔ اور اخبار الاخیار، منتخب التواریخ، روضۃ العلماء وغیرہ میں بھی حالات ملتے ہیں۔ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے، اور اس کی عقیدت و ارادت اس طرح دامنگیر ہوئی کہ یہیں مقیم ہو گئے۔ سلطان سکندر سے لیکر سلیم شاہ تک تمام شاہان ہند ان کے خدمت گزار رہے۔ بڑے بڑے علماء وقت نے فن حدیث میں ان کی شاگردی کی۔ شاہ عبدالحق کے عہد سے پہلے ان اطراف میں فن حدیث کے درس و تدریس کا جس قدر چرچا ہؤا۔ وہ انہی کے قیام ہند کا فیضان ہے۔ ہمایوں کو جب شیر شاہ سے شکست ہوئی اور آگرہ آیا تو سید موصوف کے مکان پر جاکر طالب دعا ہؤا۔ تذکرۃ الواقعات میں ہے کہ ایران جانے کا مشورہ سید موصوف ہی نے دیا تھا۔ ملا مبارک اور شیخ عبدالنبی کے معرکوں میں یہ ملا مبارک کے مددگار رہے، اور انہی کی اعانت و یاری سے ملا موصوف کو آگرہ میں رہنا نصیب ہؤا۔ سال وفات ۹۵۴ھ ہجری ہے۔

پس اس طرح گویا مولانا جمال الدین بہ دو واسطہ حافظ عسقلانی کے شاگرد تھے۔ مولانا موصوف دہلی میں رہتے تھے اور درس علوم نقلیہ و عقلیہ میں استاد وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ علی الخصوص علوم دینیہ کی تدریس میں اپنا عدیل نہیں رکھتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و طریقہ کا سلسلہ بھی ان سے قائم و جاری تھا، اور دور دور سے لوگ آکر فیضیاب صحبت ہوتے

تھے۔ اس زمانے میں دار الحکومت آگرہ تھا لیکن علم و اصحاب علم کا مرکز ہمیشہ دھلی مرحوم ہی رہی علی الخصوص وہ علماء حق جو دربار شاہی کے تعلقات کی ابتلاؤں سے بچنا چاہتے تھے اور حرص و طمع دنیا کی آلودگی سے پاک دامن تھے، اس گوشہ علم کے سکون کو دار الحکومت کے شور و غوغا پر ترجیح دیتے تھے۔ حضرت شاہ عبد الحق محدث کو اسی عہد میں تھے فرماتے ہیں۔

حقی از گوشۂ دہلی نہ نہم پا بیروں
خود گر فتیم کہ ملک گجرا تم دادند!

لیکن جب خاندان مبارک کو دربار حکومت میں عروج ہوا اور دربار شاہی کی مذہبی حالت دگرگوں نظر آئی، تو ہندوستان سے قطع تعلق کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ اس سفر کا سبب تذکرۃ الواصلین میں یہ لکھا ہے کہ "جب بعض علماء عصر نے اکبر کے امام وقت ہونے کا محضر تیار کیا اور تمام علماء دار الحکومت نے اس پر مہریں کیں، تو وہ محضر دہلی میں بھی آیا اور ان سے تصدیق و امضاء کے لئے کہا گیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس قدر ہو چکا ہے کافی ہے۔ ہم فقیروں اور اور گوشہ نشینوں کو کیوں تکلیف دی جاتی ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو تمام علماء ہند سے استصواب کر لیا جائے۔ اس کے بعد جب علماء مشرق نے بادشاہ کے برخلاف فتویٰ دیا، اور لکھا کہ اکبر شریعت سے منحرف ہو گیا ہے تو بعض علمائے دہلی کی نسبت دربارِ حکومت کو شبہ ہوا کہ علماء مشرق سے نامہ و پیام رکھتے ہیں۔ انہی میں مولانا موصوف بھی تھے۔ جب حالات روز بروز مخدوش ہونے لگے تو انہوں نے حج کا ارادہ کیا، اور اپنے تلامذہ و مریدین کی ایک جماعت ساتھ لے کر مکہ معظمہ چلے گئے" انتہیٰ۔

لیکن حضرت شیخ محمد داؤد کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "بعض علماء وقت خصوصاً شیخ الاسلام مولانا عبد اللہ سلطانپوری کو حضرت شیخ سے سخت حسد و عناد

تھا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ شیخ موصوف پر میر سید محمد جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت منکشف ہوا تھا کہ وہ کبار اولیاء اللہ اور صاحبان مدارج و مقامات علیہ میں سے ہیں اور ان کے احوال و مقامات کی نسبت لوگوں کو بوجہ قصور فہم دھوکا ہوا ہے۔ جو علماء وقت ان کی تکفیر و تضلیل کے درپے ہیں سخت غلطی کر رہے ہیں۔ یہ بات بعض علماء دربار پر سخت گراں گذری کیونکہ وہ برابر طائفہ مہدویہ کے قتل و تعزیر میں کوشاں رہتے تھے، اور اس دار و گیر میں بڑے بڑے فقراء و اہل اللہ کی اذیت و مصیبت کا باعث ہوئے تھے۔ جب شیخ عبداللہ نیازی اور ان کی جماعت کے فقراء مبتلائے محن ہوئے تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ ان مظلوموں کا خون عنقریب رنگ لائے گا، اور افغانیوں کی حکومت زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہے گی۔ یہ بات مشہور ہوئی۔ تو معاندین نے حضرت شیخ کو بھی مہدویت سے متہم کیا اور بہت کلفت و تعب کا باعث ہوئے۔ یہ حال دیکھ کر مولانا جمال الدین نے ایک کتاب تحریر کی اور اس میں دلائل و شواہد قاطعہ سے ثابت کیا کہ حضرت سید محمد جونپوری کی ولایت حق ہے لیکن ان کے مہدی موعود ہونے کا اعتقاد باطل ہے اور ہماری جماعت کو اس اعتقاد باطل سے متہم کرنا مخالفین کا عناد اور منکرین کی شقاوت ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اگرچہ ارباب حق و صلاح کو اطمینان خاطر بہم پہنچا۔ لیکن معاندین کا خلاف و عناد اور بڑھ گیا۔ بایں ہمہ حق تعالیٰ ناصر و یاور تھا۔ اس لئے کوئی گزند نہ پہنچا سکے، اور بالآخر تمام مخالفین کو شرمساری و خواری نصیب ہوئی۔" انتہیٰ۔

بہرحال خواہ اکبر کے محضر امامت کا معاملہ ہو، خواہ اتہام مہدویت کا یہ دونوں معاملے ایسے تھے جن کی وجہ سے بلاشبہ شیخ موصوف پر ہندوستان میں رہنا دشوار ہو گیا ہوگا۔ چنانچہ انہی اسباب سے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے، اور مکہ معظمہ چلے گئے۔ صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ چند سالوں کے بعد خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش حج کیلئے گئے۔ ان کو مولانا

مولانا موصوف سے نہایت درجہ حسن اعتقاد تھا۔ سخت اصرار و التجا کر کے اپنے ہمراہ ہندوستان واپس لے آئے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ دہلی پہنچنے کے چند ماہ بعد انتقال کر گئے گویا قضا کو اسی کا انتظار تھا:

آخر گل اپنی صرف درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!

اگر شیخ موصوف محضر امامت کے واقعہ کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے گئے ہیں تو یہ واقعہ ۹۸۷ھ میں ہوا تھا۔ خان اعظم دربار اکبری کی مذہبی بے قیدگیوں اور بدعتوں سے بگڑ کر ۱۰۰۱ھ میں مکہ معظمہ گئے اور ۱۰۰۲ھ میں واپس آئے، اور شیخ کی واپسی انہی کی معیت میں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش بارہ تیرہ برس تک وہاں قیام رہا۔ اتنے عرصۂ دراز تک وہاں بے نیازانہ مقیم رہ جانے سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ موصوف کا حال عہدِ اکبری کے ان دنیا پرست عالموں سے کس درجہ مختلف تھا، جو پہلے تو دربارِ شاہی سے روٹھ کر خانۂ خدا کا رستہ لیتے، لیکن جب حرصِ دنیا چین سے بیٹھنے نہ دیتی تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہندوستان کی طرف دیوانہ وار دوڑتے، اور اسی گھر کو پیٹھ دکھاتے جس کے لئے دنیا کو پیٹھ دکھائی تھی:

رنجیدہ میروی ز سرِ کوی او سلیم
چوں مے شود نیاید اگر از قضا کسے؟

ملا عبداللہ سلطان پوری مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر کو خود اکبر نے مکہ معظمہ بھجوایا، لیکن پورے تین سال بھی وہاں نہ ٹک سکے۔ پھر اس کا جو نتیجہ نکلا معلوم ہے:

پھرتے ہیں وادخواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں!

منتخب التواریخ ایک مرقع ہے، جس میں اس عہد کے تمام اربابِ عمائم و اصحابِ خرقہ و سجادہ کی تصویریں اپنے اصلی بھیس میں نظر آجاتی ہیں، اور دیکھ کر عبرت ہوتی ہے

کہ بڑے بڑے مدعیان علم و زہد کو بھی دنیا پرستی نے چین سے بیٹھنے نہ دیا، اور راہِ حق پرستی میں استقامت نصیب نہ ہوئی۔ البتہ اہلِ حق وثبات سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ قلیل و غریب ہوں۔ حتیٰ یاتی امر اللہ وھم غالبون۔ عہدِ اکبری بھی ان سے خالی نہ تھا، مگر خال خال تھے، اور اپنے اپنے گوشوں میں سر بزانو۔ ایسے ہی مخصوص بزرگوں میں سے حضرت شیخ جمال الدین بھی تھے کہ مدت العمر دربار شاہی کے علائق سے کنارہ کش رہے، اور علم حق کی عزت کو متاع دنیا کے معاوضہ میں تاراج کرنا گوارا نہ کیا۔ جب دیکھا کہ زمانہ کی حالت دگرگوں ہو گئی ہے اور وقت کی حکومت دنیا سازوں اور دین بازوں کے قبضے میں چلی گئی۔ حتیٰ کہ گوشہ نشینوں کے لئے بھی امن باقی نہ رہا، تو ترکِ وطن پر آمادہ ہو گئے، اور ہندوستان ہی کو چھوڑ دیا:

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں

کیوں ہے بے کار، گریباں تو میرا دور نہیں!

ارباب صدق و صفا ہمیشہ قیدِ وطن و دیار سے آزاد رہے ہیں۔ خدا کی ساری خدائی ان کا وطن اور ساری زمین ان کا گھرانا ہے۔ جن بے نیازان دنیا دنیازمندان حق کو وطن میں رہ کر بھی ناز و نعمت دنیوی کے مزے نہیں لوٹنے ہیں، بلکہ اپنی بوریائے فقر پر قانع رہ کر علم و حق کی خدمت و چاکری ہی کرنی ہے، ان کے لئے دنیا کے کسی ایک گوشے میں کیا دھرا ہے۔ جو دوسرے گوشے میں میسّر نہیں آئے گا؟ وہ جہاں کہیں بھی رہیں گے دو گز زمین اور ایک پھٹی چٹائی مل ہی جائے گی۔ ان کے علم و حق کی جنس تو وہ متاعِ عالمگیر ہے، جس کیلئے خدا کی ساری دنیا روز بازار کا حکم رکھتی ہے۔ وہ اپنی جھولی میں حق و صداقت کا تخم رکھتے ہیں۔ ان کو لیکر جس سرزمین میں جا نکلیں گے، اپنی فصل و کاشت خود تیار کر لیں گے:

لا تقل دارھا بشرقی نجد

کل نجد للعامریۃ دار!

صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ناصر الملک پیر محمد خان خانخانان اور خان اعظم کوکلتاش

کو حضرت شیخ جمال الدین سے بہت عقیدت تھی۔ بارہا انھوں نے چاہا کہ مال و جاہ دنیوی میں سے کچھ قبول کریں لیکن ہمیشہ انکار کیا، اور فرمایا کہ گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہیں دل نہ ویران ہو جائے۔ عرفی نے کیا خوب کہا ہے:

من از فریب عمارت گدا شدم، ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتادست!

فصل

جن واقعات کی طرف صاحبِ تذکرہ نے بہ ضمن اسباب سفر مکہ اشارہ کیا ہے، یہ عہدِ اکبری کے مشہور واقعات ہیں، تاہم مناسب ہوگا کہ مختصر تشریح کر دی جائے۔

اکبر کی امامت کے محضر کا یہ حال ہے کہ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانہ میں دنیا پرست عالموں کی کثرت و طاقت نے ملک کے امن و سکون کو تہ و بالا کر رکھا تھا، اور علی الخصوص۔۔۔۔ اہل اللہ اور ارباب حق پر انھوں نے اپنے غرور دنیا اور نشۂ حکومت و ریاست میں بڑے بڑے مظالم و شدائد کیے تھے۔ جس کسی کو طلب دنیا سے مستغنی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں سرگرم دیکھتے، اپنی دنیا پرستیوں کا حریف سمجھ کر مخالف ہو جاتے، اور کوئی نہ کوئی الزام تراش کر فتنہ و مصائب میں مبتلا کر دیتے۔ اکبر کے ابتدائی عہد تک یہی حال رہا۔ ان علماء حکومت میں دو شخصوں نے بہت بڑا عروج دنیاوی پایا تھا۔ مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور[1]۔ انہی لوگوں کے ظلم و تعصب کا ایک قتیل

---

[1] بعض خوش اعتقاد بزرگوں کا خیال ہے کہ ملا عبدالنبی اور مخدوم الملک کی نسبت ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں جو کچھ لکھا ہے اس کو ملا صاحب کی نکتہ چین طبیعت کی بے اعتدالیوں اور معاصرت کے تعصب پر محمول کرنا چاہیے۔ لیکن ان بزرگوں کو معلوم نہیں کہ ملا بدایونی کے علاوہ اس عہد کے دیگر وقائع نگار بھی اس بارے میں متفق ہیں، اور گو بدایونی کی طرح بے پردہ و بے باکانہ لکھنے

کو شیوۂ حزم و احتیاط و تہذیب نگارش کے خلاف سمجھتے ہیں، مگر اصلیت کا صاف اقرار کرتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی سے بڑھکر محتاط و پردہ پوش راوی کون ہوگا؟ اخبار الاخیار میں بہ ضمن حالات شیخ عبدالقدوس گنگوہی (کہ شیخ عبدالنبی کے جدامجد تھے) لکھتے ہیں: یکے از نبائر او شیخ عبدالنبی بود کہ تحصیل بعضے علوم رسمیہ نمودہ در جوانی متوجہ حرمین شد۔ و پیش بعضے از فقہاء مکہ برخی از حدیث نبوی برخواند (الفاظ پر غور کرو پیش فقہا لکھتے ہیں نہ کہ پیش محدثین اور اس پر بھی "برخی") بعد ازاں بوطن عود کردہ بہ تزہد و تقشف منسوب شد۔ با پدر و اعمام بہ جہت مسئلہ توجید و سماع در افتاد، و لا جرم باعثِ ایذا و کلفت بسیار شد۔ و ایں باعث شہرتِ او گشت۔ پادشاہ وقت صدرے میخواست کہ بصفت علم و دیانت متصف باشد۔ بہ توسط بعضے اسباب و وسائل بر مسند صدارت نشست۔ شہرت و عزت زیادہ از استحقاق داشت۔ چوں منصب صدارت یافت و دریں امر کوس استقلال و استبداد زد، و از مال و جاہ و اعتبار زیادہ از آنچہ گفتہ شود نصیب او شد، بادشاہ ما (یعنی اکبر را) بوے اعتقاد عظیم پیدا شد، و مردم بسبب آں در نظر اعتبارش بحقارت در آمدند۔ با اشراف و افاضل کمتر از مراتب ایشاں سلوک می نمود، و ہر کہ بہ مزاج او راست نہ شد و بہ معیار قبول او تمام نیامدہ، محروم ماند۔ بعد از مرور سنین مزاج سلطنت بسبب بعضے حوادث (یعنی علماء سو کی بدعملیوں کی پردہ دری اور خاندان مبارک کا عروج اور دربار شاہی میں حکمت جدیدہ و مذہب تحقیقی کا شیوع) بادے منحرف شد و از منصب صدارت معزول گشت۔ او را و ملا عبداللہ سلطانپوری را کہ دانشمند بود و مقدم و رئیس، و از زمان افغاناں تا ایں زمان معتبر و معزز و ملقب بہ مخدوم الملک و بجزم و متانت و تجارت امور و جمع اموال موصوف بود (شاہ صاحب کس طرح پردے پردے میں ..... سب کچھ لکھ رہے ہیں) بہ مکہ فرستادند، و ہر دو را کہ مدتہا باہم منازع و مخالف بودند، بصورت رفیق یکدیگر ساختہ بجانب آں بقعہ شریف رواں کردند۔ اما باوجود آں ہرگز میانِ ایشاں نہ در اثنائے طریق و نہ در آں مقامات شریفہ اتفاق و رفع کدورت صورت بست۔ آخر بے صبری نمودہ رجوع نمودند و فائدہ نکرد ..... الخ"

شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ بدایونی نے کونسی بات لکھی ہے؟ البتہ شاہ صاحب تہذیب نگارش و طریقِ احتیاط و عفو پر نظر رکھ کر پردے پردے میں لکھتے ہیں، اور بدایونی اپنے جوش حق گوئی و اضطراب راست بیانی میں کسی بات کی پروا نہیں کرتے۔ شاہ صاحب نے مخدوم الملک کی نسبت صرف اس قدر اشارہ کر دیا ہے کہ "بہ جمع اموال موصوف بود" اور یہ بس کرتا ہے، لیکن بدایونی سے اس اشارے کی شرح مل جاتی ہے کہ ان کے آبائی گھر میں بڑی بڑی پختہ قبریں تھیں مشہور کر رکھا تھا کہ ہمارے بزرگوں کی قبریں ہیں۔ مرنے کے بعد حکم شاہی سے کھودی گئیں تو بزرگوں کی لاشیں تو نہ ملیں مگر سونے کی اینٹیں نکلیں، اور فی الحقیقت چاندی سونے ہی کو علماء دنیا پرست کی بزرگی و پیشوائی پہنچتی

خاندان ملا مبارک بھی تھا، اور ملا موصوف کے تبحر علمی، فقر و استغناء، اور بے باکانہ امر بالمعروف کی سرگرمیوں سے وہ سخت عاجز آگئے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد جب حالات بدلے اور ملا مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو انہوں نے ان لوگوں کے زور کو توڑنا چاہا اور اس کی تدبیر یہ نظر آئی کہ مذہبی تعصب کی شدت کو کسی طرح کم کیا جاوے۔ چنانچہ حکمت و تحقیق جدید کے نام سے آزاد خیالی و مطلق العنانی کی ہوائیں چلنے لگیں۔ لیکن افسوس کہ مرض کو دور کرنے کے لئے ایسا نسخہ تجویز کیا گیا جو آگے چل کر ایک دوسرے مرض کی تولید کا باعث ہوگیا۔ پہلے افراط تھی تو اب تفریط ہوگئی۔ پہلے تعصب و اوہام تھے، تو اب انکی جگہ الحاد و بے قیدی نے نشوونما پائی، اور تاریخ مذہب کے ہر گذشتہ دور کی طرح

...... اس دور میں بھی افراط و تفریط کی دو جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ پہلی جماعت علماء دنیا پرست اور متعصبین جاہلین کی تھی، جو اپنی ہوا پرستیوں اور تعصب و جہالت سے اصل مذہب کو بدنام کر رہے تھے۔ دوسری جماعت ان کے مدمقابل مدعیان تحقیق جدید و اجتہاد فکر کی تھی، جنہوں نے حکمت و دانشمندی اور مذہب عقلی و طریق حکیمانہ کے نام سے الحاد و بے دینی اور اباحت و بے قیدی کی گرم بازاری کر رکھی تھی اور اہلِ حق و اقتصاد کا طریق ان دونوں سے الگ تھا۔ وہ جس طرح پہلی جماعت کے تسبیح زور اور خرقۂ سالوس سے بیزار تھے، اسی طرح دوسری جماعت کے فریب عقل اور فتنۂ دانش و آزادی سے:

ازاں دعویٰ بہ شیخ و برہمن ماند　　　کہ ہر یک داورے رامی پرستند

بقیہ نوٹ صفحہ (۳۵)

ہے۔ ۹۹۰ھ کے حالات میں لکھتے ہیں۔ "مخدوم الملک در احمد آباد در گذشت۔ قاضی علی از فتح پور بجہت تحقیق اموال او نامزد شدہ بہ لاہور آمد، وچنداں خزائن و دفائن پدید گشت کہ قفل شمار آں را بہ کلید وہم نتواں کشاد! ازاں جملہ چند صندوق خشت طلا از گورخانۂ مخدوم الملک کہ بہ بہانۂ اموات دفن کردہ بود، ظاہر شد۔ وآنچہ پیش مردم ماند عدد آنرا جز آفریدگار کس نداند، وآں ہمہ خشتہا با کتب وے کہ نیز حکم خشت داشت (!) داخل خزانہ عامرہ گردید۔ الخ" (جلد دوم صفحہ ۳۱۱)

می کشیدم مئے وسجادۂ تقویٰ بر دوش!　　　آہ اگر خلق شود آگہ ازیں تزویرم!

یہی صورت حال آج بھی درپیش ہے۔ مذہب کے دکانداروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے، اور روشن خیالی و تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباس فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے، نہ محراب مسجد میں اخلاص، اور نہ میکدے میں رندان بے ریا۔ ارباب صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کی راہ دوسری ہے:

ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگ رہ ما بود
رفتیم و صنم بر سر محراب شکستیم

عہد اکبری میں بھی ارباب حق و صفا کا جو گروہ تھا، وہ ان دونوں سے الگ تھا اور چونکہ دربار شاہی پر بدبختانہ یکے بعد دیگرے انہی دو گروہوں کا تسلط رہا، اس لئے ان کو طرح طرح کے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت شیخ جمال الدین بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ خاندان ملا مبارک (یعنی ابو الفضل و فیضی) نے مولویوں کا زور توڑنے کے لئے ایک تدبیر یہ کی کہ ۹۸۷ھ میں اپنے والد ملا مبارک سے ایک محضر طیار کرایا۔ مضمون یہ تھا کہ "پادشاہ خلیفۃ الزمان اور امام عہد واجب الاطاعت ہے، اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ مسائل مختلف فیہا میں حسب ضرورت وقت اجتہاد کرے، اور اس کا اجتہاد واجب العمل ہے۔" اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔ فی الحقیقت خلیفۂ وقت و ارباب حل و عقد و اصحاب شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے، اور اسی کے سدِ باب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اکبر بالکل مذہب سے بے خبر تھا، اور اس کے مشیروں کا رنگ دوسرا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا (اور نکلا کہ) پادشاہ کی امامت و اجتہاد، بے قیدی و الحاد کا ایک محکم ذریعہ بن جاتی اور بالآخر بنی۔ اس لئے ضرور تھا کہ علمائے حق کو اس محضر کے قبول کرنے میں سخت تامل ہو۔

لیکن حکومت کے زور کے آگے کس کی چلتی ہے؟ علماء سو نے اپنی بداعمالیوں سے اپنا اثر پہلے ہی کھو دیا تھا۔ مجبوراً سب کو دستخط کرنے پڑے۔ سب سے پہلے انہی گردن کشوں

نے سر جھکایا جن کی رگِ گردن سب سے زیادہ موٹی تھی اور جس کی فصد کھولنے کے لیے یہ نشتر تیز ہوا تھا، یعنی ملا عبدالنبی صدر اور مخدوم الملک نے۔ پھر قاضی القضاۃ جلال الدین ملتانی اور شیخ عبدالحی مفتی وغیرہ سب نے بلاچون وچرا اپنی اپنی مہریں ثبت کردیں، اور علمائے دربار میں سے کسی کو انکار و تامل کی جرأت نہ ہوئی۔ ملا عبدالقادر بدایونی ۹۸۷ھ کے وقائع میں لکھتے ہیں:

دریں ایام محضرے بخط و مہر مخدوم الملک و شیخ عبدالنبی صدرالصدور و قاضی جلال الدین ملتانی کہ قاضی القضاۃ بود، وصدر جہاں مفتی کل، و شیخ مبارک کہ اعلم علماء زمان بود، و غازی خاں بدخشی کہ در علم معقول بے نظیر بود، در باب تفصیل امام عادل مطلقاً بر مجتہد، و تجویز ترجیح او روایت مرجوحہ را در مسئلۂ مختلف فیہا درست کردند..... سخن در آں باطناب کشید...... بالآخر بعضے بطوع و بعضے بکرہ بر آں محضر مہرہا کردند" (جلد دوم صفحہ ۲۷۰)

ہم بڑی چیز سمجھتے تھے پہ میخانے میں
نکلا ایک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا

اللہ اللہ! کیا انقلابِ وقت ہے! یہ وہی مہریں ہیں جو کبھی علمائے حق کی تکفیر و تضلیل کے فتوں پر ثبت ہوتی تھیں اور ان کے قتل و سلب کے فرامین کا دامن سیاہ کرتی تھیں۔ آج ایک ان پڑھ نوجوان کی امامت واجتہاد کی تصدیق کر رہی ہیں، تاکہ یہ مصدقہ امامت کل کو خود انہی کے آگے آئے، اور اپنے پہلے ہی جھونکے میں ان کی شیخ الاسلامی اور مذہبی فرمانروائی کا چراغِ غرور گل کردے!

نہ لپٹیں نہ ہوں قتل، انصاف یہ ہے
کہ ہم خود بد آموز قاتل ہوئے ہیں!

افسوس! ہر عہد اور ہر دور میں جس قدر بربادیاں ہوئیں، علمائے سوء ہی کے ہاتھوں ہوئیں وقت اور زمانے کی شکایت بے سود ہے:

تا کے ملامت مژۂ اشکبار من یک بار ہم نصیحت چشمِ سیاہ خویش

سچ یہ ہے کہ عہدِ اکبری کے تمام فتنہ و فساد کے اصلی ذمہ دار یہی علماء عبید الدنیا ہیں، نہ کہ ابو الفضل و فیضی۔ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اسی عہد کی نسبت اپنے مکاتیب میں بار بار لکھتے ہیں۔ "ہر فتورے کہ دریں زمان در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ، از شومیٔ علماء سو است کہ فی الحقیقت شرار مردم ولصوص دین اند اولائک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون" اکبر نے تمام حاملین مذہب کا یہ حال دیکھا تو سرے سے مذہب ہی کو خیرباد کہدینا چاہا۔ خود ابو الفضل و فیضی کو بھی انہی لوگوں نے اپنی ہوا پرستیوں اور ظلم و عدوان کے نمونے دکھلا کر اس طریقہ میں آنے کی دعوت دی تھی جس کی بے اعتدالیاں دیکھ دیکھ کر وہ خود بھی متاسف ہوتے ہوں گے کہ مقصود کیا تھا اور کیا سے کیا ہوگیا؟ انہوں نے علماء سو کے غرور و پندار کا بت توڑنے کے لئے ایک دوسرا بت طیار کیا، جس کا نام اکبر تھا۔ لیکن آگے چل کر خود اسی بت کی پرستش شروع ہوگئی۔ فیضی نے اگر علماء وقت کی نسبت یہ کہا تھا تو کیا غلط کہا تھا؟

زباں کشیدہ بدر القضاء عجب دریا
شہود کذب ز دعویٔ گراں ایمانی
اگر حقیقت اسلام درجہاں اینست
ہزار خندہ کفرست بر مسلمانی!

دار الحکومت کے علماء دربار نے جب اس محضر کی تصدیق کردی تو ضرورت ہوئی کہ ملک کے سربر آوردہ علماء کو بھی قابو میں لایا جائے۔ دار الحکومت کے بعد سب سے بڑا مقام دہلی تھا، اور مرکز علم ہونے کے اعتبار سے اس پر فائق۔ وہاں کے اصحاب درس و تدریس میں مولانا شیخ جمال الدین ممتاز تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی محضر پر دستخط کرنے کے لئے شیخ موصوف کو مجبور کرنا چاہا، لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا دربار کی طاقت اور علماء وقت کا اجتماع ان کو مرعوب نہ کرسکا، اور صاف انکار کردیا۔ شیخ موصوف کی زندگی کا یہ واقعہ نہایت اہم ہے، اور اس سے ان کی حق پرستی اور بے لوث زندگی کا اندازہ

کیا جا سکتا ہے۔ اس محضر پر دستخط نہ کرنا گویا اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا تھا، اور دربار وقت کو اپنی مخالفت کا یقین دلانا۔ یہ وہ پرشور و نازک وقت تھا کہ بڑے بڑے دعویداروں کے قدم ڈگمگا گئے تھے، مگر سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیام حق کے لئے جن اہل اللہ کا شرح صدر کر دیتا ہے، ان کی استقامت کو کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی۔ الا، ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون!

فصل

دوسرا واقعہ جس کی طرف صاحب تذکرہ نے اشارہ کیا ہے، وہ معاملہ ہے جو حضرت شیخ داؤد اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری میں ہوا تھا۔ مناسب ہوگا کہ اس کی مختصراً تشریح کر دی جائے۔ شیر شاہی و سلیم شاہی عہد کے اکابر اولیاء اللہ میں سے ایک بزرگ شیخ داؤد جھنی وال تھے۔ ان کے آباء کرام عرب سے ہندوستان آئے اور ملتان میں قیام کیا۔ ان کی ولادت وہیں ہوئی، لیکن ایک عرصے کے مجاہدات و ریاضات کے بعد جب ہدایت اور ارشاد خلق اللہ کی طرف توجہ ہوئی تو موضع جھنی علاقہ لاہور میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنی پاک نفسی اور قوت ربانی کے جذبہ سے ہزاروں لاکھوں طالبان حق کے دلوں کو کھینچ لیا۔ یہ اس عہد پر فتن و فساد کے ان مخصوص بزرگان حق میں سے ہیں جو مدت العمر اپنی بوریائے فقر پر قانع و منقطع رہے اور دنیائے فانی کی دلفریبیاں کبھی ان کی جمعیتِ خاطر کو پراگندہ نہ کر سکیں۔ منتخب التواریخ، اخبار الاخیار، تذکرۃ الواصلین، طبقات اکبری، روضۃ العلماء وغیرہ میں ان کے مفصل حالات درج ہیں، اور سب یک زبان ہو کر لکھتے ہیں کہ اعلانِ حق اور امر بالمعروف میں تیغ بے نیام تھے اور کسی حال میں اپنے تئیں وعظ و نصیحت اور تذکیر و ارشاد حق سے معاف نہیں رکھتے تھے۔ علی الخصوص ان عالمانِ بے عمل اور صوفیانِ ریاکار سے سخت بیزار تھے جو حُبِّ جاہ

اور عشق مال ومتاع دنیوی میں سرگشتہ وہلاک ہو گئے، اور ادعاء علم ومشیخت کو اپنی دکان آرائی اور دنیا طلبی کا وسیلہ بنا لیا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ جن علماء نے بادشاہوں اور امیروں کو اپنا قبلہ و کعبہ بنا لیا ہے، ان سے وہ مکھی ہزار درجہ افضل ہے جو نجاست پر بیٹھتی ہے۔ پھر یہ رباعی پڑھتے:

آں کس کہ زغوغا نہ رہد وائے برو
برخلق جہاں دل بدہد، وائے برو
در دست فقیر نیست نقدے جز وقت
آں نیز گر از دست دہد وائے برو

علماء سو اور بندگان دنیا کی مخالفت و برہمی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ ایک درویش شکستہ حال اپنی پھٹی چٹائی پر بیٹھ کر ان کے اس جاہ و جلال دنیوی کو نظرِ حقارت سے دیکھے جو دین فروشی کے بدلے حاصل کیا گیا ہے؟ اور آلودگیوں اور آلائشوں کے جن دھبوں کو انہوں نے نقش و نگارِ عزت سمجھ کر اپنی آستین و دامن میں جگہ دی ہے، ان کو ناپاکی کا داغ اور نجاست کا دھبہ تبلائے؟ ہر دور اور ہر زمانے میں یہی چیز ہے جس نے فقہاء دولت اور علماء دربار کو فقراء حق کا دشمن بنا دیا ہے، اور پھر اس مخفی کینہ و حسد کو کام میں لانے کے لئے طرح طرح کے نام نہاد مذہبی الزام وحیل پیدا کر لئے گئے ہیں۔ چونکہ بادشاہ اور عوام دونوں ان لوگوں کے قبضے میں ہوتے ہیں، اس لئے جب چاہتے ہیں پولٹیکل خطرہ دکھلا کر بادشاہ وقت کو، اور مذہبی الزام تراش کر عوام کو بھڑکا دیتے ہیں۔ سلیم شاہ کے عہد میں جب مخدوم الملک شیخ الاسلامی کی مسند حکومت پر متمکن ہوئے اور اہل اللہ اور داعیانِ حق کی ایذا و ہلاکت پر کمر باندھی، تو حضرت شیخ داؤد پر بھی نظر پڑی۔ انہوں نے اپنے جوشِ حق گوئی میں بارہا مخدوم الملک وغیرہ علماء دربار کو دنیا طلبیوں اور فقراء حق کی مخالفتوں پر ملامتیں کی تھیں۔ اب اس کا انتقام لینا چاہا، اور چونکہ یہ دوسرے دنیا طلب مشائخ کی طرح ان کی شیخ الاسلامی کے آگے نہیں جھکے تھے۔ اس لئے اور زیادہ

برسرِ مخالفت ہو گئے۔ بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں مخدوم الملک نے بعض اکابر اہل اللہ کو طرح طرح کے فتنے اٹھا کر قتل کرایا تو ان کی طرف بھی مخالفانہ عزم سے متوجہ ہوئے، اور گوالیار سے سلیم شاہ کا فرمان بھجوا کر طلب کرایا۔ یہ تنہا ایک دو خادموں کو لے کر روانہ ہوئے اور گوالیار سے باہر ملاقات ہوئی، لیکن شیخ کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ "ازیں روئے دروغ نیاید"۔ شیخ نے چند کلمے وعظ و نصائح کے فرمائے، اور عزت و احترام کے ساتھ واپس کر دیئے گئے۔ بدایونی نے واضح طور پر نہیں لکھا ہے کہ مخدوم الملک نے ان پر بظاہر الزام کیا لگایا تھا، اور وجہ مخالفت و طلبی کیا قرار دی تھی؟ ملاقات کی گفت و شنود لکھتے ہوئے صرف اس قدر لکھا ہے:

"بعد از حرف و حکایت پرسیدند کہ تقریب طلب فقراء منقطع چہ بود؟ مخدوم الملک گفتہ کہ مریدان شمارا شنیدم کہ در وقت ذکر گفتن یا داؤد یا داؤد می گویند۔ جواب دادند کہ مگر اشتباہ در سماع رفتہ باشد۔ والا ایں جماعت ظاہراً یا ودود یا ودود می گفتہ باشند" (جلد سوم صفحہ ۳۲)

بظاہر یہ بات تو کچھ وقیع معلوم نہیں ہوتی، لیکن عجب بھی نہیں۔ اس گروہ کے مکر و حیل کے کاروبار بہت وسیع و پیچیدہ ہیں۔ عجب نہیں کہ اسی راہ سے مصیبت میں پھنسا دینے کا قصد ہو، اور "یا ودود" کو "یا داؤد" بنا کر فتنہ اٹھانا مقصود ہو لیکن تذکرۃ الواصلین کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ پر مہدوی ہونے کا بھی گمان کیا گیا تھا، اور مخدوم الملک نے اسی کو بنائے مخالفت و فتنہ انگیزی قرار دیا تھا۔ اتنی اصلیت اس میں ضرور تھی کہ وہ سید محمد جونپوری کی ولایت و بزرگی کے معترف تھے اور مولانا جمال الدین نے اس کے اثبات میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کتاب میں اگرچہ مہدویہ کے عقاید کو باطل قرار دیا تھا، لیکن خود سید محمد جونپوری کی علانیہ حمایت کی تھی۔ علاوہ بریں حضرت شیخ عبداللہ نیازی اور شیخ علائی کے واقعہ میں بھی ان کی رائے مخدوم الملک وغیرہ علماء دربار کے موافق نہ تھی اور جو سلوک ان دو بزرگوں کے ساتھ کیا گیا اس کو

سخت ظلم و فساد قرار دیتے تھے۔ اخبار الاخیار کے ایک اشارے سے بھی اس کی کچھ کچھ تصدیق ہوتی ہے۔ یہ الزام اس وقت کے حالات کے لحاظ سے واقعی ایسا الزام تھا کہ اگر چل جاتا تو شیخ کے لئے بھی وہ جامِ شہادت طیار تھا، جو مخدوم الملک کے ہاتھوں بعض دیگر اہل اللہ کو پینا پڑا۔

فصل

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ اس زمانے میں مہدوی فرقہ کا نیا نیا چرچا ہر طرف پھیلا ہوا تھا، اور علماء دربار کے لئے اس فرقہ کے قتل و سلب اور تکفیر و تضلیل کا شغلہ سب سے زیادہ دلپسند اور کامیاب مشغلہ تھا۔ ان لوگوں کو ہر زمانے میں اپنی دلبستگی و حکمرانی کے لئے فرقہ آرائی اور جنگ و قتال مسلمین کا کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ملنا چاہیئے۔ اس وقت کے مناسب حال اس سے بڑھ کر اور کوئی مشغلہ نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ فرقہ سید محمد جونپوری کی طرف منسوب ہے، جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے۔ اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے عقاید میں بہت سی نئی نئی باتیں اور حد غلوّ سے بھی گذرے ہوئے اعتقادات شامل ہو گئے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت و حق پرستی پر پڑی تھی۔ یعنی دعوت و تبلیغ حق و احیاء شریعت و قیام فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا مقصد اصلی تھا، اور خود سید محمد اور ان کے پیروؤں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست لوگ تھے۔

اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتدا میں کچھ ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں اور فتنۂ غلوّ و تاویل پچھلی امتوں کی طرح اس امت کی ہر جماعت کے لئے بھی ایک بڑا فتنہ رہا ہے۔ یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی، اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت

اخلاف کے غلو و محدثات میں گم ہوگئی۔

سید محمد جونپور کے رہنے والے تھے۔ ۸۴۷ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کے اشد شدید مخالف بھی معترف ہیں کہ علوم رسمیہ کے ساتھ زہد و درویشی اور ورع و تقویٰ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ شیخ علی متقی (کہ سید کے معاصر اور سخت مخالف ہیں اور ان کے رد میں رسالہ لکھا ہے) تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ابتدائی عہد کمال زہد و تشقف اور استغراق و استہلاک باطنی میں گذرا۔ سات سال تک یہ حال رہا کہ پے درپے روزہ رکھتے اور تن تنہا ایک گوشے میں پڑے رہتے۔ اسی اثناء میں ان پر ایک سانحہ وارد ہوا اور معلوم ہوا کہ "انت المہدی" کی صدا آرہی ہے۔ برسوں تک متامل رہے، اور جب پے درپے یہی معاملہ پیش آیا تو اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا۔ نویں صدی کا وہ زمانہ جو اکبر سے پہلے گذرا، ہندوستان میں سخت بدامنی اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ روز روز بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی تھیں، اور کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں رہی تھی۔ جو احکام شرع کے اجراء و قیام کی ذمہ دار ہوتی۔ علماء حقانی بہت کم تھے، اور علماء دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دنیا طلبی اور مکر و زور کی گرم بازاری تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ جاہل صوفیوں کی بدعات و منکرات نے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ یہ حال دیکھ کر سید موصوف نے احیاء شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا، اور لوگوں سے کہا کہ اب نہ کسی مجاہدہ کی ضرورت ہے اور نہ ذکر و شغل کی۔ سب سے بڑا مجاہدہ یہی ہے کہ خلق اللہ کو سیدھی راہ پر لگاؤ، اور احکام شرعیہ کے قیام کی راہ میں اپنی جانیں تک لڑا دو۔ عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے، اور متعدد سلاطین وقت نے ان سے بعیت کی۔ ان لوگوں کے طور طریق کچھ عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے، اور ایسے تھے کہ صحابۂ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشق الٰہی کی ایک جاں سپار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی فانی

الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا، اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہِ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن گئے تھے۔ امیر و فقیر، اعلیٰ و ادنیٰ، سب ایک حال اور ایک رنگ میں رہتے، اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکامِ شرع کے اجراء و قیام کے اور کسی کام سے واسطہ نہ رکھتے۔ ایک حکم یہ تھا کہ پہلی منزل ہجرت کی ہے جو اس راہ میں قدم رکھے، سب سے پہلے چاہیئے کہ قیدِ وطن سے آزاد ہو اور گھر بار چھوڑ کر اپنے برادرانِ طریقت کا ساتھی بن جائے۔ دوسری منزل ترک مال کی ہے۔ لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ پس مال کسی ایک فردِ واحد کا نہیں ہو سکتا۔ جس کے پاس جو کچھ ہو اپنے رفیقانِ طریق میں بانٹ دے۔ تیسری منزل ترک جان کی ہے۔ فتمنوا الموت ان کنتم صادقین پس ہر وقت راہ حق میں سر بکف رہو، اور اعدائے شریعت و حق اگر فرقان و میزان کے آگے نہ جھکیں تو قوتِ حدید سے کام لو۔ فیہ باس شدید! اور اس میں شک نہیں کہ یہ جتنی باتیں تھیں حق تھیں آگے چل کر نادان معتقدوں نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا: ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ:

ترک جان، و ترک مال، و ترک سر

در طریقِ عشق اوّل منزل ست!

یہ تمام حالات ان کے موافقین اور مخالفین سب نے لکھے ہیں۔ مثلاً مخالفین میں شیخ علی متقی، شیخ ابن حجر مکی، شیخ عبد الحق محدث، اور شیخ اسعد مکی وغیرہم اور موافقین میں خود ان کے معتقدین مثلاً اخوند میر، شیخ دلاور، شہاب الدین، میاں قاسم، اور صاحب شواہد و مطلع الولایت وغیرہم۔ لیکن معتقدین نے ان امور پر قوانین شرع کا رنگ چڑھا دیا۔ مثلاً سید محمد نے تکمیل انقطاع و ایثار و محبت کے لئے مال تقسیم کر دینے کا حکم دیا تھا انہوں نے اس کو یہاں تک بڑھایا کہ جب مال سب کا حق ہے تو پھر ورثہ اور ترکہ کیسا؟ عزیز و اقارب کو بھی کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔ اور پھر اس کو قانونِ توریث کے مقابلے میں ایک

قانون شرعی سمجھا۔ مخالفین نے اس کا رد کیا کہ یہ شریعت سے انحراف ہے۔ اور حکم تو ریث کو کہ نص قطعی سے ثابت ہے باطل کرنا ہے' اور پھر اس کو تکفیر و تفسیق کیلئے حجت ٹھہرانا۔ اس طرح موافق و مخالف' دونوں اصلیت سے دور جا پڑے' اور دونوں میں سے کسی نے بھی اس مصلح مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کیا۔ افسوس کہ یہ معاملہ بہتوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دنیا کی تاریخ ہدایت و اصلاح امم کی نصف گتھیاں اسی سوء فہم اور تاویل و تعبیر باطل کی الجھائی ہوئی ہیں۔ پہلوں نے کچھ کہا تھا اور پچھلوں نے کچھ سمجھا۔ معتقدین نے غلو کیا اور مخالفین نے تعصب و تشدد! ظلمات بعضھا فوق بعض۔ اور اس تاریکی میں اصل حقیقت گم ہو گئی۔ اصحاب طریق و معارف کی باتوں کے سمجھنے کے لئے بھی دل صافی اور فہم مستعد و عالی چاہیئے۔ صرف مدرسوں کی دماغ سوختگی اور تسبیح و سجادہ کی دکان آرائی سے یہاں کام نہیں چلتا:

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست

سخن شناس نہ' دلبرا خطا اینجاست!

تاریخ عالم کی پرانی سے پرانی گمراہی کا بھی سرچشمہ اگر ڈھونڈھا جائے تو یہی سوء فہم کا فتنہ نکلے گا۔ بتلانے والوں نے کیا کہا تھا اور سمجھنے والوں نے کیا سمجھا؟ ہمارا عقیدہ ہے کہ دنیا کے تمام بانیان ادیان و ملل میں سے کسی نے بھی شرک و انسان پرستی کی تعلیم نہیں دی تھی۔ پرانی سے پرانی بات جو دنیا میں کہی گئی ہے صرف سچائی اور خدا پرستی ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ ان کے ماننے والوں نے شرک و بت پرستی کا راستہ اختیار کیا اور اپنی ساری کج فہمیوں کو انہی کی جانب منسوب کر دیا۔ جب انبیاء کرام علیہم السلام کے ارشادات محکمہ کو ان کے پیرو نہ سمجھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی صاف صاف تمثیلوں کو کیا سے کیا بنا دیا، تو پھر عامۂ مصلحین امت و صلحاء طریق کہ بیچارہ کار و درماندہ احوال و دل باختہ کشاکش تلوین و تمکین ہیں' اس فتنہ سے کیونکر بچ سکتے ہیں؟

آنکس ست اہل بشارت کہ اشارت داند نکتہا ہست بسی' محرم اسرار کجاست؟

غرضکہ علماء سوا ور مشائخ دنیا پرست پر ان لوگوں کی بے پردہ حق پرستیاں بہت گراں گزریں۔ جو لوگ صداقت پسند تھے ان میں سے بھی بعض غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف سے مخالفت ہونے لگی۔ پہلے تضلیل و تکفیر کا سلسلہ چلا، پھر قتل و سلب تک نوبت پہنچی۔ مخالفت کا بڑا سبب یہ ہوا کہ یہ لوگ اعلان حق میں بڑے ہی بیباک و شدید تھے، اور سب سے زیادہ علماء دنیا کو ان کی ہوا پرستیوں اور غفلتوں پر سرزنش کرتے تھے۔ یہی چیز ہر زمانے میں ہر مصلح کو علماء عہد کی نظروں میں مبغوض بنا دیتی ہے، اور مصیبت یہ ہے کہ بغیر اس کے چارہ بھی نہیں۔ جب مخالفت کا بہت زور ہوا تو گجرات چلے گئے۔ سلطان محمود کلاں صورت دیکھتے ہی معتقد ہو گیا لیکن علماء نے وہاں بھی مخالفت کی۔ مجبوراً حجاز و عرب کا رخ کیا۔ وہاں سے ایران گئے۔ سلطان اسماعیل صفوی کا زمانہ تھا۔ اس نے ہجومِ خلائق دیکھا تو نکل جانے کا حکم دیا۔ ہندوستان کی طرف دوبارہ آرہے تھے کہ فراہ میں انتقال ہو گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی ۹۱۱ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:

"و دریں سال میر سید محمد جونپوری قدس اللہ سرہ از اعاظم اولیاء کبار کہ دعویٰ مہدویۃ ازو بر زدہ بود، ہنگام مراجعت از مکہ معظمہ بجانب ہند در بلدۂ فراہ داعئ حق را لبیک فرمود۔ قاضی سین زرگر قندھاری کہ فقیر او را و او میر را ملازمت کردہ بود ایں تاریخ یافتہ:

گفتا کہ برو، زشیخ کن استغفار"

سید موصوف کا معاملہ عجیب ہے اور طرح طرح کے دعاوی و شطحیات ان کی جانب منسوب کئے گئے ہیں۔ معتقدین کی باتیں تو قابلِ توجہ نہیں کہ لوگ جس کسی کو پیشوا مانتے ہیں اس کو خدا بنائے بغیر نہیں چھوڑتے، اور اگر بہت احتیاط کی تو نبوت تک پہنچا کر چھوڑا۔ لیکن بعض قریب العہد اور قابلِ اعتماد راویوں نے بھی اس قسم کی باتیں لکھدی ہیں کہ اول نظر میں طبیعت کو خلجان ہوتا ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں

"در اعتقاد سید محمد جونپوری ہر کمالیکہ محمد رسول اللہ صلعم داشت در سید، سید محمد را نیز بود۔ فرق ہمین ست کہ آنجا باصالۃ بود و اینجا بہ تبعیۃ۔ و تبعتہ رسول بجائے رسیدہ کہ ہیچ او شد"

شاہ صاحب کی یہ عبارت دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ ہمارے زمانے میں مرزا صاحب قادیانی کے معتقدین میں سے ایک بڑا گروہ بھی مرزا صاحب کی نسبت بعینہٖ یہی اعتقاد رکھتا ہے، اور اسی اصالت و تبعیت کے فرق پر اپنے تمام غلو و اغراق کی بنیاد رکھی ہے۔ وما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ۔

لیکن شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا ہے کہ سید موصوف نے یہ بات خود کہی یا ان کے مریدین و معتقدین کا استنباط اور پیر پرستانہ منقبت سرائی ہے۔ خود سید موصوف نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ ام العقائد جو ان کی جانب منسوب ہے۔ وہ بھی ان کے مریدوں کی لکھی ہوئی ہے۔ صاحب "ہدیہ مہدویہ" نے اس کی عبارتیں نقل کی ہیں اور ان میں بلاشبہ اس طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں، لیکن قطع نظر قسمت میدانِ تاویل کے ان کا انتساب خود سید محمد کی جانب مشکوک و محل نظر ہے۔ بہر حال اس قسم کی باتیں دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو معتقدین کا غلو و افراط اور سوءِ فہم و زیغِ نظر و ضلالت استنباط و استدلال ہے، یا بصورت ثبوت اس طرح کی تمام باتوں کو غلبۂ سکر و احوال یا فریب سوانح و شاہدات کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ جو اس راہ کے بڑے بڑے کاملین و واصلین تک کو پیش آئے ہیں، اور بہتوں کا معاملہ دعاوی و شطحیات تک پہنچ گیا ہے۔ و کلام السکاریٰ یحمل و یصرف عن الظاہر۔ کسی نے اسی عالم میں کہا، "لوائی ارفع من لواء محمد" اور "سبحانی ما اعظم شانی" کوئی پکار اٹھا "لیس فی جبتی الا اللہ" اور کوئی بول اٹھا "بطشی اشد من بطش اللہ" یہ بھی کہا گیا ہے کہ "خضنا بحراً وقف الانبیاء علیٰ ساحلہ" اور یہ تو مشہور و معروف ہے کہ "قدمی ہٰذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ"

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست!

جب ان تمام اقوال کو لوگ سنتے ہیں، مگر یا تو ان کو مصروف عن الظاہر قرار دے کر تاویل کرتے ہیں، یا "ادھام و خیالات تربی بھا اطفال الطریقہ" کہہ کر چشم پوشی کر جاتے ہیں، اور یا پھر حوالۂ مغلوبیت سکر و حال کر کے خاموش ہو جاتے ہیں، کیونکہ صاحبانِ اقوال کے دیگر اقوال و اعمال صالحہ اور وصول وحصول مراتب عرفان و حقیقت کے شواہد ان کے سامنے ہیں، تو پھر حضرت سید محمد جونپوری نے کیا قصور کیا ہے کہ با وجود کمال زہد و ورع و اتباع شریعت و قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر و ایثار فی اللہ و للہ کے جس سے کسی موافق و مخالف کو انکار نہیں، ان کو حسن ظن اسلامی کا مستحق نہ سمجھا جائے، اور صرف چند کلمات غریبہ کی بنا پر جن کی اصلیت نہیں معلوم کیا ہے، لست مومنا پر اتر آئیں؟ وھلا شققت قلبہ؟

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نام فسق!
داوری خواہم مگر یارب کرا داور کنم؟

قل لو کنتم تملکون خزائن رحمۃ ربی لامسکتم خشیۃ الانفاق

فصل

اصل یہ ہے کہ اصحاب احوال و طریق کے معاملات کچھ عجیب و غریب واقع ہوئے ہیں، اور یہ قوم اپنے کلمات و اقوال غریبہ کے لئے بہت سے عذرات پیش کرتی ہے۔ اہل حق و انصاف نے اُن عذرات کو قبول کیا ہے، مگر جو لوگ ذوق حقیقت سے محروم اور سجن الفاظ و صورت میں محبوس ہیں۔ ان کا فہم نارسا وہاں تک نہیں پہنچتا، اور "رہایت اسں اُیرمی" سن کر شیر کے پنجے اور ناخن ڈھونڈھنے لگتے ہیں۔ بلاشبہ خواطر و احوال کے لئے شریعت الٰہی اور علوم انبیا کرام محک رد و قبول و معیار ظن و یقین ہیں، لیکن اکثروں کو مغلوبیت سکر و سرگشتگی حال میں اس کا ہوش ہی نہیں رہتا کہ اس کسوٹی کے لئے ہاتھ بڑھائیں۔ یہ سخت غلطی ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ ہماری درماندگی و معذوری پر بھی نظر رہے:

سقونی وقالوا لا تغنِ، ولو سقوا
جبال سراة ما سقیت، لغنت!

جب حواس ظاہری کا عذر مسموع ہے اگر حاسۂ بصر سراب کو دریا سمجھ لے۔ اور ارباب قیل و قال و فقہا و متکلمین کے لئے باب تاویل مفتوح ہے اگر رائے و قیاس میں غلطی کر جائیں تو پھر اصحاب احوال نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کی لغزشِ فہم و اشتباہ احوال و غلطی استنباط ناقابل معافی و عفو ہو؟ فیاللہ و یا للعقول! جن نفوسِ قدسیہ کی ساری زندگیاں زہد و انقطاع حقیقی، و کمال مرتبۂ عرفان و محبت الٰہی

واعمال صالحہ وحقہ، وترک ماسوی اللہ میں بسر ہو جائیں، ان کی ایک غلطی بھی درخور عفو و تاویل نہ ہو، لیکن جن علمار دنیا وفقہار دولت کی ساری عمریں یکسر دنیا سازی و دین بازی و مکر وحیل و فساد و زر و ہوا پرستی و زہد ریائی میں ضائع جائیں اور جن کو بقول علامہ شوکانی اہل اللہ سے وہ نسبت ہو کالبھیمة بالنسبة الی الانسان، او کالانسان بالنسبة الی الملائکة[1] ان کو پورا حق حاصل ہو کہ اپنی خود ساختہ مسندافتا پر بیٹھ کر کفر وقتل کا فتویٰ لکھیں اور وہ پا بجولاں حربی کفار و مشرکین کی طرح ان کے سامنے لائے جائیں!

یا سالکا بین الاسنة والقنا

انی اشم علیك رائحة الدم

بڑی دقت ان لوگوں کو معانی کی فراوانی و وسعت اور الفاظ کی تنگ نائی و نامساعدت سے پیش آتی ہے۔ ناچار ہنگام تعبیر وبیان جو الفاظ سامنے آجاتے ہیں۔ انہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ نافہموں کے لئے وہ الفاظ فتنہ بن جاتے ہیں۔ معتقدین مقلدین ان کو حجت گردانتے ہیں، اور منکرین متعصبین آلۂ انکار و تکفیر لیکن ارباب حق واقتصاد یا تو ان کی تاویل کرتے ہیں، یا ان کے معاملے کو عالم السرائر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ البتہ عمل و اعتقاد ہر حال میں احکام شریعت وظواہر نصوص کتاب و سنت پر ہے، اور ان کے سوا کوئی نہیں جو محک حق و باطل و حجت و برہان ہو۔ والعصمة الانبیاء ومن عداهم قد یخطی ویصیب، فمن ظن انه یکتفی بما وقع فی خاطره مما جاء به الرسول، فقد ارتکب اعظم الخطاء و ضل ضلالا مبینا۔

---

[1] علامہ شوکانی نے یہ اپنے رسالہ قطر الولی شرح حدیث ولی مندرجہ کتاب التواضع بخاری میں لکھا ہے۔

فصل

کیا خوب فرمایا ہے حجت الاسلام علامہ ابن قیم نے اعلام میں، اور گویا ایک ایسا اصل الاصول تبلا دیا ہے جس کے بعد اس راہ کی ساری مشکلات معدوم ہوجاتی ہیں۔ کہ لابد من امرین، احدھما اعظم من الآخر وھو النصیحۃ للہ ولرسولہ و کتابہ وتنزیھہ عن الاقوال الباطلۃ المناقضۃ، والثانی معرفۃ ائمۃ الاسلام ومقادیرھم وحقوقھم ومراتبھم، وان فضلھم لا یوجب قبول کل ماقالوا ولا یوجب اطراح اقوالھم" الخ۔

یعنی صحیح راہِ حق و اعتدال کی یہ ہے کہ دو اصل ہیں، اور دونوں کا ملحوظ رکھنا ضروری۔ ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب و سنۃ اور نصوص شرعیہ کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ اور اسی پر حکم و عمل کرنا چاہیئے۔ دوسری یہ کہ تمام آئمہ اسلام اور علماء حق سے حسن ظن اور محبت و ارادت رکھنی چاہیئے اور ان کے مراتب و حقوق کی رعایت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیئے۔ یہی دو اصل ہیں جن کے توازن و تناسب کو باعتدال ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں، اور بدبختانہ لوگوں نے ہمیشہ انہی میں افراط تفریط کی ہے، یا دونوں میں سے صرف کسی ایک ہی کے ہو رہے ہیں۔ ایک جماعت احکام و نصوص شرعیہ کے اتباع و تقدیم کا یہ مطلب سمجھتی ہے کہ جہاں کسی اہل علم وحال کا کوئی قول بظاہر کسی حکم و نص کے خلاف نظر آیا۔ بلا تامل تضلیل و تکفیر پر آمادہ ہو گئے اور جھٹ حکم لگا دیا کہ وہ منکر شریعت ہے، اگرچہ اس نے اپنی ساری زندگی شریعت کے علم و عمل میں بسر کر دی ہو۔ دوسری جماعت نے آئمہ واکابر دین

کی پیروی اور محبت و اعتقاد کے یہ معنی سمجھے کہ احکام و نصوص کو ان کا تابع و محکوم بنا دیا، اور چند غیر معصوم انسانوں کی خاطر کتاب و سنت کو ترک کر کے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ کی سرحد سے قریب ہو گئے۔ اس دوسری جماعت کا عجیب حال ہے۔ یہ جب کبھی اپنے پیشواؤں کے کسی قول کو احکام و نصوص شرعیہ کے خلاف دیکھتی ہے تو اس کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتی کہ قرآن و سنت کو مقدم رکھ کر اس قول مخالف کی تاویل کرے، اور اس طرح شریعت الٰہی کو بھی اپنی جگہ چھوڑنے کی زحمت نہ دے اور پیشوایان اسلام کے دامن کو بھی مخالفت شریعت کے دھبہ سے بچالے، بلکہ برعکس اس کے کوشش کرتی ہے کہ اپنے پیشواؤں کی باتوں اور رایوں کو مقدم رکھ کر کسی نہ کسی طرح قرآن و حدیث کو ان کے مطابق کر دکھائے، اگرچہ ایسا کرنے میں تاویل نصوص، تحریفِ نصوص تک پہنچ جائے! پہلی راہ باعتبار اصل کے راہِ یہود ہے اور دوسری راہ نصاریٰ، اور اسلام نے دونوں کو بند کرنا چاہا کہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین اور ایک حدیث میں مجددین امت کا یہ کام تبلایا کہ "ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المبطلین وتاویل الجاھلین[1]" سو پہلی راہ انتحال المبطلین کی ہے۔ اور دوسری تاویل الجاہلین کی۔ پہلی جماعت کو گمراہی نے بغض و انکار کا چہرہ دکھلا کر بھٹکایا، اور دوسری کو محبت و اتباع کے نقاب میں آکر، اور دنیا میں جس وقت سے نوع انسانی آباد ہوئی ہے، ہمیشہ گمراہی کے یہی دو بھیس رہے ہیں۔ یا افراطِ بغض نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے یا افراطِ محبت نے:

ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

لیکن اہلِ حق کی صراط مستقیم ان دونوں سے الگ ہے:

میانِ کعبہ و بت خانہ راہیست

---

[1] رواہ البیہقی فی المدخل عن ابراہیم بن عبد الرحمٰن العذری مرفوعا۔

وہ ہر حال میں احکامِ شریعت اور ظواہر کتاب و سنت کو مقدم رکھتے ہیں اور اس تمام کائناتِ ہستی میں صرف انہی کو واجب الاطاعت یقین کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی تمام اہلِ علم و آئمہ اسلام سے حسنِ ظن و عقیدہ بھی رکھتے ہیں، اور ان کے جو اقوال و آراء یا احوال و سوانح بظاہر نصوص کتاب و سنت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے یکایک سرگرم انکار و تفضیل نہیں ہو جاتے، بلکہ حتی الوسع انکی تاویل کرتے ہیں اور ایسی راہِ تعبیر ڈھونڈھتے ہیں جو نصوص شریعت کے مطابق ہو۔ اور اگر دیکھتے ہیں کہ کسی طرح اختلاف دور نہیں ہو سکتا تو ان کی خاطر نصوص شرعیہ کو اپنی جگہ چھوڑ کر ماول ہونے کی زحمت نہیں دیتے کہ یہی بنیادِ تحریف ہے۔ بلکہ یا تو ان عذرات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس اختلاف پر مجبور ہوئے[1]۔ اور یا پھر ان کے اقوال و آراء سے چشم پوشی کر کے ان کا معاملہ عالم السرائر کے

---

[1] یہ عذرات اصحاب علم و احوال دونوں کو پیش آتے ہیں۔ اصحاب علم کے لئے یہ کہ مثلاً کسی وجہ سے نص ان تک نہ پہنچی، جیسا کہ بعض اجلہ صحابہ تک کو پیش آیا۔ اور اصحاب احوال کے لئے یہ کہ مثلاً غلبۂ سکر یا فریب سوانح و خواطر۔ یا مثلاً ایک اجمالی کیفیت پیش آئی، یا از قبیل تمثیل و تشبیہ، اور اس کی تفصیل و تعبیر میں قصور فہم و اجتہاد حائل ہو گیا۔ یا مثلاً ایک جزئی و عارضی مقام پیش آیا، اور جز و کل اور عارض و حقیقت میں تمیز کرنے سے بسبب غلبۂ حال درماندہ رہ گئے۔ یا سورج نکل آیا اور اس کی سلطان تجلی میں ستارے ناپید ہو گئے، غلطی سے سمجھ لیا کہ ستاروں کا وجود ہی نہیں:

فلما استبان الصبح ادرج ضوئہ
باسفارہ اضواء نور الکواکب!

کیا خوب فرمایا ہے حافظ ذہبی نے غالباً حضرت ابن مسعود کے حال میں کہ وکل امام یوخذ من قولہ ویترک الا امام المتقین صلی اللہ علیہ وسلم فیا للہ العجب من عالم یقلد اماما بعینہ فی ما قال مع علمہ بما یرد علی مذھب امامہ من النصوص النبویہ!

حوالے کر دیتے ہیں، مگر نہ تو ان کی پیروی و حمایت کرتے ہیں، اور نہ ان کی وجہ سے صاحب قول و حال کے حقوق اسلامی و مراتب فضیلت علم و عمل کو نظر انداز کر کے آمادۂ انکار و تضلیل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کسی غیر معصوم کا قابل احترام و اتباع ہونا اس کے لئے مستلزم نہیں کہ اس کا ہر قول و حال حجت ہو اور نہ کسی غیر معصوم کے کسی ایک قول و اجتہاد کا غلط ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کے تمام محاسن اقوال و اعمال ترک کر دیا جائے۔ قرآن حکیم نے سچے مومنوں کی جو شان بتلائی ہے۔ وہ ان کی اس طلب و دعا سے ظاہر ہے: ربنا ولا تجعل فی قلوبنا غلا۔"
پس جب عام مومنوں کی نسبت یہ حکم ہے تو اصحاب علم و فضیلت کے طرف سے دل میں غل و بغض کا ہونا کب جائز ہو سکتا ہے؟

البتہ اصل مرکز حق و یقین کتاب و سنت ہے۔ یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ سب کو اس کی خاطر اپنی جگہ سے ہل جانا پڑے گا۔ اس چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ سب کی چوکھٹیں اس کی خاطر چھوڑ دینی پڑیں گی۔ لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ جب نص رسول کے مقابلہ میں کسی دوسرے انسان کی پاسداری کی تو رسول احب کب باقی رہا؟ ارباب افراط و غلو کی ساری غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے غیر معصوم پیشواؤں کے اقوال و احوال کو بمنزلہ اصل مرکز بنا لیتے ہیں، جس کو کسی حال میں اس کی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا، اور پھر چاہتے ہیں کہ وحی الٰہی و صاحب وحی کی نص کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ مرکز تک لے جائیں، اور نہ جا سکے تو زبردستی کھینچ کر لے جائیں۔ اس پر ستم یہ کہ اس طریق کو طریق توفیق و تطبیق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ تطبیق ہے والذی نفسی بیدہٖ کہ پھر دنیا میں تحریف کا وجود باقی نہ رہا اور نہ کبھی اہل کتاب نے اس دنیا میں تحریف کی۔
اس مقام پر رشتۂ سخن بہت دراز ہے۔ ہزار چاہتا ہوں کہ موقعہ اطناب کا نہیں، جلد آگے بڑھ جاؤں لیکن یہ رشتہ ایسا ہے کہ ایک مرتبہ کھل جائے تو پھر جلد

نہیں لپیٹا جا سکتا:

این رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز است!

یہ اصول جو ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں اور ان کا اس اسراف کے ساتھ استعمال ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے کہ قریب ہے کہ اصلیت کا پتہ لگانا دشوار ہو جائے کہ "الاصل ان کل اٰیۃ تخالف قول اصحابنا فانھا تحمل علی النسخ او علی الترجیح والاولیٰ ان تحمل علی التاویل - والاصل ان کل خبر یجیئ بخلاف قول اصحابنا فانہ یحمل علی النسخ او علی انہ معارض بمثلہٖ او یحمل علی التاویل"[1] تو گو ابتداءیں اس کا مقصد دوسرا تھا، مگر بالآخر بات وہی ہو گئی کہ اصل مرکز حق و یقین غیر معصوم پیشواؤں کے اقوال و آراء ہو گئے اور ہر حال میں معصوم کے نصوص کو ان کی خاطر ماول و مصروف ہو کر متروک ہونا پڑا۔ بالنسخ ہے یا ترجیح ہے، یا تعارض ہے، یا ماول ہے، یا چناں ہے یا چنیں ہے، یہ سب کچھ کہا جائے گا۔ مگر ایک یہ بات نہیں کہی جائے گی کہ اصل میں وہ قول ہی ماول ہے۔ یا غلط ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟

من و دل گر فنا شدیم چہ باک؟

غرض اندر میان سلامت اوست!

تعارض سے تو کتاب و سنت پاک ہے اور جس کو تعارض قرار دیا گیا وہ تعارض نہیں۔ ترجیح اسی حال میں ہو گی جب عدم تساوی قوت ہو۔ لفظاً یا معناً۔ اور قوی کے سامنے ضعیف کا حکما وجود ہی نہیں۔ پس نص وہی خبر ہے۔ جو مرجح ثابت ہوئی۔ رہا نسخ اور حقیقت و مجاز و تقیید وغیر ذلک تو اس سے انکار نہیں۔ لیکن کتاب و سنت کی منسوخات بہت قلیل اور گنی ہوئی ہیں۔ قرآن کی منسوخ آئتیں (مصطلحہ متاخرین)، گھٹتے گھٹتے اتقان میں بیس تک پہنچیں اور فوز الکبیر میں پانچ تک۔ حدیث

---

[1] ای لابد من تصحیح قول اصحابھم والعمل بہ علی کل حال!

کی منسوخات ابن جوزی کی تحقیق میں اکیس، علامہ ابنِ تیمیہ کے نزدیک دس، اور علامہ ابنِ قیم کہتے ہیں کہ اس سے بھی کم، وہنوز مجالِ سخن باقی۔ پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ قواعد و اساسات کی شکل میں یہ اصول ٹھہرا لیئے جائیں کہ ہر آیت وحدیث جو ہمارے اصحاب ومشائخ کے قول کے خلاف ہوگی ضرور ہے کہ یا منسوخ ہو یا مرجوح یا ماول یعنی وہ قول ماول نہیں ہوسکتا مگر کتاب وسنت اس کی خاطر ضرور ماول ہوں گے؟ تو معلوم ہؤا کہ اصل مرکزِ حق قول فقہائ و مشائخ ہے۔ وہ کسی حال میں چھوڑا نہیں جاسکتا کسی نہ کسی طرح کتاب وسنت کو اس کا ساتھ دینا ہی پڑے گا! فیا للمعصیة و یاللرزیہ! صاف صاف بات تو یہ تھی کہ فقہاء واعلام کا جو قول کسی آیتِ غیر منسوخ یا خبر صحیح کے خلاف ہوگا تو یا اس کی تاویل کی جائے گی، یا ایسے اقوال میں سے سمجھا جائے گا جن کو ترجیح نہیں کہ کتاب وسنت کے منسوخات سے علماء کے اقوال مرجوحہ کہیں زیادہ ہیں۔ اور یا متروک قرار پائے گا، کیونکہ اصل کتاب وسنت ہے، اور فقہائ وعلماء کا قول انہی کی نسبت سے فرعاً مقبول، پس جب اصل وفرع میں تعارض ہؤا تو فرع کو اصل کی خاطر چھوڑ دیا گیا، اور مطلوب شارع اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ہے اور بس:

فدع عنك نهبا صيح في حجراته
وهات حديثا ما حديث الرواحل

یہاں یہ دیکھنا نہیں ہے کہ ان اصول کا مقصد اصلی کیا تھا؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان باتوں کو اصل قاعدہ بنانے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ یہی کہ کتاب سنت کی حکومت باقی نہیں رہتی اور حق مرکزیت وحی وصاحب وحی کی جگہ غیر معصوموں کو مل جاتا ہے فالی المشتکی ثم الی اللہ المشتکی!

اور یاد رہے کہ یہی فرق حکماء سُو اور حکماء حق کے طریقِ تطبیق عقل ونقل میں بھی ہے۔ پہلا گروہ انسانی نظریات وظنون کو باسم علم مرکزِ حق ویقین قرار دے کر

وحی الٰہی سے اس کے چاروں طرف طواف کرانا چاہتا ہے، اور دوسرا اگر وہ مرکز حق ویقین وحی الٰہی اور حکمت نبوی کو قرار دیتا ہے اور تمام انسانی معلومات و افکار کو اس کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے اور راہ مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ تطبیق دونوں دیتے ہیں اور رفاقت علم و عقل کے دونوں مدعی، مگر دونوں کے طریق سیر و وصول میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

نزلوا بمكة في قبائل هاشم

ونزلت في بالبيداء بعد منزل

فصل

چنانچہ اکثر اہل اللہ اور علماء حق کی نسبت منقول ہے کہ سید محمد جونپوری اور ان کی جماعت سے حسن ظن رکھتے تھے۔ یا اقلاً ان کے بارے میں توقف و سکوت کو کام میں لاتے تھے۔

حضرت شیخ داؤد جھنی وال اور مولانا جمال الدین کی رائے پہلے گذر چکی ہے شیخ وجیہہ الدین گجراتی جو اس وقت کے بہت بڑے عالم تھے اور جن کا ترجمہ اخبار الاخیار اور مآثر الکرام وغیرہ میں موجود ہے، ان کے سامنے جب سید موصوف اور ان کے بعض اتباع کی تکفیر کا فتویٰ پیش کیا گیا تو دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جو جماعت دنیا کو چھوڑ کر وقف حق پرستی ہے۔ میرا قلم اس کی مخالفت میں نہیں اٹھ سکتا۔ شیخ علی متقی نے اگرچہ مہدویہ کے غلوّ و محدثات کے رد میں رسالہ لکھا۔ لیکن خود سید موصوف کی نسبت لکھتے ہیں کہ کف لسان اولیٰ ہے۔ شیخ بڈھ

دانا پوری کہ اس عہد کے استاذ الاساتذہ تھے، اور سید رفیع الدین محدث کہ بہ یک واسطہ حافظ عسقلانی کے شاگرد تھے اور ان کا حال اوپر گذر چکا، شیخ عبدالقادر بدایونی ان کی نسبت لکھتے ہیں کہ "با مہدویہ حسن ظن داشتند"۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا قول شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک مکتوب میں نقل کیا ہے کہ سید محمد عالم حق اور واصل باللہ تھے۔ بعض خواطر و واردات ان پر ایسے گذرے کہ ان کے درک و فہم میں درماندہ و عاجز رہ گئے اور خود اپنے مقام کی نسبت دھوکے میں پڑ گئے۔ یہ بات نہ تھی کہ انہوں نے دانستہ غلط دعویٰ کیا ہو۔ حضرت مجدد صاحب اور مرزا مظہر جان جاناں سے بھی ایسا ہی منقول ہے[1]۔

علمائے حق کا تو یہ حال تھا، مگر علمائے دین نے اس جماعت کے استیصال پر کمر باندھی اور سید محمد کی نسبت اعتقاد مہدیہ وغیرہ کو بنیاد تکفیر قرار دیا۔ سید موصوف کے انتقال کے بعد ان کی جماعت اور زیادہ پھلی پھولی، اور بڑے

---

[1] میرا خیال یہ ہے کہ سید محمد اپنے اس دعوے میں سچے تھے کہ مہدی ہیں اور ملک کی جو حالت اس وقت ہو رہی تھی۔ وہ یقیناً ایک مہدی کے ظہور ہی کی مقتضی و منتظر تھی نہ کہ ایک مضل و دجال کی، البتہ غلطی یہ ہوئی کہ لفظ مہدی کو انہوں نے مہدی آخر الزماں سمجھ لیا۔ کیونکہ شہرت و انتظار عام طور پر اسی مہدی کی نسبت ہے اور جب لفظ مہدی بولا جاتا ہے۔ تو سب سے پہلے ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور یہ رائے بھی اسی صورت میں ہے جب کہ خود ان کی نسبت مہدی آخر الزماں ہونے کا مدعی ہونا قطعی طور پر ثابت ہو جائے۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ ان کے قلب پر جو وارد گذرا ہو وہ صرف یہ ہو کہ "انت المہدی" اسی کا انہوں نے اظہار کیا ہو اور معتقدین نے شہرت عام کی بنا پر مہدی آخر الزماں سمجھ کر تمام علائم و آثار مرویہ کو ان پر چسپاں کرنا شروع کر دیا ہو۔ جب انبیاء کرام کو یہ حالت پیش آ چکی ہے کہ

انت قلت للناس اتخذونی وامی الٰہین تو پھر عام صلحائے امت کا کیا ٹھکانا۔

بڑے اہل اللہ اس میں داخل ہوئے۔ ازاں جملہ شیخ عبد اللہ نیازی اور ان کے مرید شیخ علائی رحمہا اللہ تھے۔ جنہوں نے بیانہ میں قیام کیا، اور اپنے علم و حق اور اخلاص و ایثار فی اللہ کی تاثیر سے سیکڑوں جانبازوں اور حق پرستوں کو معتقد و مرید کر لیا۔ جو حالات ناطرفدار و معتمد مؤرخوں نے لکھے ہیں، اگر وہ سچ ہیں تو یہ لوگ انسان نہیں تھے۔ ملاء اعلیٰ کے مقدس فرشتے تھے جن کو خدا نے اپنی زمین کی طہارت کے لئے آدمیوں کے ہیکل میں بھیجدیا تھا۔ اور جب کبھی دنیا کی سعادت و برکت کے دن آتے ہیں تو خدا زمین کے انسانوں ہی سے آسمانی فرشتوں کا کام لیتا ہے۔ آسمان کے فرشتے تو کبھی انسانی آبادیوں میں آکر نہیں بسے: ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ اور نجات الرشید میں، اور نظام الدین ہروی نے طبقات میں ان لوگوں کے مفصل حالات لکھے ہیں، مگر زیادہ تفصیل تذکرۃ الواصلین میں بہ ضمن حالات حضرت شیخ داؤد ملتی ہے اور اس کو پڑھ کر قلب پر ایک عجیب عالم وجد و محویت طاری ہو جاتا ہے، اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ساری باتوں کو چھوڑ کر صرف انہی پاکانِ حق کا ذکر کیجئے کہ اذا داؤ ذکر اللہ:

وحدثتنی یا سعد عنہا، فزدتنی

جنونا، فزدنی من حدیثک یا سعد

صدیاں گذر گئیں۔ عشاق حق کے ذکر میں آج یہ تاثیر ہے۔ نہیں معلوم ان کی پاک صورتوں اور پاک صحبتوں کی گیرائیوں اور دلربائیوں کا کیا حال ہوگا؟

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما!

شیخ عبد اللہ نیازی اس زمانے کے ایک مشہور پیر طریقت اور شیخ سلیم چشتی کے سربرآوردہ خلفاء میں سے تھے، لیکن بعد کو مہدوی ہو گئے، اور مشیخت

ورزیدہ فروشی کا تمام کاروبار تاراج کرکے درویشی و نامرادی کی وضع اختیار کرلی:

در خرمن صد زاہد و عاقل زند آتش

آں داغ کہ ما بر دل دیوانہ نہادیم!

بیانہ میں شہر سے باہر ایک ویران باغ تھا۔ وہیں مٹی کا جھونپڑا بنالیا اور مقیم ہو گئے۔ اپنے ہاتھ سے پانی بھرتے۔ مٹکے سر پہ اٹھا کر لے جاتے۔ پیاسوں کو پلاتے اور نمازیوں کو وضو کرادیتے۔ بوڑھے آدمیوں کو دیکھتے کہ بھاری بوجھ اٹھائے جارہے ہیں تو ان سے چھین کر خود اٹھا لیتے اور کوسوں دوڑتے ہوئے ساتھ چلے جاتے:

با سبک روحاں کن آمیزش، کہ ماندی چوں نہ راہ

بار غم بر دوش دل منزل بمنزل مے برند

نماز کا وقت آتا تو لکڑہاروں اور سقوں کو جمع کرتے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے۔ کسی پیشہ ور کو دیکھتے کہ عذر معاش سے نماز میں شریک نہیں ہوتا تو اپنی کمائی اس کو دے دیتے اور منت وزاری کے ساتھ کہتے کہ جماعت میں شریک ہو کر نماز پڑھ لو۔ وہ پڑھ لیتا تو ایسے خوش ہوتے گویا دنیا جہان کی بادشاہت اس نے دے دی! روز بروز یہ حالت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ عشق خالق اور خدمت خلق کے سوا اور کسی بات سے واسطہ نہ رہا:

دو عالم از اثر شعلہ جانش سوخت

بجز متاعِ محبت کہ در پناہ من ست

اسی زمانے میں اطراف بہار کے ایک عالی خاندان پیرزادے شیخ علائی تھے کہ علم و فضل ظاہری کے ساتھ مشیخت و صوفیت کی شہرت و شوکت میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور یکتائی کے دعوے اور بے ہمتائی کے غرور میں ایسے مہیب تھے کہ علم و فضیلت کی بڑی بڑی سرکش گردنوں کو ان کے سامنے بے اختیار جھک جانا پڑتا تھا۔ مدتوں طرح طرح کی سخت ریاضتیں کی تھیں۔

عوام و خواص میں ان کی مجاہدات کی دھوم تھی۔ بایں ہمہ نفس پرستی کا یہ حال تھا کہ فقیری کے سجادے پر فرعونیت کا تاج پہن کر بیٹھتے تھے اور جس عالم وصوفی کی طرف لوگوں کو ذرا بھی مائل پاتے تھے، فوراً اپنے مریدوں کی فوج لے کر چڑھ دوڑتے تھے۔ کبھی بحث و مناظرہ کے زور سے، کبھی سوٴ اعتقاد کے الزام سے، کبھی اور کوئی حیلہ و بہانہ پیدا کر کے (اور اس گروہ کے پاس مکر و حیل کی کیا کمی ہے؟) اس طرح ذلیل و رسوا کر دیتے کہ غریب شہر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا۔ ایک دنیادار فاسق اور ایک دنیا پرست عالم میں یہی فرق ہے کہ پہلا اپنی ہوا پرستیوں کو اعترافِ فسق کے ساتھ انجام دیتا ہے اور دوسرا دینداری اور احتسابِ شرعی کی ظاہر فریبی سے:

تا بغایت ما ہنر پنداشتیم
عاشقی ہم ننگ و عارے بردہ است

نفس و شیطان کے خدع و فریب کے کاروبار بہت وسیع ہیں۔ لوگوں نے ہمیشہ اس کو میکدوں ہی میں ڈھونڈھا۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں ڈھونڈھتے تو تو شاید جلد پتہ لگ جاتا:

یارب ز سیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بت خانہ کہ خانقہش نام کردہ اند

شیخ علائی کا خاندان بھی عرصہ سے بیانہ میں مقیم تھا۔ قضارا ایک دن شیخ نیازی سے ڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کا طور و طریق دیکھا تو اور ہی عالم نظر آیا، اور پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئے۔ اپنے مریدوں سے کہا کہ خدا پرستی کی اصلی راہ یہ ہے۔ آج تک جو کچھ ہم کرتے رہے، وہ خدا پرستی کے نام سے نفس پروری اور بت پرستی تھی۔ میں تو اس فقیر بے نوا کا ساتھ دیتا ہوں۔ جس کو اللہ کی طلب ہو میرا ساتھ دے:

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں

دیرینہ سال پیرے بردش بہ یک نگاہے

شیخ نیازی سے پوچھا کہ طلب حق کی راہ کیا ہے؟ کہا کہ اپنا سب کچھ لٹا دو، اور متاع عجز و شکستگی اور سرمایۂ نامرادی و خود فروشی کے سوا کچھ باقی نہ چھوڑو۔ دع نفسک ثم تعال!

عشق بستان و خویشتن بفروش

کہ ازیں خوب تر تجارت نیست

اس کے بعد سے شیخ کی حالت ہی دوسری ہوگئی۔ آباؤ اجداد کے سجادۂ مشیخت و مسند علم کو مع ان کے تمام ساز و سامان غرور و پندار کے تاراج کر کے شیخ نیازی کے ساتھ ہو گئے۔ سامان و اسباب دنیوی میں سے کوئی چیز باقی نہ چھوڑی یا تو خود پرستیوں کا یہ حال تھا کہ اپنے سامنے کسی کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ یا اب خاکساری و بے نوائی کا یہ حال ہوا کہ مسلمانوں کی جوتیاں سیدھی کرنے میں بھی عار نہ تھا جن جن لوگوں سے لڑے جھگڑے تھے۔ ایک ایک کے پاس گئے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگیں۔ رفتہ رفتہ سختی کشان عشق کی ایک بڑی جماعت شریکِ حال ہوگئی۔ لوگ گھر بار لٹاتے اور ان کے ساتھ آ آ کر شریک ہو جاتے۔ وما احسن قول العرفی۔

گرچہ اربابِ تعلق وقف طوفانند لیک

رخت اگر کمتر بود کشتی بہ ساحل مے برند

یہ لوگ بیانہ سے باہر اسی ویران باغ میں رہتے تھے۔ زن و فرزند، خویش و یگانہ، خانہ و وطن، کسی چیز سے لگاؤ نہ تھا۔ کچھ لوگ دن کو نکل جاتے۔ محنت مزدوری کرتے۔ جو کچھ ملتا اس میں سے دسواں حصہ راہِ خدا میں خرچ کر دیتے۔ باقی لے کر شام کو آتے۔ ایک گھرانے کے بھائیوں کی طرح مل جل کر کھا لیتے۔ اور اپنے عشق میں مست رہتے۔ کچھ لوگ صبح ہوتے ہی شہر کی راہ لیتے۔ بیماروں کی تیمار داری کرتے، کمزور ول

اور معذوروں کی روٹی پکا دیتے، بیوہ عورتوں کا سودا سلف بازار سے لا دیتے۔ دو شخصوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے تو منتیں کر کے صلح صفائی کرا دیتے، نہ مانتے تو کہتے کہ ہم کو مار ڈالو مگر آپس میں میل ملاپ کر ڈالو۔ استغناء و قناعت کا یہ حال تھا کہ کئی کئی دن گذر جاتے اور کچھ میسر نہ آتا، لیکن دلوں کی بے فکری اور چہروں کی خوشحالی دیکھ کر گمان ہوتا کہ ابھی شکم سیر ہو کر اُٹھے ہیں یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف۔ بھوک کا بہت غلبہ ہوتا تو نماز شروع کر دیتے، اور سلام پھیر کر اٹھتے تو شہنشاہوں کی بے نیازی چہروں سے ٹپکتی۔ ساتھ ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے جوش کا یہ حال تھا کہ معاصی و منکرات کے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ ہر فرد ہمیشہ مسلح رہتا، اور جب کبھی کسی فعل منکر کو دیکھتا تو «فلیغیرہ بیدہ» پر عمل کر کے حکماً روک دیتا۔ ھم فی اللیل رھبان و بالنھار فرسان! اس پر صبر و ثبات کا حال یہ تھا کہ ملامتیں سنتے، گالیاں کھاتے، فاقے کرتے، زخمی ہوتے مگر اپنے کام سے باز نہ آتے اور کہتے کہ گالیوں میں ہمیں وہ مزا ملتا ہے جو تم کو دعاؤں میں نہیں ملتا:

اجد الملامۃ فی ھواک لذیذۃ

حبا لذکرک فلیلمنی اللوم!

ان کی جماعت کے ایک شخص کو سات مرتبہ جلا وطن کیا گیا۔ ہر مرتبہ یہی کہتا رہا کہ ایک بار اور کر دیکھو۔ جس ایمان کو جلا وطنی کا خوف متزلزل کر دے اس سے برہمن کی بت پرستی ہزار درجہ بہتر ہے:

کس منہ سے اپنے آپ کہتا ہے عشق باز

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا!

صبح و شام سب ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھتے اور شیخ علائی قرآن حکیم کی تفسیر بیان کرتے۔ دل کے عشق اور باطن کے سوز و گداز نے ان کے بیان میں کچھ ایسی تاثیر

پیدا کردی تھی کہ زبان سے الفاظ تیر و نشتر بن کر نکلتے اور سننے والے دل تھام کر رہ جاتے۔ کیسا ہی سیہ باطن اور سنگ دل شخص کیوں نہ ہوتا لیکن ان کی زبان سے ایک آیت قرآنی کا وعظ سن کر ایسا خود رفتہ ہو جاتا کہ وہیں کھڑے کھڑے اپنا تمام گھر بار لٹا دیتا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:

"شیخ علائی را نفس گیرائی مؤثر چنان بود کہ در وقت تفسیر قرآن از و ہر کسے کہ مے شنید، اکثرے خود دست از کاروبار دنیوی باز داشتہ آں صحبت اختیار می کردند، و ترک خانمان و عیال و اطفال نمودہ، و بر شدت فقر و فاقہ صبر کردہ، دیگر پیرامون کسب و کار خود نمی گشتند۔" (جلد اوّل صفحہ ۳۹۷)

قریب قریب اسی کے طبقات اکبری میں ہے:

"ہر روز در وقت نماز تفسیر قرآن مجید بنوعی می گفت کہ ہر کس کہ در مجلس او حاضر مے بود اصلاً بیکار خود نمی رفت، و ترک اہل و عیال کردہ داخل دائرۂ مہدویہ می گشت، یا از معاصی تائب شدہ مرید می گردید۔ و اگر گشت و زراعت یا تجارت می کرد، یک دہ صرف راہِ خدا می نمود" (صفحہ ۲۳۷)

ملا بدایونی ایک دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں کہ شیخ نیازی کی صحبت اختیار کرتے ہی فہم و تدبر قرآن کی ایک نئی راہ ان پر کھل گئی تھی۔

"معانی قرآن و نکات و حقائق آں بآسانی برو مکشوف گشت۔" اور یہ بالکل سچ ہے۔ اب تک قرآن جس قدر پڑھتے پڑھاتے رہے تھے، بیضاوی و بغوی کی ورق گردانی تھی، اور محض نقالی و ورق گردانی سے قرآن کی حقیقت کب کھل سکتی ہے؟ اس کے لئے تو جبریل عشق کے فیضان اور دل دردمند کے الہام کی ضرورت ہے۔ شیخ نیازی کی صحبت نے اسی بند دروازے کو کھول دیا:

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں!

مختصر یہ کہ جن پاک ہستیوں کی نسبت خدا نے فرمایا ہے :

ادلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین - یجاھدون فی سبیل اللہ و یخافون لومۃ لائم اور اشداء علی الکفار رحماء بینھم، تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود - یہ گروہ ان کے اخلاق و خصائل کی ہو بہو تصویر تھا!

تھوڑے ہی عرصے میں ہزاروں خاندان اس گروہ میں داخل ہو گئے۔ تمام گجرات و مالوہ و دکن میں ہر طرف اسی جماعت کا غلغلہ تھا، دینداری و پرہیزگاری کا جوش اس طرح پھیلا کہ شہروں میں نماز کے وقت سناٹا چھا جاتا اور مسجدوں کے سوا کہیں آدمی نظر نہ پڑتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بچپن میں شیخ علائی کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ حج کے ارادہ سے نکلے تو سات سو خاندان ساتھ تھے۔ میرے والد لباور گئے اور وہاں شیخ کی زیارت کی۔

ایک ایسے گروہ کو بھلا علماء دنیا اور فقہاء سوء کب چین سے بیٹھنے دے سکتے تھے؟ چوروں اور قاتلوں کو ان لوگوں سے امن مل سکتا ہے مگر مصلحین امت اور عشاق حق کے لئے امن و انصاف کہاں؟

خونی نہ کردہ ایم و کسی را نہ کشتہ ایم
جرمم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

۹۵۶ھ میں جب سلیم شاہ آگرہ میں مسند نشیں ہوا اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری کی شیخ الاسلامی کا دور دورہ ہوا تو ملا موصوف نے اس جماعت کے قتل و اذیت پر کمر باندھی۔ عوام کو یہ کہہ کر برانگیختہ کیا کہ یہ لوگ گمراہ اور بدعقیدہ ہیں اور سلیم شاہ کو یہ بات سوجھائی کہ جب سید محمد مہدی ہوئے تو تمہاری حکومت کہاں باقی رہی؟ روایتوں میں آیا ہے کہ مہدی موعود تمام دنیا پر حکومت کرے گا۔ یہ لوگ مہدی کے پیرو ہیں تو کم سے کم ہندوستان پر تو ضرور قبضہ کر لیں گے۔

"مخدوم الملک ایں معنی با قبح وجوہ خاطر نشان سلیم شاہ نمودہ کہ ایں مرد دعویٔ مہدویت می کند، و مہدی پادشاہ تمام روئے زمین خواہد شد و تمام لشکر تو بایں گرویدہ است و احتمال خلل در ملک است" (طبقات اکبری۔ صفحہ ۲۳۸)

حالانکہ شیخ علائی و نیازی خود مہدویہ نہ تھے۔ بلکہ سید محمد کو مہدی کہتے تھے اور اُن تمام روایات کی تاویل کرتے تھے جن میں مہدی کی پادشاہت وغیرہ کا ذکر ہے بنیاد ان کے عقیدہ کی یہ تھی کہ مہدی اور اس کی جماعت اپنے علم و عمل سے احیاء شریعت کرے گی۔ حکمرانی اس کے لئے ضروری نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تاویل صحیح نہ تھی اور روایات مشہورہ کے الفاظ و تصریحات اس کے بالکل مخالف ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس تاویل کے اعتقاد سے وہ جماعت خود ہی حکومت سے دستبردار ہو گئی تھی، پھر اس کی نسبت یہ الزام کیسا صریح اتہام تھا؟ لیکن چونکہ بغیر پولیٹیکل خطرہ کے سلیم شاہ برانگیختہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے مخدوم الملک وغیرہ نے اسی سنت قدیمہ علماء سوء کو اختیار کیا، اور سلیم شاہ کہ ایک سادہ لوح افغان تھا۔ فوراً آمادۂ مخالفت ہو گیا۔

منتخب التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم الملک نے شیخ کے واجب القتل ہونے کے مقدمات یوں ترتیب دیئے تھے:

"ایں مبتدع دعویٔ مہدیت می کند، و مہدی خود پادشاہ روئے زمین خواہد شد، و چوں سر خروج دارد واجب القتل ست" (جلد اوّل۔ صفحہ ۴۰۰)

فصل

صرف اسی ایک بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصلحین امت کو ہمیشہ کیسے کیسے علمار مکر وحیل اور قضات خون آشام سے سابقہ پڑا ہے ؟ اور حکومتِ وقت کو مخالف کرنے کے لئے کیسے کیسے بے پناہ حیلوں اور فریبوں سے ان کے خلاف کام لیا گیا ہے ؟ کسی خاص شخص کے مہدی ہونے نہ ہونے کے اعتقاد کو اسلام کے عقائد سے کیا علاقہ ؟ نہ یہ بنار فسق و تقویٰ ہے نہ معیار ایمان و کفر۔ اگر ایک شخص نے کسی داعی شریعت وامر بالمعروف و نہی عن المنکر کو مہدی مان لیا تو اس سے اس کے اسلامی عقائد میں کونسا فتور آگیا ؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ انطباق علائم و آثار میں اس نے اجتہادی غلطی کی۔ اصل شے جو مطلوب شارع ہے وہ تو صرف ایمان باللہ وبما جاء من عند اللہ ہے، اور دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ متقین میں سے ہے یا نہیں ؟ "متقین" کی تعریف قرآن نے اپنی پہلی سورت ہی میں بتلا دی : الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنٰھم ینفقون۔ والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلك وبالاخرۃ ھم یوقنون پس جو شخص ان چیزوں کا ایمان و عمل رکھتا ہے وہ اولائك علیٰ ھدی من ربھم و اولائك ھم المفلحون میں داخل ہے۔ خواہ کسی کو مہدی تسلیم کرے۔ خواہ دجال۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ البتہ یہ ضرور دیکھا جائے گا کہ جس شخص کو مہدی تسلیم کرتا ہے وہ متقی ہے یا مبتدع ؟ اگر اس کی بدعات و محدثات یا اعمال غیر صالحہ ثابت ہوں گے اور یہ بھی ان کا مصدق اور پیرو ہوگا، تو بلا شبہ اس پر وہ حکم دیا جائے گا جس کا وہ شرعاً

مستحق ہوگا۔ لیکن نہ بربنائے اعتقاد مہدویت بلکہ بسبب عقائد و اعمال منکرہ۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایک جزئی مسئلہ میں اس کو غلطی پر سمجھ سکتے ہیں، تخطیہ کر سکتے ہیں، لیکن نہ تو برا کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کے اسلام و ایمان میں شک کر سکتے ہیں

اگر اس کا عمل اچھا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت و اتباع اور ایثار فی اللہ وللہ میں تیز گام ہے، تو یقیناً کل کو اللہ کے حضور وہی سب سے اونچا ہوگا، اور ہم سب اس کے نیچے ہوں گے، اگرچہ ہم کتنے ہی کامل و اکمل اشعری و ماتریدی ہوں وہاں صرف غرور اشعریت و ماتریدیت کام نہ دے گا۔

وکل یدعی وصلا بلیلی

ولیلی لا تقر لھم بذاکا!

افسوس جزئیات مزعومہ عقائد کے غرور باطل نے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ عمل صالح کی اہمیت بالکل جاتی رہی اور سارا دار و مدار چند مزعومہ عقاید پر آکر رہ گیا۔ ایک شخص صرف اس غرور میں کہ میں الف سے لے کر یے تک ٹھیک عقاید نسفی کا مجسمہ ہوں، تمام مسلمانوں کو حقیر و گمراہ کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ عمل صالح اور ایثار و محبت فی اللہ کوئی شے نہیں۔ ایک شخص تقوے اور طہارت میں کتنا ہی اصلح ہو، لیکن اگر کسی ایک جزئی و ضمنی عقیدہ میں بھی مخالف ہوا تو اس کی ساری عمر کی کمائی رائیگاں گئی، اور باوجود عمر بھر کے ایمان و عمل صالح کے کافر کا کافر ہی رہا! جس کلمہ کے ایک بار اقرار کر لینے سے ابوسفیان اعدیٰ عدوئے اسلام اور وحشی قاتل حمزہ کا خون حرام ہو گیا تھا اور اگر ابوجہل بھی اقرار کر لیتا تو اس کی ساری عمر کا کفر و طغیان محو ہو جاتا، آج ساری عمر اس کے ایمان و عمل میں بسر کر دیجئے لیکن پھر بھی مومنوں کے گروہ میں شمار ہونے کا حق حاصل نہیں کر سکتے! افسوس تیرہ سو برس گذر گئے مگر کفر و ایمان کی گتھی آج تک نہ سلجھی:

جز سخن کفری و ایمانی کجاست ؟
خود سخن در کفر و ایمان میرود

اصل یہ ہے کہ اسلام نے باب عقائد میں صرف بنیاد کی چند صاف صاف اور موٹی موٹی باتیں تبلادی تھیں، اور اس کے بعد سارا دارومدار عمل صالح پر رکھا تھا۔ بنی الاسلام علی خمس۔ الخ۔ اور من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون ہر طرح کی فضیلت و مزیت کا معیار صرف تقوےٰ اور اس کے مراتب بعضہا علی بعض تھے اور بس کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ جو شخص شہادتین کا اقرار کرتا تھا، بمجرد اقرار مسلمانوں میں داخل ہو جاتا تھا، اور پھر مسلمانوں میں سے جو شخص اللہ اور اسکے رسول کی محبت میں سب سے زیادہ ایثار جان و مال کرتا تھا۔ وہی سب سے افضل و اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ صحابہ کرام کا پورا عہد گذر گیا، مگر کسی شخص کو ایک لمحہ کے لئے اس کا وہم بھی نہیں گذرا کہ اسلام و ایمان اور فضیلت و بزرگی کا معیار عمل صالح اور تقویٰ و طہارت کے سوا اور بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی روایتیں جو تم صحاح میں پڑھتے ہو "وکان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایرون شئیا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ" تو ان کا بھی یہی مطلب ہے کہ بنیاد ساری باتوں کی صرف عملی زندگی تھی۔ عقائد کے باب میں نہ تو کوئی اختلاف تھا اور نہ فتنۂ تفریق و تمذہب کی بنیاد پڑی تھی:

لیلی و مجنوں بہم می بودہ اند
پیش ازیں خوش روزگاری بودہ است

لیکن اس کے بعد فتن و فساد اور بدعات و محدثات کا آغاز ہوا، اور اوائل بنو امیہ ہی میں عجمی اقوام کے اختلاط اور عجمی علوم ذہنیۂ مہلکہ کے شیوع سے عقائد میں فتنہ کاوش و تعمق کی بنیاد پڑی جس کو اسلام نے نہایت سختی سے روک دیا تھا کہ ھلک المتعمقون اور نئے نئے سوال پیدا ہونے لگے۔ یہ حال دیکھ کر مجبوراً اہل حق و سنت کو اس طرف

متوجہ ہونا پڑا، اور باب عقائد میں سب سے پہلے رد و کد اور بحث و نظر کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں تک جو کچھ ہوا بالکل ٹھیک تھا اور ناگزیر، لیکن آگے چل کر یہ چیز حد اعتدال سے متجاوز ہو گئی۔ عقائد کے رد و کد کا نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز لوگوں کی توجہ اسی کے طرف بڑھنے لگی اور رفتہ رفتہ عمل کی طرف سے طبیعتیں بے پروا ہو گئیں۔ حتیٰ کہ آج یہ حال ہے کہ اسلام و ایمان کا سارا دار و مدار محض چند جزئیات اختلافیہ عقائد کی محافظت پر آکر ٹھہر گیا ہے اور صرف انہی کے غرور و پندار میں ہر شخص مست رہتا ہے۔ عمل کی درستگی اور تقویٰ و طہارت کی اہمیت و تقدیم یک قلم فراموش کر دی گئی ہے اور قریب ہے کہ اسلام کے ارکان و شرائط سے عمل صالح کا رکن اس طرح معدوم ہو جائے گویا وہ کوئی ضروری چیز تھا ہی نہیں۔ ساری جستجو اور کاوش صرف اس کی ہوتی ہے کہ فلاں شخص کے عقاید کیسے ہیں؟ یعنی چند مزعومہ جزئیات غیر متعلقہ میں اس کے عقیدہ کا کیا حال ہے؟ اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ اس کا عمل کیسا ہے؟ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں انفاق جان و مال کا کیا حال ہے؟ تقویٰ و طہارت نفس کے لحاظ سے کیسی زندگی بسر کرتا ہے؟ بندوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے اور خدا کے خوف سے دل خالی رکھتا ہے یا بھرپور؟ معاملات میں کیا حال ہے؟ لین دین میں سچائی اور دیانت ہے یا نہیں؟ ایک شفیق باپ، رفیق بھائی، وفادار شوہر، اور رحیم و غمگسار ہمسایہ ہے، یا ایک بے رحم وجود، بے حس پتھر، اور موذی و مہلک مخلوق؟ ان ساری باتوں میں (جن کے الگ کر دینے کے بعد اسلام میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی) اس کا حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر چند اختلافی جزئیات میں ہمارا ہم آہنگ ہے تو پھر ہمارے نزدیک اس سے افضل ہستی روئے زمین پر کوئی نہیں! یہی گمراہی یہود کی تھی کہ صرف اسرائیلیت کے غرور میں بدمست رہتے تھے۔ وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات یہ غرور عقائد کا فتنہ بہت ہی بڑا فتنہ ہے اور آج مسلمانوں کی ریڑھ کی ہڈی اسی سے گھلی جا رہی ہے۔ ولکن اکثر الناس لایعلمون

فصل

بعد کے واقعات بہت طولانی ہیں مختصر یہ کہ مخدوم الملک نے سلیم شاہ سے فرمان جاری کرا کے شیخ علائی کو آگرہ میں طلب کرایا اور اکثر مشاہیر علما عہد مثلاً سید رفیع الدین محدث اور شیخ ابوالفتح تھانیسری بھی بحث و مباحثہ کے لئے طلب کئے گئے۔ شیخ علائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دربار میں پہنچے تو پھٹے پُرانے کپڑوں اور فقیرانہ و نامردانہ وضع و صورت میں درویشوں کی ایک شکستہ حال جماعت تھی۔ لیکن کبر و علو حق کا یہ حال تھا کہ صرف سلام مسنون کر کے ایک گوشے میں مبٹھ گئے اور تمام دربار پر اس حقارت و بے پروائی سے نظر ڈالی گویا مغرور انسانوں کی جگہ پتھروں کا ڈھیر ہے! یہ خود داری سلیم شاہ پر بہت گراں گذری۔ بحث شروع ہوئی تو سب سے پہلے شیخ علائی نے قرآن حکیم کی چند آیات تلاوت کیں اور اُن کی تفسیر کا وعظ شروع کر دیا کہ،

جز نغمۂ محبت سازم نوا نہ دارد!

بدایونی لکھتے ہیں کہ وعظ کا مضمون زیادہ تر مذمت دنیا و حالات آخرہ و اہانت علمأ دنیا اور فرائض امرا، و سلاطین پر مشتمل تھا، اور کچھ ایسا پُر تاثیر و درد انگیز طرز بیان تھا کہ ادھر شیخ کی زبان سے الفاظ نکل رہے تھے۔ ادھر تمام مجمع کی سنگدلی موم کی طرح پگھل رہی تھی! خود سلیم شاہ اور اُس کے امرا کا یہ حال ہوا کہ باوجود کمال قسی القلبی و حق فراموشی کے ضبط نہ کر سکے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے:

سرشک گرم کی حدت کو پوچھ
مرے دامن سے اپنی آستیں سے

یہ حال دیکھ کر سلیم شاہ کا خیال پلٹ گیا اور بے اختیار ہو کر شیخ کی نہایت تعظیم و تکریم

بجالایا۔ پوچھا کہ باوجود ان کمالات و فضائل کے کیا سبب ہے کہ لوگ تمہارے مخالف ہیں؟
بھلا شیخ علائی اس کا کیا جواب دیتے؟

دل راکہ تو مقید زندان حسرت ست
برعرض عشق ہیچ گناہی دگر بنو!

حکم دیا کہ شیخ کیلئے طعام خاصہ سے کھانا بھیجا جائے لیکن شیخ نے نہیں کھایا، اور کہا۔ "طعام تو حق مسلمانان است کہ بخلاف شرع زیادہ از حق خود متصرف شدہ"۔ دوسرے دن مباحثہ ہوا۔ تمام علمار دربار ایک طرف، اور یہ درویش بے نوا ایک طرف تھا، لیکن جو شخص زبان کھولتا تھا چند منٹوں میں ذلیل و رسوا ہو کر لاجواب ہو جاتا تھا۔ مخدوم الملک کو تو بات تک کرنے نہ دی۔ بار بار اُس کو مخاطب کر کے کہتا "تو از علمار دنیائے، و دزد دینی، و مرتکب چندیں نامشروعاتی، بشابۂ کہ از دائرۂ عدالت خارج افتادہ۔ ہنوز آواز سرود و ساز از خانۂ تو علانیہ می شنوند"۔ (منتخب التواریخ ،جلد اول۔ صفحہ ۴۰۱)

مباحثہ کا رنگ دیکھ کر سلیم شاہ کو یقین ہو گیا کہ تمام علمار بلا وجہ ایک درویش حق پرست کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ تاہم مجبور تھا۔ رعایا انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور معاملہ مذہبی تھا جس میں خود دخل دے نہیں سکتا تھا۔

ہر روز شیخ علائی کا معاملہ پیش ہوتا اور یہ ٹال جاتا۔ بدایونی لکھتے ہیں" مخدوم الملک ساعت لساعت سلیم شاہ را تحریص بر قتل او می نمود"۔ ساتھ ہی روز خبریں اڑنے لگیں کہ آج فلاں سردار شیخ کا مرید ہوا اور کل فلاں امیر نے ان کا وعظ سن کر گھر بار لٹا دیا۔ آخر الامر سلیم شاہ نے صرف حکم جلا وطنی پر کفایت کی اور شیخ کو دکن چلے جانے کا حکم دیا۔ شیخ نے ان ارض اللہ واسعۃ پڑھا اور دکن کی راہ لی۔ لیکن صرف اتنی ہی سزا سے علماء دنیا کی خون آشام پیاس کب بجھنے والی تھی؟ چند دنوں کے بعد موقعہ پاکر پھر سلیم شاہ کو ابھارا اور طرح طرح کے اشتعال انگیز قصے سنا کر شیخ علائی کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا۔ بڑا جرم شیخ علائی کا یہ تھا کہ جہاں جاتا ہے، ایک دنیا اُس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ دکن کی طرف جلا وطن کر کے بھیجا

تو وہاں بھی بہار خاں حاکم ہنڈیہ اور اطراف دکن کے ہزارہا آدمی معتقد و مرید ہو گئے۔ شیخ پر موقوف نہیں۔ ہمیشہ داعیان حق کا سب سے بڑا جرم شاہانِ ظلم و جور، اور علمار دجل و فساد کی نظروں میں یہی رہا ہے کہ دنیا ان کی طرف کیوں کھنچتی ہے؟ مگر افسوس کہ اس جرم سے وہ کسی طرح اپنے تئیں بری نہیں دکھلا سکتے۔ جس طرح بینائی رکھنے والا دیکھنے پر مجبور ہے کہ خود اپنی آنکھیں پھوڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح علمار حق اعلان و تذکیر حق میں ناچار ہیں کہ خدا کی دی ہوئی زبان کو کاٹ کر پھینک نہیں دے سکتے، اور بیانِ حق کا قدرتی خاصہ یہ ہے کہ دلوں میں گھر کرے اور ہر طرف سے انسانوں کو اپنی جانب کھینچ لے۔ ایک داعی حق اور واصل باللہ اگر دنیا سے کہہ بھی دے کہ میرے پیچھے نہ آؤ، جب بھی وہ اسی کے پیچھے دوڑے گی۔ کہ جذب و انجذاب کا قانون الٰہی باطل نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر لوہا مقناطیس کی جانب کھنچتا ہے تو اس میں مقناطیس کا کیا قصور؟ یہ جرم ہے تو خدا نہ کرے کہ اِس پاک جرم کے مجرموں سے کبھی اس کی زمین خالی ہو۔ یسقی بہم الغیث وینتصر بہم علی الاعداء! (۱)

خدا گواہ کہ گر جرم ماہمیں عشق ست
گناہ گبر و مسلماں بہ جرم ما بخشند!

نظامِ شمسی کی طرح نظامِ انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں۔ مگر تم کو ان کا حال نہیں معلوم۔ تم کو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم الانسانیۃ کے نظام و مراکز کے کشف کیلئے کتنا زمانہ درکار ہوگا؟ تاہم یہ معلوم رہے کہ ہر عہد و دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکزِ شمسی کی طرح تمام اِنسانوں کا مرکزِ محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے، اور جس طرح نظامِ شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اِسی لئے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے، اِسی طرح

---

(۱) رواہ احمد وذکرہ فی المشکوٰۃ۔ وایضاً ماخوذ من قولہ صلعم، ھل تنصرون وترزقون الا بضعفاء کم۔ رواہ بخاری

انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اسی لئے ہوتے ہیں کہ اس مرکزِ انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں۔ زمین والوں ہی پر موقوف نہیں۔ آسمانوں میں بھی صرف انہی کے ناموں کی پکار ہوتی ہے۔ بخاری کی اس حدیث کو نہیں معلوم تم نے کیا سمجھا حالانکہ وہ تو صرف اسی حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے کہ: " اذا احب اللہ العبد قال لجبریل انی احب فلانا فاحبہ فیحبہ جبریل ثم ینادی جبریل فی اھل السماء ان اللہ قد احب فلانا فاحبوہ فیحبہ اھل السماء، ثم یضع لہ القبول فی الارض " یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل سے فرماتا ہے کہ میں فلاں بندے کو دوست رکھتا ہوں تم بھی اس کو دوست رکھو۔ پس جبریل بھی اُس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر جبریل آسمان والوں میں اُس کی منادی کر دیتا ہے، پس تمام آسمان والے بھی اُس کو چاہنے لگتے ہیں۔ اور اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ پھر جب آسمان پر اُس کی محبوبیت کا اعلان ہو جاتا ہے تو زمین والوں کے دل بھی اُس کی محبت کے لئے کھل جاتے ہیں اور ہر طرف مقبولیت و محبوبیت اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ وللہ در ماقال۔

کار زلف تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند!

بالآخر شیخ علائی کو دوبارہ آگرہ طلب کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلیم شاہ نے علماء دار الحکومت خصوصاً مخدوم الملک کی خود غرضیوں اور حسد و عناد کو اس بارے میں محسوس کر لیا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ ان لوگوں کی رائے بے لاگ نہیں ہے۔ اسی لئے اِس مرتبہ شیخ کو شیخ بڈھا بہاری کے پاس بھجوا دیا کہ مشاہیر علماء وقت سے تھے، اور لکھا کہ جو فیصلہ آپ کا ہو اسی پر عمل کیا جائے۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ شیخ بڈھا نے پہلے تو ایک حق پرستانہ تحریر لکھی جس کا مضمون یہ تھا کہ مسئلہ مہدویت موقوف علیہ ایمان و اسلام نہیں ہے تعیین علامات مہدی میں مختلف روایتیں وارد اور سخت اختلاف واقع۔ صرف اتنی سی بات پر ایک عالم حق کی تعزیر و تکفیر جائز نہیں لیکن افسوس کہ بعد کو دنیا پرستی مانع آئی انکے

لڑکوں نے سمجھایا کہ آج کل مخدوم الملک کی شیخ الاسلامی ہے۔ اس کے خلاف رائے دینا ٹھیک نہیں۔ اگر اس نے سلیم شاہ سے کہہ کر تم کو اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے آگرہ طلب کرایا تو اس بڑھاپے میں بیکار سفر کی زحمت اٹھاؤ گے۔ یہ بات شیخ بڈھا کے دل پر اثر کر گئی اور پہلی تحریر چاک کر کے دوسرا مراسلہ اس مضمون کا بھیجدیا "مخدوم الملک امروز از علمار محققین ست۔ سخن سخن او، وفتویٰ فتوی اوست"

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پرسش دادخواہاں نہیں!

جو لوگ گزر چکے ہیں ان کی نسبت اب کیا کہا جائے کہ ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ ہے علمہا عند ربی فی کتاب اور ہم کو بہر حال اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان کی دعا مانگنی ہے مگر غور کرو کہ ہر زمانے میں علمار دنیا کی نفس پرستی اور حق فراموشی کس طرح دنیا کیلئے ایک لعنت رہی ہے اور حیات چند روزۂ دنیوی کے عشق و تعبد نے اس طائفہ عبید الدنیا سے کس کس طرح کتمان حق کرایا ہے؟ شیخ بڈھا اپنے نفس کے لئے اسکو بڑی ہی اذیت سمجھتے ہیں کہ آگرہ تک سفر کی زحمت گوارا کریں، لیکن اگر حق مستور و مظلوم ہو جائے اور اہل حق ہلاک و مقتول ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتے! کیا نوع انسانی کی کوئی بد تر سے بد تر اور گمراہ سے گمراہ قسم بھی اس سے زیادہ دنیا کو نقصان پہنچا سکتی ہے؟ اور کیا جنگل کا کوئی ڈاکو اور کمین گاہوں کا کوئی رہزن اس سے زیادہ جمعیت بشری کے لئے مخدوش و مہلک ہو سکتا ہے؟ اگر علمار کے خصائل کا یہ حال ہے تو اس کے بعد عامۂ ناس کے لئے فسق و عدوان کا کونسا درجہ باقی رہ گیا؟ یہی وہ کتمان حق یعنی حق کو دانستہ چھپانے کی لعنت ہے جو علمار یہود پر چھا گئی تھی اور منجملہ اسباب مغضوبیت یہود ہوئی۔ وان کثیرا منہم لیکتمون الحق وہم یعلمون اور افسوس کہ یہی حال شبرا و بشبر اور ذراع بذراع اس امت کے علمار سور کا بھی ہوا۔ وہم یہود ہذہ الامت۔ ان کو بہر حال اپنی گنبد دستار کی تعمیر کے لئے اینٹیں چاہئیں اگرچہ خانہ شرع کی دیواریں توڑ کر بہم پہنچائی جائیں۔

خانۂ شرع خرابست کہ ارباب صلاح
درعمارت گری گنبد و دستار خود اند!

یہ افسانہ تو اس عہد کا ہے جس کو موجودہ عہد کے مقابلے میں عہد اقبال سمجھنا چاہئے۔ آج جو حالت ہو رہی ہے، اُس کو دیکھئے تو ہوش گم اور عقل درماندہ رہ جاتی۔ آج امت کا ایک فاسق سے فاسق گروہ بھی شاید کبھی سچائی کی خاطر کچھ نقصان جان و مال اٹھالے اور اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے، لیکن مدعیان علم و مشیخت اور زہد فروشاں سجادۂ طریقت سے اتنی بھی امید نہیں! علمار وقت نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کو عملاً شریعت کے احکام و واجبات سے خارج کر دیا ہے، اور رہا تو اب یہ لفظ قرآن کی سورتوں میں کبھی نظر آ جاتا ہے، یا صحائف سنت کے ابواب د اوراق میں۔ حق کی بےکسی و مظلومی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جنگل میں بھیڑوں اور بکریوں کے لئے چرواہا نظر آجاتا ہے، لیکن حق کے لئے کوئی غمگسار و مددگار نہیں۔

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس، ولم یسمر بمکۃ سامر!

شاید تم کو اس جملہ پر تعجب ہو کہ علمار وقت نے امر بالمعروف کے فرض کو فرائض شریعت سے خارج کر دیا ہے، لیکن جو حالت ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے تو یہ جملہ بھی کافی نہ تھا اگر ایک شخص اپنا عقیدہ یہ ظاہر کرے کہ نماز فرض ہے اور ہر وقت شرح وقایہ کی کتاب الصلوٰۃ اپنی بغل میں بھی رکھے، لیکن عملاً نماز کبھی نہ پڑھے اور ترک صلوٰۃ کیلئے طرح طرح کے ایسے حیلے اور عذرات پیش کر دیا کرے جو کبھی اور کسی حال میں دو نہیں ہو سکتے، تو تم اس کی نسبت کیا کہو گے؟ اس کے لئے نماز ایک حکم شرعی واجب العمل رہا یا نہیں؟ یہی حال آج علمأ عہد کا بھی ہو رہا ہے۔ اور امر بالمعروف اور قیام حق کے حکم سے اپنے آپ کو بری کرنے کے لئے بالقار شیطانی طرح طرح کے حیل و مکائد بنا رکھے ہیں، اور جب وقت آتا ہے تو انہی کی آڑمیں پناہ لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عملاً امر بالمعروف کا حکم ساقط و کالعدم ہو گیا۔ کبھی کہتے

ہیں کہ درجۂ عزیمت دعزائم امور بہت بلند ہے ہمیں کہاں نصیب ؟ رخصت یہ ہے کہ بخوف نقصان جان و مال باطل پرستی قبول کرلی جائے۔ علی خوف من فرعون وملائهم ان یفتنهم! کبھی کہتے ہیں کہ صداقت موسوی سے انکار نہیں لیکن ہیبت وسطوت فرعونی کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے، پس خاموشی وترک سعی کے سوا چارہ نہیں، فاذهب انت وربک فقاتلا انا ههنا قاعدون۔ کبھی کہتے ہیں کہ اگرچہ حق اسی کے خلاف ہے اگر مصلحت وقت کا مقتضی یہی ہے۔ گویا مصلحت حقائق اشیاء کو متغیر کرسکتی ہے! کبھی کہتے ہیں کہ زبان کھولنے میں فتنہ ہے اور فقہاء کا ایک جزیہ ہم کو مل گیا ہے کہ فتنہ سے بچنا ضروری۔ گویا حق گوئی میں فتنہ ہے اور سکوت عن الحق میں امن وسلامتی: ولو اتبع الحق اهوائهم لفسدت السماوات والارض۔ کبھی کہتے ہیں۔ کہ علیکم انفسکم اور ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکہ پر ہمارا عمل ہے: یحرفون الکلم عن مواضعہ۔ کبھی کہتے ہیں کہ فلاں فلاں باتیں یقیناً بدعات ومنکرات میں داخل ہیں لیکن عوام صدیوں سے کر رہے ہیں۔ اگر صاف صاف حق گوئی سے کام لیں گے تو بگڑ جائیں گے اور ہم کو بزرگ وپیشوا نہیں سمجھینگے اگر ایسا ہوا تو موجودہ حالت سے بھی زیادہ نقصان ہوگا، وان کثیرا من الاحبار والرهبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ولیصدون عن سبیل اللہ۔ کبھی کہتے ہیں کہ اس میں خوف جان ہے۔ اور جان کا بچانا فرض ہے۔ غرضکہ یعدهم ویمنیهم وما یعدهم الشیطان الا غرورا۔ یہ سب کچھ کہتے ہیں مگر اصلی بات نہیں کہتے کہ ایمان باللہ مفقود ہوگیا، حیات دنیوی کی محبت محبت الٰہی پر غالب آگئی، متاع دنیا کی دلفریبیوں پر روح مفتون اور دل نثار ہوگیا اور دنیا پرستی کی لعنت نے عزم وراستی کی روح کو مردہ کردیا! استحوذ علیهم الشیطان فانساهم ذکر اللہ۔ اولائک حزب الشیطان۔ الا ان حزب الشیطان هم الخاسرون!

فصل

یہ واضح رہے کہ شیخ بڈھا اُس زمانے کے اکابر علماء میں تسلیم کیے جاتے تھے۔
بدایونی لکھتے ہیں کہ شیر شاہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ اور ارشاد قاضی پر ایک عمدہ
شرح بھی آپ نے لکھی تھی۔ بایں ہمہ حال یہ تھا کہ جب شیخ علائی شاہی حراست میں ان کے
مکان پر پہنچے تو "از اندرون خانہ آواز سرود و ساز شنیدند و بعضے مکارہ طبعی و شرعی
دیگر نیز کہ ذکر آن اسبجا نے صریح دارد، در مجلس او دیدند و بے اختیار امر معروف و نہی
منکر کردند" کاش شیخ بڈھا علم نہ پڑھتے، ارشاد قاضی کی شرح نہ لکھتے، جنگل میں لکڑیاں
کاٹتے اور سر پر اٹھا کر بازاروں میں بیچتے، مگر حق گوئی سے زبان نہ روکتے تو ہزار درجہ
اس مولویت و مشیخت اور شرح نویسی کی زندگی سے زیادہ اللہ کے نزدیک مقرب و محبوب ہوتے
ارشاد قاضی کی شرح قیامت کے دن ان کو نہیں بخشوا سکتی، مگر حق گوئی کا ایک سچا
لمحہ عمر بھر کے گناہوں کو محو کر دے سکتا ہے!

عشق تو قائم "نہ ہوا آپ سے
اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے!

سلیم شاہ کے دل پر شیخ علائی کی حق پرستی کا زخم لگ چکا تھا۔ مگر خود عالم نہ تھا، چاہتا
تھا کہ اگر ایک عالم حق گو کا سہارا بھی مل جائے تو شیخ کو علماء سوء کے پنجوں سے چھڑا لے
لیکن افسوس کہ سب نفس و دنیا کے پجاری نکلے۔ جب شیخ بڈھا نے بھی مخدوم الملک
کی تائید کی تو بالکل مجبور رہو گیا اور شیخ کا معاملہ مخدوم الملک کے حوالے کر دیا۔ شیخ
علائی اس وقت سخت بیمار تھے گلے میں ایک بہت بڑا زخم تھا۔ اور بہار تک سفر کرنے
کی زحمت نے نیم جان کر دیا تھا۔ مخدوم الملک نے حکم دیا کہ کوڑے لگائے جائیں جلاد

نے تیسری ہی ضرب لگائی تھی کہ اس شہیدِ حق کی رُوح پرواز کر گئی: فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر! ملا عبدالقادر بدایونی نے "ذاکر اللہ" اور "مقام ھم ربھم شراباً" سے تاریخ نکالی کہ ۹۵۷ سال ہجری ہے۔

بجرم عشق اگر کشتی مرا ممنون احسانم
گناہ زاہد بے درد یارب چیست حیرانم!

افسوس مرنے کے بعد بھی ظالموں کو تسکین نہ ہوئی۔ اور اس فنا فی الحق کی نعش کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو بدر و احد کے مقتول کفار کے ساتھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں، کہ ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر نعش کو چروایا گیا اور اس کے ٹکڑوں کی تمام لشکر میں تشہیر کی۔ پھر حکم دیا کہ دفن نہ کی جائے اور اس غرض سے پہرہ بٹھا دیا گیا۔ سبحان اللہ کار و بار عالم کی بوالعجبی، اور جہان ہزار رنگ کی بوقلمونی! یہ ہے خدمت انسانی کا وہ مزد و صلہ جو دنیا نے ہمیشہ اپنے غمگساروں کو دیا ہے۔ اور یہ ہے عشق حق و شیفتگی صدق کا نتیجہ جو اس ظلم آباد ارضی میں ہمیشہ نیاز مندان حق کو ملا ہے؛ باطنہ فیہ الرحمۃ وظاہرہ من قبلہ العذاب

فمن شاء فلینظر الی، فمنظری
نذیر الی من ظن ان الھوی سھل!

یہ سرگذشت تو شیخ علائی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ انکے پیر حضرت شیخ عبداللہ نیازی کا واقعہ بھی اس سے کم درد انگیز اور عبرت ماجرا نہیں ہے۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ جب شیخ علائی دکن کی جانب جلاوطن کر دیئے گئے تو اس کے کچھ عرصے بعد سلیم شاہ سرحدی افغانوں کی شورش کا حال سن کر پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ جب بیانہ کے قریب شاہی لشکر پہنچا تو مخدوم الملک نے کہ پیوستہ درکمر لبستہ خاصان حق کی اذیت و ہلاکت کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے، موقع کو غنیمت سمجھا اور سلیم شاہ سے کہا: "از فتنہ صغیر کہ عبارت از شیخ علائی باشد چندے خلاصی یافتیم، اما فتنۂ عظیم ہنوز برپاست۔" سلیم شاہ نے پوچھا وہ کون؟ کہا: شیخ عبداللہ نیازی کہ یہیں بیانہ میں مقیم ہے اور شیخ علائی کا پیر ہے۔ سلیم شاہ نے میاں بھوہ وہانی حاکم بیانہ کو حکم بھیجا کہ فوراً شیخ کو حاضر لشکر کرو۔ میاں بھوہ

شیخ کا مرید تھا۔ اس نے شیخ کو بہت سمجھایا کہ آپ یہاں سے راتوں رات نکل جائیں میں کوئی بہانہ کر دونگا لیکن شیخ نے کہا "ارادۂ خداوندی در حال استقبال و آں جا و ایں جا مساوی است۔ تا ہر چہ تقدیرست خواہد رسید" مجبوراً شیخ کو ہمراہ لیا اور لشکر شاہی میں پہنچے سلیم شاہ سوار کوچ کیلئے طیار کھڑا تھا۔ شیخ عبد اللہ حسب سامنے پہنچے تو بے باکانہ گردن اٹھائے جا کھڑے ہوئے اور السلام علیک کہا۔ میاں بہوہ نے کہ کسی نہ کسی طرح سلیم شاہ کے غیظ و غضب سے ان کو بچانا چاہتا تھا۔ گردن بکڑ کے جھکا دی اور کہا۔ بادشاہوں کو یوں نہیں، یوں سلام کرتے ہیں۔ اس پر شیخ نے گرج کر کہا "جو سلام کہ سنت ہے اور صحابہ اللہ کے رسول کے سامنے کہا کرتے تھے' یہی ہے' اسکے سوا میں اور کوئی سلام نہیں جانتا!" سلیم شاہ نے غضب ناک ہو کر اشارہ کیا اور لشکریوں نے لاٹھیوں، کوڑوں، مکوں، اور لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہوگئے جب تک ہوش رہا یہ آیۂ قرآنی ورد زبان تھی، ربنا اغفر لنا ذنوبنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین! سلیم شاہ نے جب شیخ کو یہ پڑھتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔ کیا کہتا ہے؟ مخدوم الملک نے کہا "شمارا و مارا کافر می گوید" اس پر اس کو اور زیادہ طیش آیا اور جب تک موت کا یقین نہیں ہوگیا۔ برابر زدو کوب کا حکم دیتا رہا! افسوس! عشاق حق کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوا اور اعداحق و اصلاح کے ہاتھوں کبھی انکو امن کی گھڑیاں نصیب نہ ہوئیں۔ یہی ہوتا رہا ہے اور شاید ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ دشمنان حق نے اگر ان کی جانوں کو سب سے بڑی چیز سمجھ کر لینا چاہا، تو انہوں نے بھی اپنی جان کو دنیا کی ساری چیزوں میں سب سے زیادہ ہیچ و ادنے سمجھا۔ ولنا فیہم اسوۂ حسنہ۔

جانیست ہر آئینہ بخواہد رفتن
اندر غم عشق تو رود، اولیٰ ترا!

لیکن سبحان اللہ! مکافات، دمجازات عمل کا قانون الہی کس طرح اس دنیا ہی میں اپنا کام انجام دے رہا ہے اور آخرت کی منزل ابھی باقی ہے: لو کانوا یعلمون بالآخر ایک زمانہ آیا کہ یہی مخدوم الملک تھے اور یہی ہندوستان، مگر پیشوائی و

و شیخ الاسلامی ایک طرف رہی، عزت و آبرو سے اپنا بڑھاپا بھی بسر نہ کر سکے، اور عہدِ اکبری کے نئے نئے مفتیوں کے ہاتھوں وہ وہ ذلتیں اور خواریاں نصیب ہوئیں کہ بقول ملا بدایونی: یوم تبلی السرائر کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ یا تو یہ حال تھا کہ ان کے قلم شیخ الاسلامی کی ایک گردش اہل اللہ کی زندگیوں کا فیصلہ کر دیتی تھی، یا یہ یوم العذاب دیکھنا پڑا کہ حاجی ابراہیم سرہندی اور شیخ ابوالفضل جیسے نوخیز و احداث بھری مجلس میں ان کے فسق و تقویٰ کا فیصلہ کرنے لگے اور عمر بھر کی بداعمالیوں کا ایک ایک کر کے حساب دینا پڑا۔ فنعوذ باللہ من الحور بعد الکور:

گرہ کیسی لگی تھی؟ کھل گئے کس راہ میں فتنے؟
نظر آتا ہے خالی آج گوشہ تیرے داماں کا!

فصل

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ مخدوم الملک کی دولت و تمول کا یہ حال تھا کہ صرف گھر کے صندوقوں ہی میں نہیں بلکہ خاندانی قبروں میں بھی چاندی سونے کی اینٹیں ہی مدفون تھیں۔ الذین یکنزون الذھب والفضۃ اور یہ تمام مال زمانۂ شیخ الاسلامی کے غصب و تصرف و اکل اموال بالباطل کا اندوختہ تھا۔ طرح طرح کے نام نہاد شرعی حیلے بنا رکھے تھے اور ان کی آڑ میں بندگان الٰہی کو لوٹتے کھسوٹتے تھے جب عہدِ اکبری کا نیا دور شروع ہوا اور ان کی ہوا اُکھڑی، تو عجیب عجیب باتیں کھلیں ازاں جملہ یہ کہ باایں ہمہ دولت و تمول عمر بھر کبھی زکوٰۃ ادا نہ کی۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لئے یہ حیلہ گھڑ لیا تھا کہ ہر سال کے آخر میں اپنا تمام خزانہ بیوی کے نام ہبہ کر دیتے، اور وہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے ان کے نام بخش دیتی۔ اس طرح حول کامل دونوں میں سے

کسی پر نہ گذرتا کہ ادائے زکوٰۃ کی شرط ہے"۔ وغیر ازیں نیز حیلہ ہائے دیگر کہ حیل بنو اسرائیل پیش آں شرمندہ است۔ وہمچنیں خست و رذالت، وخباثت وجہالت، ومکاری وستمگاری او کہ بہ مشائخ وفقراء، دیار خصوصاً بہ آئمہ مساجد واہل استحقاق پنجاب نمودہ بود یک یک بظہور پیوست، وسرِ یوم تبلی السرائر بر ضمائر ظاہر گشت، وحکایاتی کہ مشتمل بر انواع اہانت واستخفاف ومذمت او بود، ہر روز در مجلس تقریر می کردند، وقرار چناں یافت کہ جبراً وقہراً او را بمکہ باید فرستاد۔ وچوں از و پرسیدند کہ حج بر تو فرض شدہ ؟ گفت کہ نے!" (جلد دوم: ۲۰۳)

یہ جو ملا صاحب نے لکھا ہے کہ مخدوم الملک نے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے ایک حیلہ نکال رکھا تھا، تو اس حیلہ پر انکا عمل ضرور رہو گا۔ لیکن اس کی ایجاد کی نسبت ان کی جانب صحیح نہیں۔ ان لوگوں کو مکر وحیل میں بھی اجتہاد وفکر کہاں نصیب ؟ اس میدان میں بھی دوسروں کے مقلد ہی ہوتے ہیں۔ مخدوم الملک نے اور بہت سی چیزوں کی طرح یہ حیلہ بھی اپنے پیشرو فقہاء دنیا اور علماء مکر وخدیعۃ سے حاصل کیا ہو گا۔ اگرچہ ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ احبار یہود اور اصحاب السبت کے بعد امت اسلامیہ میں سب سے پہلے کن "یہود ہذہ الامۃ" نے ان حیلوں کی بنیاد ڈالی اور شریعت الٰہی کو نفس وشیطان کا بازیچہ لہو ولعب بنایا مگر یہ معلوم ہے کہ دوسری صدی کے اوائل میں بعض فقہاء دنیا وعبید السلاطین اور متفقہین بالظن والرائے نے حیلہ تراشیاں شروع کر دی تھیں۔ اور تیسری صدی میں اس امت کے صدوقیوں اور فریسیوں نے کتاب الحیل کو بھی منجملہ ابواب فقہ کے قرار دیدیا تھا۔ اس کا پتہ ان اقوال سے چلتا ہے جو نام نہاد حیل واحتیال شرعیہ کی نسبت ائمہ اسلام کے منقول ہیں اور جنکو شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے بعض فتاویٰ میں جمع کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے ایک حیلہ کا حال سن کر کہا۔ احدثوا الحیل فی الاسلام فمن کان امر بھذا فھو کافر اسلام میں لوگوں نے حیلے پیدا کرنے کی بدعت رائج کی ہے۔ سو جو شخص ان پر فتوے دے وہ کافر ہے۔ شریک بن عبداللہ قاضی کوفہ سے کتاب الحیل کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا

من یخادع اللہ یخدعہ۔ یعنی حیلے نکال کر احکام شرعیہ کی تعمیل سے بچنا خدا کو دھوکا دینا ہے۔ حفص بن غیاث نے کہا، کتاب الحیل پر لکھ دو کہ کتاب الفجور ہے۔ یزید بن ہارون نے کہا، لقد افتی اصحاب الحیل بشئی لو افتی بہ الیھود کان قبیحاً حیلہ تراشوں نے یہودیوں کو بھی مات کر دیا۔ ایوب سختیانی نے کہا: یخادعون اللہ کانما یخادعون الصبیان۔ یہ لوگ خدا کو اس طرح دھوکا دینا چاہتے ہیں جیسے بچوں کو فریب دے کر بہلاتے ہیں۔ خدا نے حکم دیا کہ ہر مالدار زکوٰۃ دے تو سال کے آخر میں تمام مال بیوی کے نام ہبہ کر دیا کہ خدا دھوکے میں آکر ہم کو مفلس و نادار سمجھے گا۔ وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون: انہی سے یہ بھی منقول ہے۔ لو اتی الامر عیاناً کان اھون علی۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ صاف صاف بغیر حیلہ کے معصیت کرتے۔ بہرحال خدا کی شریعت کے ساتھ تلعب و استہزا تو نہ ہوتا۔ اور یہ بالکل حق ہے۔ فسق و فجور ان حیلوں پر عمل کرنے سے ہزار درجہ افضل ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل سے بھی طلاق و یمین کے بارے میں چند حیلوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ فرمایا کہ، ان من افتی بھذہ الحیل فقد قلب الاسلام ظھراً لبطن ونقض عری الاسلام عروۃً عروۃ!

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں حیلہ تراشیوں کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یہ کتاب و سنت سے بعد و ہجر، اور ترک براہین و یقینیات شرعیہ، و تشبث بہ ظن و تخمین بحث، و تخرص و تلعب بہ ظلمات اوہام و اہوا، و قیاس غیر صالح و غیر موید بالوحی کے شجرۃ الزقوم کے ابتدائی برگ و بار تھے، جو آگے چل کر اس قدر پھلے پھولے کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ ان کے ثمرات ردیہ و خبیثہ سے خالی نہ رہا اور وہ شریعت الٰہیہ جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "السمحۃ الحنیفیہ والمحجۃ البیضاء لیلا کنھارھا" طرح طرح کے ظنون فاسدہ، و آراء متشتتہ و قیاسات متخالفہ، و سبل متفرقہ، و طرائق قدداً، و قواعد متناقضہ، و تاویل الجاہلین، و انتحال المبطلین و حیل المتحیلین، و اقیسۃ القیاسیین، و ظلمات بعضھا فوق بعض کا مجموعہ بنا دی گئی۔

واللہ اکبر کبیراً ان تکون فی شریعۃ الحیل الباطلۃ التی تسقط فرائضہ و تحل

محارمہ، وتبطل حقوق عبادہ، ویفتح للناس ابواب الاحتیال وانواع المکر و الخداع، بل ھی شریعۃ مؤتلفۃ النظام، متعادلۃ الاقسام، لا امت فیہ و لا عوج، ولا ضیق فیھا ولا حرج، اوامرھا غذاء ودواء، ونواھیھا حمیۃ وصیانۃ شعارھا الصدق، وقوامھا الحق، میزانھا العدل، وحکمھا الفصل، لاحاجۃ بھا البتۃ الی ان تکمل بسیاسۃ ملک، او رای ذی رائ، اوقیاس فقیہ، اوذوق ذی ریاضت. فھی صراط المستقیم، ودینہ القویم؛ ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین!

صحابہ کرام کے زمانے میں نکاح تحلیل (یعنی فرضی طور پر بہ نیت استحلال حلالہ کرانے) کا خیال شاید بعض لوگوں کو ہوا تھا۔ اور "حتی تذوق عسلیتہ ویذوق عسیلتھا" اور "لعن اللہ المحلل والمحلل لہ" کی وعید ان تک نہ پہنچی ہوگی، جس پر حضرۃ عمر کو اپنے خطبوں میں اعلان کرنا پڑا: "لا اوتی بمحلل ولا محلل لہ الا رجمتھا" یعنی جس شخص نے بطور حیلہ کے حلالہ کرا کے مطلقہ سے رجعت کی ہیں اس کو زنا محصن کی حد جاری کئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ لیکن یہ بات تو اس وقت کسی کے وہم و خیال میں بھی نہ گذری تھی۔ کہ اللہ کی شریعت میں حیلوں کو بھی دخل ہو سکتا ہے، اور احکام شریعت نفاذ و عمل حقیقی کے لئے نہیں ہیں بلکہ محض دنیاوی ضابطوں اور قاعدوں کی طرح ظواہر و رسم پوری کر دینے کے لئے۔ شارع علیہ السلام کو تو سد باب حیل کا یہاں تک اہتمام تھا کہ عمال اور قضات کو قبول ہدایا سے بھی روک دیا کہ رشوت ستانی کا حیلہ بن سکتا ہے۔ مسند امام احمد میں ہے۔ ہدایا الاعمال غلول۔ اور ابو داؤد کی روایت بریدہ میں فرمایا: استعملناہ علی عمل ورزقناہ رزقا فما اخذہ بعد ذلک فھو غلول۔ ایک اور روایت ہے: اخذ الامیر الھدیۃ سحت اسی طرح مقروض سے ہدیہ و تحائف کا لینا ناجائز قرار دیا کہ سود کیلئے حیلہ بن جا سکتا ہے چنانچہ کہ ابن ماجہ کی روایت انس بن مالک میں فرمایا: اذا اقرض احدکم قرضاً فاھدی الیہ اوحملہ علی الدابہ، فلا یرکبھا ولا یقبلہ الا ان یکون جری بینہ و بینہ

قبل ذلک۔ اور اسی بنا پر ہدیہ مقترض کی نسبت اجلۂ صحابہ مثل عبادہ و ابی ابن کعب وغیرہم نے فتویٰ دیا کہ ربا میں داخل ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بیع خیار کی نسبت تصریح کر دی بحتی یتفرقا ولا یحل له ان یفارقه خشیة ان یستقیله۔ اس سے بھی مقصود یہی تھا کہ حیلہ کا سدِ باب ہو، اور اسی لئے امام احمد بن حنبل نے ابطال حیل پر اس روایت سے استدلال کیا ہے، اگرچہ بعض کوتاہ بینوں نے اس امام اہل السنت کی دقت نظر اور فقاہت ربانی کو نہ سمجھا اور اس پر اعتراض کیا۔ فلیس لهم بصیرة یعرفون بها اهل العلم و اهل الجهل و یمیزون بها بین منازلهم۔ بلاشبہ عہدِ صحابہ میں بعض لوگوں کے سوالات سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی بدعملیوں کے ہاتھوں ضیق و حرج میں مبتلا ہو کر ڈھونڈھنے لگے تھے۔ کہ کوئی مخرج و حیلہ نکل آئے۔ لیکن بالاتفاق تمام صحابہ و ارباب افتاء صدر اوّل نے ان کو پیام یاس سنایا۔ اور کہا کہ کوئی حیلہ نہیں۔ حضرت علی علیہ السلام سے ایک شخص نے غالباً مسئلہ یمین کی نسبت پوچھا تھا کہ ما الحیلہ؟ آپ نے فرمایا: ترک الحیلہ۔ حضرت ابنِ عباس سے ایک شخص نے طلاق کے متعلق جب پوچھا کہ اب اس سے بچنے کے لئے مخرج و حیلہ کیا ہو سکتا ہے؟ تو سخت غضب ناک ہوئے اور فرمایا: ومن یتق الله یجعل له مخرجا۔ جب تو نے حکم شریعت سے انحراف کیا تو اب مخرج کہاں؟ وما ظلمهم الله ولکن کانوا انفسهم یظلمون! اور پھر یہ جو کچھ بھی تھا، صرف طلاق و یمین کے بعض احکام کی نسبت، نہ کہ تمام احکام انفاق و زکوٰۃ و عقود و معاملات و تملیک اموال وغیرہا۔

ان تمام تصریحات سے بڑھ کر یہ ہے کہ قرآن حکیم نے صاف صاف لفظوں میں بتلا دیا تھا کہ یہودیوں کی ضلالت و مغضوبیت و ملعونیت کے اعمالِ خبیثہ میں سے ایک بڑا فتنہ یہ تھا کہ شریعت الٰہی کے احکام قطعیہ مصلحہ سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے حوالے اور بہانے نکالتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ خدا کا معاملہ بھی فریب خوردہ انسان کا سا ہے کہ اگر کسی حیلۂ و مکر سے ظاہر و صورت کو بنا لیا تو قصد و نیت کی اس کو خبر نہ ہوگی

ازانجملہ ایک حیلہ وہ تھا جو یوم السبت میں صید نہ کرنے کے حکم کی نسبت اصحاب سبت نے نکالا تھا۔ ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت۔ اور ازانجملہ وہ حیلہ تھا جو حرمت اکل شحم کی نسبت عمل میں لایا کرتے تھے اور جس کی نسبت آنحضرت نے فرمایا۔ لعن اللہ الیھود حرمت علیھم الشحوم فجملوھا واکلوا ثمنھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان حیلہ سازیوں کی وجہ سے ان پر لعنت بھیجی اور غضب الٰہی کے مورد ہوئے۔ انہوں نے اللہ کی شریعت کو مسخ کرنا چاہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود مسخ ہو گئے۔ وجعل منھم القردۃ والخنازیر اور اللہ تعالیٰ کا قانون مجازات یہی ہے کہ ثمرۂ عمل ٹھیک ٹھیک عمل کے مطابق اور ٹھیک ٹھیک اس سے اشبہ واوفق ظاہر ہوتا ہے۔ ہر عمل نیک وبد کے صور واشکال عالم مثال میں اسی طرح واقع ہوئے ہیں، اور یہی معنی ہیں اس آیۂ کریمہ کی کہ فحاق بھم ما کانو بہ یستھزءون۔ حیل واحتیال کے متعلق یہ حال تو کتاب اللہ کا ہے۔ اور سنت کو دیکھا جائے تو اس سے زیادہ واضح وصریح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار کھول کھول کر امت کو اسی ضلالت یہود اور خباثت اصحاب السبت والحیتان سے روکا تھا لعن اللہ الیھود حرمت علیھم الشحوم فجملوھا واکلوا ثمنھا اللہ کی پھٹکار یہود پر۔ چربی ان پر حرام کر دی گئی۔ تو حیلے بہانے نکال کر اس کو حلال بنا لیا۔ اس سے واضح فرمایا، لاترتکبوا ما ارتکبت الیھود فتستحلوا محارم اللہ بادنی الحیل۔ وہ کام نہ کرنا جو یہودیوں نے کیا کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو ادنیٰ حیلوں بہانوں سے حلال کر لیا مگر افسوس کہ وہی ہوا جس کا اس صادق ومصدوق کو اندیشہ تھا۔ اور اس امت میں بھی ایسے صدوقی اور فریسی پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے بحکم حذو النعل بالنعل ٹھیک ٹھیک ویسی ہی حیلہ بازیاں اور مکاریاں اسلام میں بھی پیدا کر لیں۔ فضلوا فاضلوا فویل لھم ولاتباعھم! حتےٰ کہ یہ فساد عظیم اس درجہ پھیلا کہ اصحاب حیل کے نزدیک حلال وحرام کی تمیز بکلی اٹھ گئی۔ محارم شرعیہ حلال ہو گئے۔ عقود فاسدہ کو جائز بنا لیا گیا، حدود شرعیہ ساقط کر دئے گئے۔ نور وظلمت، سیاہ وسفید، فسق وتقویٰ میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ احکام اوامر وعبادات

ومعاملات کی کوئی شاخ بھی اس مصیبت عظمٰی سے نہ بچی، ہر حکم سے بچنے کے لئے حیلے، ہر قید شرعی سے نکل بھاگنے کے لئے بہانے، ہر امرو نہی کے سقوط و تعطیل کے لئے مکر و فریب۔ شریعت الاہیہ کے کسی حکم کو بھی سچی تعمیل اور راستبازانہ وصالحانہ اطاعت کے لئے باقی نہ چھوڑا۔ اعمال انسانیت کی وہ اصل عظیم جس کو شریعت نے "نیت" کے جامع وحاوی لفظ سے تعبیر کیا تھا اور تمام انجام و ثمرات کی بنیاد اسی پر رکھی تھی کہ انما الاعمال بالنیات" اور "ولکل امرمانوی" اور اسی لئے فقیہ الامت حضرت امام بخاری نے اس جامع الکلم کو اپنی کتاب کا سرنامہ و عنوان قرار دیا تھا۔ اس طرح تاراج و ہلاک کر دی گئی۔ گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا! خدا کے بندوں کو فریب دیتے دیتے اس طائفہ بوالہوس کی بیباکی جرأتیں یہاں تک بڑھ گئیں کہ عالم السرائر والخفایا کو بھی دھوکا دینے میں چست و چالاک ہو گئے: ومایخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔ یہ ضلالت اس درجہ سے بھی آگے بڑھی۔ یہاں تک کہ مسائل حیل و احتیال فقہ سوء مزعومہ کا ایک باقاعدہ باب و مبحث بن گئے، اور رفتہ رفتہ فقہاء دنیا کے لئے صرف ذہانت۔ ونمائش فقاہت، واظہار علم و روایت، وتسابق عقول، وتنافس افکار، وتقابل قوت افتاء و قضاء کا سب سے بڑا دلچسپ و جالب قلوب میدان یہی حیلہ بازی و خدیعت ہو گئی۔ کتاب و سنت کی تقدیم و حفظ کا بند تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا، اور بنیاد فقاہت محض اٹکل اور ظن و وہم پر قرار پا چکی تھی۔ پھر کیا تھا؟ ہر ذہن نے تیزی دکھلائی، اور ہر قیاس نے بلند پروازی: "بنیاد ظلم در جہاں اندک بود، ہر کہ آمد براں مزید کرد" نتیجہ یہ نکلا کہ شریعت الٰہی جو عدل و صداقت کے قیام کے لئے آئی تھی۔ اسی کے نام سے مکر و فریب اور ظلم و غصب اور نہب و سلب کے تمام کاروبار جاری ہو گئے۔ اور دنیا کی تباہی کے لئے اس سے بدتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا پاک نام لے کر اس کی دنیا میں برائی پھیلائی جائے! کتنی ہی نا کاریاں ہیں جو حیلے نکال کر نکاح شرعی بنا دی گئیں! کتنے ہی غصب و ظلم اور اکل اموال بالباطل کے مصائب ہیں جن کو ایک شرعی معاملہ بنا کر جائز کیا گیا! کتنے ہی عقود فاسدہ ہیں جن کو

اسی شیطان حیل نے جائز کرا کے بندگان الٰہی کے حقوق تلف کرائے! کتنے ہی حج ہیں جو ساقط ہوئے! کتنی ہی زکاتیں ہیں جو کبھی ادا نہیں کی گئیں! کتنے ہی شارب الخمر اور زانی محصن ہیں جو حدود شرعیہ سے صاف بچالئے گئے! پھر یہی تخم حیل ہے جس کی شاخیں کس قدر دور دور تک پھیلیں، اور اس کے اثرات نئی نئی شکلوں میں کارگر اور دور دور کی چیزوں میں سرایت کر گئے۔ متعدد تفریعات ہیں جو بظاہر اس سے الگ معلوم ہوتی ہیں۔ مگر فی الحقیقت اسی عائلۂ فساد کے اخوان و اخوات میں داخل ہیں۔ حد ہو گئی کہ علانیہ صاف صاف اجرت زنا اور مہر بغی کو حلال کہدیا گیا۔ یہ بھی اسی تخم حیل کے برگ و بار میں سے نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ تم نے بعض شرح میں بارہا پڑھا ہوگا: ما اخذتہ الزانیۃ ان کان بعقد الاجارۃ فحلال۔ لان اجر المثل طیب: یعنی زانیہ نے اگر اجرت ٹھہرا کر زنا کی اجرت لی تو وہ حلال ہے کیونکہ اجر مثل کے طیب ہونے میں کوئی کلام نہیں

برداشت غل شرع بتائید ایزدی

ازگردن زمانہ علی ذکرہ السلام

اور جب اس پر لوگوں نے اپنا سر پیٹ لیا کہ جس چیز کو اللہ کے رسول نے خبیث فرمایا اس کے حلال وطیب ہونے کی کونسی نئی وحی اتر آئی ہے؟ مسلم و ترمذی کی حدیث رافع بن خدیج میں ہے: مہر البغی خبیث۔ اور بخاری کی روایت میں ہے: نہی رسول اللہ صلعم عن ثمن الکلب ومہر البغی۔ تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تو ایک خاص حالت تھی: "ھوان یواجرامۃ علی الزناد ما اخذہ من المہر" لیکن "ان ستاجرھا الیزنی بہا ثم اعطاھا مہرھا اوما شرط لہا فلاباس باخذہ، لانہ فی اجارۃ فاسدۃ فیطیب لہ وان کان السبب حراما"۔ یعنی اگر ایک عورت سے زنا کے لئے اجرت ٹھہرالی اور زنا کیا اور اس کے بعد عورت نے وہ اجرت لی تو اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہاں تک تو مسئلہ کی اصلی صورت تھی۔ لیکن جب اس

بھی لوگوں نے ماتم کیا کہ یہ کیا شریعت کی تباہی اور انسانیت کی ہلاکت ہے کہ محض عقد اجارہ کی ایک اصل باطل کی بناپر اجرت خبث وخباثت کو کھلے بندوں حلال وطیب بنایا جارہا ہے؟ تو پھر یہ حیلہ سکھلایا جاتا ہے۔ "ان یستاجرھا لکنس بیتہ او لطی ثیابہا او طبخ طعامہ او لنقل متاع من مکان الی مکان ویشترط بہا الزنا ثم یزنی"

یعنی صورت اس کی یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے گھر کا کام کاج کرنے کے لئے یا کھانا پکانے کے لئے یا کسی اور فعل مباح کے لئے ایک عورت سے عقد اجارہ کیا کہ اتنی مزدوری پر میرا کام کر دیا، اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھہرالی کہ تجھ سے زنا بھی کروں گا، تو چونکہ یہ مشروع باصلہ وغیر مشروع بوصفہ ہے۔ اِس لئے اجارہ فاسد ہوا لیکن اجرت حلال ٹھہری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی دانائے حیل نے ذرا چشم وابرو دیکھ کر کسی اچھی سی ماما کو کام کاج کے لئے مزدوری پر رکھ لیا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھہرالی کہ گاہ گاہ کچھ اور مشغلہ بھی جاری رہے گا تو ایسی اجرت اس ماما کے لئے جائز وحلال وطیب ہے: لان اجر المثل طیب! تعالی اللہ وشریعت عما یقولون ویفعلون علواً کبیراً۔ لطف یہ کہ "ان اخذ (ای المھر) بغیر عقد بان زنی بامۃ ثم اعطاھا شیئاً فھو حرام لانہ اخذہ بغیر حق" بھی موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شکل مہر بغی کی حرام ہو بھی سکتی ہے، تو اس لئے نہیں کہ وہ زنا کی اجرت ہے اور ہر اجرت جو فعل خبیث کی ہو خبیث ہے اور ہر عقد جس کا معقود علیہ حرام ہو وہ عقد باطل، بلکہ صرف اس لئے کہ باضابطہ طریق اجارہ کے مطابق عقد اجارہ نہیں ہوا اور جو کچھ اس کو دیا گیا، وہ اس کا حسب شرط حق نہیں تھا۔ پس گویا ان کے نزدیک اس معاملہ کی حلت وحرمت کا سارا دارومدار صرف اس ایک اصل معاملات پر ہے کہ عقد اجارہ ہوا یا نہیں؟ اور اس کے شرائط صحیحہ ومتعینہ ہیں یا نہیں؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں! یہی وہ قیاس باطل ہے جس کو شریعت نے "ھوائے نفس" قرار دیا ہے، نہ کہ قیاس صالح وحکمت نبوی جو عین شریعت بلکہ منتہا مرتبۂ علم حق وبصیرت ربانی ہے۔ اور جس قیاس باطل کا نتیجہ ہے۔ صرف ایک ہی

اصل وعلت کا استغراق واستہلاک واقتناع، اور دیگر اصول وعلل ومقاصد سے بکلی اعراض حالانکہ اکثر احکام شرعیہ معلل بعلل شتیٰ، اور اصل امر ونہی متعدد مقاصد ومصالح پر مبنی صرف تمثیل وتقسیم اور حمل نظیر علی النظیر بلا مراعات مقاصد اُخرےٰ ومہمہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟ اس ضلالت سے بچنے کی صرف ایک ہی راہ تھی کہ ہر موقعہ اور ہر جزئیہ وتفریع پر تقدیم کتاب وسنت اور بہ تعمیل فردوہ الی اللہ والی الرسول ہر اصل اور ہر فرع کے لئے اہتداء بہ مشکواۃ نبوت مگر ایسا نہیں کیا گیا اور صرف اپنے چند ساختہ پرداختہ اصول اور کلیات پر قناعت کر لی گئی۔ اس چیز نے نہیں معلوم اس کارخانہ کے کتنے کیل پرزوں کو درہم برہم کر دیا ہے، اور اسی حالت کی نسبت کہا گیا ہے کہ:۔

حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء!

لطف یہ کہ "لاتصح الاجارۃ لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاھی" بھی کہتے ہیں یعنی گانے بجانے کے لئے اجارہ صحیح نہیں۔ فیا للہ ویا للعقول! غنا اور ملاہی کی اجرت کا مال تو طیب نہو احالانکہ اس کی حرمت محتاج دلیل۔ مگر زنا کی اجرت طیب ہو سکتی ہے: لان اجر المثل طیب وان کان السبب حراماً!

یکرہ ان یشرب من فضۃ

ویسرق الفضۃ ان نالھا

اسی طرح سقوط حد بصورت نکاح محرمات ابدیہ کا مسئلہ ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک دوسری اصل پر مبنی تھا۔ غالباً ترمذی کی حدیث برا بن عازب قدما۔ مخالفین حد تک نہ پہنچی ہوگی۔ اگرچہ بعد کے لوگوں تک پہنچی اور متشبث بہ حشیش تاویل ومتمسک بہ طریق رد سنت بمجرد قیاس ورائے ہوئے، اور پھر جن فقہا نے حد کو بوجہ شبہ ساقط کیا

ان کو بھی تعزیر سے انکار نہیں۔ والحد یدرء بالشبہات والتعزیر یجب مع الشبہات ان کا قاعدہ مقرر ہے، اور اگرچہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تعزیر انتالیس کوڑے سے زیادہ نہیں (کما صرح بہ الہدایہ) لیکن درمختار وغیرہ میں یہ بھی

تو ہے کہ "ویکون التعزیر بالقتل" بایں ہمہ یاران حیل نے اس مسئلہ سے بھی جو کام لیا اور جس طرح چند در چند تفریعات پیدا کی گئیں، وہ بھی اِس وادی حیل ہی کے معاملات ہیں۔ اور اسی طرح مسئلہ نفاذ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً اگرچہ بظاہر اس سے بے تعلق نظر آتا ہے۔ مگر اس کے نتائج و ثمرات پر غور کیا جائے تو وہ بھی اسی میدان کا ایک گوشہ بعید ہے۔ کسی نہ کسی طرح عدالت اور قاضی کے یہاں بات

بنالی جائے پھر اس کے بعد کوئی کھٹکا نہیں۔ گویا شریعت کے امر و نہی کا سارا دار و مدار اور مواخذہ آخرت کی بنا صرف دنیا کے احکام و ظواہر ہیں۔ حسن و قبح اشیاء و تفریق سیاہ و سفید و حق و باطل، و تصحیح نیت و بطون، و جلب محاسن و فضائل فی الاصل و عنداللہ کوئی چیز نہیں۔

گفتی کہ چہ شد قاعدۂ مہر و محبت؟

رسم کہنی بود بعہد تو برافتاد!

اس پرطرہ یہ کہ ہمارے زمانے کے بعض اصحاب درایت و عقول نے اسکی تائید میں یوں داد تحقیق و فقاہت دی ہے کہ بحکم خلق لکم ما فی الارض جمیعا تمام بنات آدم محل نکاح ہیں، اور نکاح نظیر و مثیل عقد بیع کے ہے۔ مہر بمنزلہ ثمن، اور ایجاب و قبول اور خلوت تملیک و تصرف کے لئے، اور جب قاضی نے جھوٹے گواہوں سے دھوکا کھاکر یا کسی اور وجہ سے پرائی عورت کو کسی کی منکوحہ قرار دیدیا اور وہ لے کر چلتا بنا، تو اس سے بھی یہ ساری باتیں بدرجۂ اتم حاصل ہوگئیں۔ پس وہ عورت کہ قضا قاضی سے پہلے جھوٹے مدعی کے لئے حرام تھی۔ لیکن اس کے بعد ضرور حلال ہوگئی عنداللہ بھی کوئی مواخذہ نہیں ہونا چاہئے! سبحان اللہ! خلق لکم ما فی الارض جمیعا کی کیا عمدہ تفسیر ہے۔ اور تحلیل زن اجنبیہ اور جواز مکر و خدیعت کے لئے کیسی عاقلانہ و فلسفیانہ فقاہت!

وائے گر در پس امروز بود فردائے!

لطف یہ کہ ان بزرگوں کو اس عجیب المخلوقات استدلال پر بڑا ہی فخر و ناز ہے۔ اور اس کو منجملہ ثمرات حسنہ "من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین" کے قرار دیتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! اگر یہی تفقہ فی الدین ہے تو نہیں معلوم اس کے ضد و مقابل کو کس جگہ ڈھونڈھنا چاہیئے؟ اور اس کا وجود بھی اب دنیا میں باقی رہا یا علم حق کی طرح آسمانوں پر اٹھا لیا گیا؟

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ

وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم!

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ متعدد نظائر و حوادث حیل و مخادعت کے ہیں جن کو بعض ائمہ و اعلام کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے اور ان کو دیکھ کر طبیعت کو سخت تشویش و حیرانی ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت اس قسم کے متعدد ناگوار واقعات منقول ہیں۔ ازاں جملہ ہارون الرشید اور جاریۂ مہدی کا واقعہ ہے جس کو حافظ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں بحوالہ سلفی بسندہ عن عبداللہ بن مبارک نقل کیا ہے۔ ہارون الرشید نے قاضی ابو یوسف سے ایک بار کہا کہ ایک لونڈی پر میرا جی آگیا ہے مگر وہ کہتی ہے کہ تیرے باپ مہدی کی مدخولہ ہوں۔ (فھل عندک فی ھذا شیٔ) یعنی اس بارے میں تمہارے پاس کوئی مفید مقصد فتوے ہے؟ قاضی ابو یوسف نے کہا ہاں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ مجرد ایک لونڈی کا بیان سچ سمجھ لیا جائے؟ آپ اس کے دعوے کی تصدیق ہی نہ کریں کہ کذب سے مامون نہیں! حضرت عبداللہ بن مبارک یہ واقعہ نقل کر کے کہتے ہیں: میں نہیں جانتا ان تینوں میں سے کس کے حال پر زیادہ متعجب ہوں؟ ہارون الرشید کے حال پر جو اپنے باپ کی حرمت سے باہر ہوا؟ یا اس لونڈی پر جس نے امیر المومنین سے روگردانی کی؟ او من ھذا فقیہ الارض و قاضیھا قال اھتک حرمۃ ابیک واقض شھوتک وصیرہ فی رقبتی؟ اور ازاں جملہ وہ واقعہ ہے جو اس کے بعد ہی حافظ سیوطی نے

اسحاق۔ بن راہویہ اور عبد اللہ بن یوسف سے نقل کیا ہے کہ ہارون الرشید نے قاضی ابو یوسف سے کہا۔ میں نے ایک لونڈی خریدی ہے۔ کوئی ایسا حیلہ تبلا سکتے ہو کہ استبرا کے انتظار سے بچ جاؤں اور فوراً اس سے متمتع ہوں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ ھبہا لبعض ولدک ثم یتزوجہا! اس پر رشید نے خوش ہو کر ایک لاکھ درہم انعام دینے کا حکم دیا۔ لیکن رات کا وقت تھا۔ خزانے کے دروازے بند تھے۔ کسی نے کہا صبح کو لیجئے گا۔ اس پر قاضی ابو یوسف بولے، تد کانت الابواب معلقۃ حین دعانی ففتحت یعنے آپ کی حاجت براری کا دروازہ بھی تو اس وقت بند تھا۔ جب آپ نے مجھے بلایا تھا میں نے حیلہ تبلا کر کھول دیا۔ اب میرے لئے خزانے کا بند دروازہ کیوں نہ کھولا جائے؟

اس سے بھی بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ یہی اسقاط زکوٰۃ کا مخدوم الملک والا حیلہ ان کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ امام غزالی احیاء العلوم میں نقل کرتے ہیں کہ قاضی ابو یوسف ہر سال اپنا تمام مال بیوی کے نام ہبہ کر دیتے اور وہ اختتام حول سے پہلے ان کے نام پھیر دیتی۔ اس طرح زکوٰۃ ساقط سمجھ لی جاتی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ جب حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ نقل کیا گیا تو انہوں نے بہت داد دی اور فرمایا ھذا من فقہہ! امام غزالی یہ واقعہ نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ جمع دنیا کے لئے تو یہ بہت اچھی فقاہت تھی، مگر آخرت میں اس سے بڑھ کر کوئی چیز نقصان پہنچانے والی نہیں ہو سکتی اور یہی وہ علم ہے جو نافع ہونے کی جگہ ضار و مہلک ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بظاہر ان واقعات کو پڑھ کر طبیعت کو سخت خلجان ہوتا ہے لیکن دقت نظر سے کام لیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اور اس طرح کی تمام منسوبات قطعاً ناقابل اعتماد بلکہ داخل الاکاذیب و بہتان ہیں۔ حضرت قاضی ابو یوسف اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کا مقام اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ ایسے منکرات و شنائع کا ان کی نسبت وہم بھی کیا جا سکے۔ یہ سارے حیلے بعد کے فقہاء حیل و علماء جیل

وفساد کے تراشے ہوئے ہیں اور یقیناً انہوں نے ہی اپنی بضاعت ردیہ کے رواج دینے کے لئے ان کو آئمۂ سلف و فقہا امصار کے نام سے منسوب کر دیا۔ ایسی مکذوب و مصنوع نسبتیں ہمیشہ ہوئی ہیں اور ہر علم و فن میں اس کے بے حد و شمار نظائر موجود ہیں تصوف میں جتنی باتیں کہی جاتی ہیں سب جنید و شبلی رحمہما اللہ کے نام سے۔ فلسفہ و طب میں ہر چیز شیخ سے منسوب تفسیر قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو حضرت ابن عباس اور عکرمۂ و مجاہد وغیرہم کی نسبت سے نہ کہی گئی ہو۔ حتٰے کہ ایک پوری تفسیر ترتیب دیدی گئی عقائد و کلام کی بے شمار محدثات و مخترعات ہیں اور سب کے سب اشعری و جوینی و امام الحرمین کی طرف منسوب، حالانکہ ان کو ان باتوں کا وہم بھی نہ گذرا ہوگا۔ امام اشعری کی کتاب الابانہ چھپ گئی ہے۔ دیکھ لیا جائے کہ علو و استوار اور باب صفات میں وہ کیا کہتے ہیں۔ اور متاخرین متکلمین باسم اشعریت کیا تیلا رہے ہیں؟ امام الحرمین کی مصنفات کے مختارات طبقات الشافعیہ میں دیکھو۔ کسب کے متعلق ان کا بیان کیا ہے اور ان کتابوں کا کیا ہے جن کے پڑھنے پڑھانے میں ہماری عمریں برباد جا رہی ہیں؟ اور اصل حقیقت کا تو پوچھنا ہی کیا۔ وہ تو ان سب سے مافوق و ماورا ہے اور یہاں بحث صرف منسوبات و ملحقات سے ہے تحقیق مسائل مطلوب نہیں۔ پس یہی حال فقہ کا بھی ہوا۔

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

اور پھر سب کچھ ابو حنیفہ و شافعی رحمہما اللہ کے نام سے منسوب ہوگیا۔ جن لوگوں نے ان حکایات حیل کو نقل کیا۔ وہ بھی قابل ملامت نہیں کہ یہ باتیں کثرت سے مشہور ہوگئی تھیں۔ بطریقِ نقل و حکایات اور زیادہ تر بوجہ غرابت و تفکہ لکھ گئے۔ خاص طور پر تحقیقات نہ کی۔ ہمارے لئے یہ بہت آسان ہے کہ سلفی کی قصص طیوریات کی تضعیف کر دیں بمقابلہ اس کے کہ امام ابو یوسف جیسے شخص کی نسبت ایسے منکرات فضائح کو منسوب کریں کہ حفاظِ حدیث میں معدود اور قاضی القضات مسلمین تھے، اور جن کے فرمان قضا کے ماتحت

ایک زمانے تک عہدِ عباسیہ کا وہ عالم اسلامی رہ چکا ہے جس کے حدود موجودہ جغرافیا رض میں ایک طرف ساحل بمبئی تک اور دوسری طرف صحرائے افریقہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

امام ابو یوسف تو وہ شخص ہیں کہ تمام فقہا عراق و اصحاب رائے میں رعایت حدیث وحفظ آثار کے لحاظ سے ممتاز ترین فقیہ تسلیم کئے گئے۔ ابن معین نے ان کی نسبت کہا تھا لیس فی اصحاب الرائے اکثر حدیثا منہ۔ اور مزنی نے کہا: اتبع القوم للحدیث۔ اور یہ بالکل حق ہے اور اصحاب نظر و خبرت سے مخفی نہیں کہ امام ابو یوسف و امام محمد ہی وہ دو شخص ہیں جن کی رعایت روایت و حدیث نے فقہ عراق کو اپنی فقدانِ ت اولی کی جگہ موجودہ صورت تک پہنچایا، اور بہ نسبت سابق کے معاملہ کی صورت دوسری ہو گئی۔ اگر یہ امامین جلیلین نہ ہوتے تو نہیں معلوم صورت حال کیا ہوتی؟

پھر کیونکر عقل سلیم باور کر سکتی ہے کہ ایک ایسا شخص محض بادشاہ وقت کو خوش کرنے اور اس کی خواہشِ نفسانی کو پورا کرنے کے لئے دین بازی وحیلہ سازی کی راہ اختیار کرے اور کبھی مدخولہ اب کو حلال بنا دے، کبھی زکوٰۃ کے ساقط کرنے کے لئے حیلے تراشے۔

بلاشبہ بعد کو ایسا ہی ہوا اور بندگان سلاطین و عبید الدنیا نے بادشاہوں کی نفس پرستیوں اور اغراض بہیمیہ کی حاجت روائیوں کے لئے کوئی دقیقہ تحریف شریعت و نسخ احکام کا باقی نہ چھوڑا، لیکن حاشا کہ ائمہ و فقہا سلف کے دامن صداقت و اتقا پر اس کی ایک چھینٹ بھی پڑی ہو۔ ان کی نسبت ایک لمحہ کے لئے بھی ایسا گمان فاسد نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ذہبی نے امام ابو یوسف کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص کہے۔ "ایمانی کایمان جبریل" وہ صاحب بدعت ہے۔ اسی ایک بات سے اندازہ کر لو کہ وہ کس درجہ متبع سلف تھے؟ انتقال کے وقت کہا وکل ما افتیت بہ فقد رجعت عنہ الا ما وافق الکتاب والسنۃ۔ یہی قول و عمل تمام ائمہ و فقہا حق کا رہا ہے اور سلف اہل سنت میں ایک امام و فقیہ بھی نہیں جس نے دانستہ نص رسول سے اغراض کرنا چاہا ہو۔ الا یہ کہ احادیث اُس تک نہ پہونچیں یا پہنچیں مگر ان کی صحت و قوت

پر مطلع نہ ہوا۔ ایسا یقیناً ہوا اور اس میں معذور، اور وہ لوگ جو پہلی بات کے مدعی ہوں اور وہ بھی جو آخری حقیقت سے انکار کریں، دونوں عقل وفہم سے عاری اور نور بصیرت و حق سے محروم، و داخل مجانین تعصب و جمود، اور لائق خطاب نہیں۔

یہ حال نوروایات وحکایات کا ہے۔ اسی طرح کتب فقہ وواقعات وفتاوے و حوادث کی بے شمار تفریعات ومحدثات فقہیہ ہیں جن سے قدما وائمہ کو کوئی تعلق نہیں مگر بے تکان لکھ دیا جاتا ہے کہ "کذا عند ابی حنیفۃ وکذا عند فلان" اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی کسی قرار دادہ اصل کی بنا پر یہ تفریع ہے اور فلاں اصل جو ہم نے ان کی ٹھہرائی ہے۔ اس کی بنا پر یہ جزیہ متفرع ہوتا ہے۔ حالانکہ تفریع خود ان کی ساختہ وپر داختہ ہے اور امام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی تخریج در تخریج و تفریع در تفریع، و قیاس در قیاس، و استنباطات رائیہ چند در چند، و اقناع بر مجرد قواعد منطقیہ جزئیات وکلیات و تقسیم و تمثیل، داً بعد بعد واً هجر هجر اصلین اً سلیان کتاب وسنۃ کی مصیبت عظمیٰ و رزیۃ کبریٰ ہے جس کی وجہ سے قرناً بعد قرن ونسلاً بعد نسل سخت و شدید غلطیاں بلکہ گمراہیاں واقع ہوتی رہیں اور کارخانہ شرع میں فساد عظیم رونما ہوا۔ از اں جملہ یہ کہ ناواقف "عند ابی حنیفۃ" دیکھ کر دھوکا کھاجاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ فرع امام ابوحنیفہ کا بعینہ مذہب ہے۔ جب مسئلہ عشر فی العشر، اور تحریم اشارہ فی التشہد، وکراہت رفع الیدین عند الرکوع، وکراہت آمین بالجھر واقتدا اخلف مخالف، وعدم وجوب طمانیۃ، ووجوب لزوم وتعین وغیرہا کی نسبت صاف دیکھ رہے ہیں کہ صریح تصریحات کتب اصول[1] وموطا وجامع وغیرہ کے خلاف لکھا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض کوتہ آستینان فقاہت کی دراز دستیاں یہاں تک بڑھیں کہ رفع الیدین عند الرکوع اور اشارہ فی التشہد کو فعل کثیر کہتے ہوئے بھی نہ شرمائے، تو پھر اور باتوں کے لئے ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون تھا؟

---

[1] کتب اصول سے مقصود اصول فقہ نہیں ہے بلکہ ظاہر الروایت وغیرہ کتب امہات و اصل فقہ حنفی

درازدستی این کوتہ آستیناں بیں!

اور یہ تو فروعات کا حال ہے، لیکن کاش معاملہ اس سے آگے نہ بڑھتا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جوں جوں نصوص سنت کے معارضات بڑھتے گئے اور بحث و مناظرہ کا میدان وسیع ہوتا گیا، ساتھ ساتھ نئے نئے اصول و قواعد بھی بنتے گئے کہ اگر قاعدہ بن گیا تو ایک ہی ڈھال پر سارے وار روک لئے جائیں گے۔ حالانکہ حضرت امام ابوحنیفہ و صاحبین رحمہم اللہ کو ان اختراعی اصول و قواعد کا وہم و خیال بھی نہ گذرا نہ ہوگا۔ بلکہ ان کی تصریحات بینہ ان کے خلاف موجود۔ یہ جو مسلمہ قواعد ٹھہرا لئے گئے ہیں کہ الخاص مبین فلا یلحقہ البیان[1] الزیادۃ علی الکتاب نسخ فلا یکون الاٰیۃ ناسخۃ او حدیث مشہور ناص۔ لاترجیح بکثرۃ الرواۃ وانما ہو بفقہ الراوی۔ کل حدیث لم یروالامن لیس فقیہا فان انسد فیہ باب الرائے لایجب قبولہ۔ العام قطعی کالخاص الموسل کالمسند۔ وغیر ذالک من القواعد المصنوعۃ التی یردون بہا جمیع ما یحتج بہ علیہم من الاحادیث الصحیحۃ تو ان میں سے کون سا قاعدہ ہے۔ جو حضرت امام ابوحنیفہ یا صاحبین کا ٹھہرایا ہوا ہے؟ لیکن اب یہ سب کچھ انہی کی جانب منسوب ہے، اور ہزاروں مدعیان تفقہ و علم و مشغولین درس و تدریس منار و ہدایہ ہیں جن کو اس کی خبر بھی نہیں۔ حتےٰ کہ بعض دانشمندوں نے تو ایک ہی قاعدہ بنا کر سارے جھگڑے چکا دیئے: اذا کان فی المسئلۃ قول لابی حنیفۃ وصاحبیہ وحدیث لحکمون بصحتہ، وجب اتباع قولہم دون الحدیث، لانا نظن بابی حنیفۃ وصاحبیہ انہم عارضوا الحدیث مع صحتہ وصحۃ الاستنباط منہ۔ یعنی اگر کسی مسئلہ میں حدیث صحیح ایک طرف ہو اور دوسری

---

(۱) ردوا بہا فرضیۃ قرأۃ الفاتحہ فی الصلوٰۃ وفرضیۃ الاطمینان وغیر ذلک۔ قالوا لفظ اقرؤا او اقرؤا و اسجد واخاص مبین فلو لحقہا البیان لکان الخاص یلحقہ البیان۔

طرف اُس کے خلاف امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا قول، تو واجب ہے کہ حدیث کو چھوڑ دیا جائے اور قول امام ہی کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ آخر کوئی بات تو ہو گی جس کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا؟ تو کیا یہ قاعدہ بھی اس وجود گرامی کا قرار داد ہو سکتا ہے جس نے اپنی ساری عمر مقدس اس صدائے حق کے اعلان و تکرار میں بسر کر دی کہ "اترکوا قولی لخبر الرسول"؟ اور کیا اس طرح کے قواعد کا اُن لوگوں کو گمان بھی گذر سکتا تھا جن کا عقیدہ یہ تھا کہ "اذا صح الحدیث فھو مذھبی" اور "فاضربوا بقولی الحائط"؟

فاین الثریا واین الثریٰ؟
واین معاویۃ من علی؟

یہی وجہ ہے کہ محققین اہل سنت و آئمہ سلفیہ اس پر متفق ہوئے کہ تمام آئمہ سلف کا دامن علم و عمل بدعت حیل سے پاک ہے اور جتنی باتیں ان کی نسبت سے کہی جاتی ہیں یا تو ان کی بنا یہ ہے کہ اُن ائمہ کی کسی اصل کو لے کر اس پر خود غلط در غلط وظلمات بعضھا فوق بعض متاخرین نے تفریعات کی ہیں، اور یا بندگان الٰہی کو گمراہ کرنے کے لیے از راہ مکر و تلبیس اپنی حیلہ تراشیوں کو ان کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ جب یہ بندگان نفس خدا کو دھوکا دینے سے باز نہیں آتے کہ یہی حقیقت بدعت حیل کی ہے تو ظاہر ہے کہ انسانوں کو دھوکا دینے اور ان پر افترا کرنے میں ان کو کیا باک ہو سکتا ہے؟

علامہ ابن قیم نے اعلام میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول نقل کیا ہے۔ "والمتاخرون احدثوا حیلا لم یصح القول بھا عن احد من الائمۃ ونسبوھا الی الائمۃ وھم مخطئون فی نسبتہ الیھم ولھم مع الائمۃ موقف بین یدی اللہ۔ الخ"

بہرحال سلسلۂ سخن بلا قصد بہت دراز ہو گیا۔ مقصود یہ تھا کہ بدعت حیل منجملہ مصائب عظیمۂ اسلام کے ہے جس نے مسلمانوں کی عملی زندگی کو بالکل بے روح کر دیا

اور مقاصد شریعت فوت ہو گئے۔ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ عموماً علمار دنیا اور فقہا دولت کا گروہ تزکیۂ نفس و اخلاق سے بالکل کورا ہوتا ہے، اور اصلاح و تصفیۂ باطن کی رُوح اُن کی زندگی کی کسی شاخ میں نظر نہیں آتی۔ دنیا سازی و سخن پروری اور جدل و خلاف و مکر و ریا کو شریعت کا علم و عمل سمجھتے ہیں اور اپنی خشکی دماغ و عبوسیت طبع و یبوست فکر میں ٹھیک ٹھیک ان صدوقیوں اور فریسیوں کا نمونہ ہوتے ہیں۔ جن کا نقشہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے مواعظ میں کھینچا ہے اور جن کی نسبت وہ بار بار کہتے تھے کہ "خمیر مایۂ فریسیان کی روٹی نہ کھاؤ"، تو اس کا اصلی سبب کیا ہے؟ یہی حیلہ سازی و بہانہ جوئی، ظاہر آرائی و باطن خرابی! اخلاق حسنہ اور سچی خدا پرستانہ زندگی کا سارا دار و مدار تصحیح نیت و باطن پر ہے۔ جب خود اعمال شریعت میں اس کی قید اٹھ گئی اور سمجھ لیا گیا کہ حیلوں بہانوں سے یہاں بھی کام نکل سکتا ہے تو اخلاق کہاں باقی رہا؟ زکوٰۃ کا اصل مقصد شارع تو بتلائے کہ یؤخذ من اغنیائہم ویرد علی فقرائہم، جس سے معلوم ہوا کہ محض کوئی ظاہری رسم اور بات پوری کر دینا مطلوب نہیں ہے بلکہ اغنیار سے فقرا کو مال دلانا اور ان کی حاجت روائی کرانی تاکہ قوم کا کوئی طبقہ محتاج نہ رہے۔ مگر یہ دین باز اسکا یہ مطلب بنالیں کہ اگر صرف دکھلاوے کی بات پوری کر دی تو حکم زکوٰۃ ساقط ہو گیا۔ پھر ایسی حالت میں سچی خدا پرستی اور راست بازی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ یہ لوگ بھی فی الحقیقت ملحد ہیں لیکن ان کا الحاد، الحاد اعتقادی نہیں ہے بلکہ عملی، اور دنیا میں ہمیشہ الحاد فی العمل ہی زیادہ رہا ہے۔ اعتقادی ملحد تو ہمیشہ مثل شواذ خلقت و نوادر انسانیت کے رہے اور رہیں گے کہ اصل فطرت انسانی تصدیق ہے نہ کہ انکار۔ بڑی مصیبت اس سے یہ پیدا ہوئی کہ عوام امت کا سارا معاملہ علمار کے ہاتھ میں تھا، جب خود ان کے عمل کا یہ حال ہوا تو پھر عوام کا کیا پوچھنا؟

اذ کان رب البیت بالطبل ضاربا
فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص!

لکھتے لکھتے بات یاد آگئی۔ ہمارے زمانے کے بعض مشہور ملاؤں کی نسبت بھی خصوصیت کے ساتھ معلوم ہوا کہ اسی حیلۂ زکواۃ پر عمل کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے مجھ سے ایک مولوی صاحب کی نسبت کہ مدرس بھی ہیں۔ واعظ بھی ہیں، اور جدل و مکابرات کے رسائل کے مصنف بھی، بیان کیا کہ وہ ہر سال اپنا اندوختہ بیوی کے نام ہبہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر وہ نیک بخت اسی کارِ دِ عمل کرتی ہے۔ اُن کے استاد جناب مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی نے یہ سنا تو ایسا کرنے سے روکا کہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ میں نے یہ سن کر کہا کہ تقویٰ تو ایک مزید درجۂ عمل و فضیلت ہے۔ اس کا یہاں ذکر ہی کیا؟ یوں کہنا چاہیئے کہ سرے سے دین و شریعت کے ہی خلاف ہے، اور ایک نہایت غلیظ قسم کا باطنی فسق اور کامل قسم کی یہودیت اور اصحاب السبت کے شجرۂ ضلالت سے پورا پورا استلحاق! خیر، دنیا کی زندگی ہے اور دنیا والوں کے احکام و انظار سے مقابلہ، جو جی میں آئے کرلیں، اور ابلیس خادع کی ہر کھولی ہوئی راہ کو صراط مستقیم سمجھ لیں، لیکن ایک دن آنے والا ہے، جب نیتوں کے بھیدوں کا جاننے والا اور سرائر و خفایا سے قلوب کا دیکھنے والا سامنے ہوگا اور اس وقت یہ ساری مکاریاں اور حیلہ بازیاں جو دنیا والوں کو دھوکا دیتی تھیں، دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

فان للہ یومًا تنسف فیہ الجبال، وتترادف فیہ الاھوال، وتشھد فیہ الجوارح والاوصال، وتبلی فیہ السرائر، تظھر فیہ الضمائر و یصیر الباطن فیہ ظاھرًا، والسر مکشوفا، والمجھول معروفا، وتجری فیہ احکام الرب علی القصود والنیات، کما جرت احکامہ فی الدنیا علی ظواھر الاقوال و الحرکات، یوم تبیض وجوہ بما فی قلوب اصحابھا من البر والصدق والاخلاص وتسود بما فی قلوب اصحابھا من الخدیعۃ والغش والاحتیال، ھنالک یعلم المخادعون انھم لا نفسھم کانوا یخدعون، وبدینھم کانوا یلعبون، وما یمکرون الا بانفسھم وما یشعرون!

فصل

بات مخدوم الملک کے حیلہ زکوٰۃ سے چلی تھی - بدایونی لکھتے ہیں کہ اگرچہ ملا عبد النبی صدر اور مخدوم الملک دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ تھے اور علماء امت و اہل اللہ کی اذیت و مخالفت میں ہم رنگ و آہنگ، لیکن چونکہ دنیا کے عشق نے دونوں میں رقابت کا رشتہ قائم کر دیا تھا، اس لئے خود بھی ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے اور آپس کی ٹکریں برابر چلتی رہتیں نتیجہ یہ نکلا کہ ان آپس کی ٹکروں ہی سے دونوں پاش پاش ہو گئے - اذا تعارضا تساقطا کسی دوسرے ہاتھ کی ضرورت ہی نہ ہوئی یخوبون بیوتہم بایدیہم کا منظر نظروں میں پھر گیا - اور یہ اس گروہ کا اولین اور لاینفک خاصہ ہے. سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علماء دنیا پرست کبھی ایک جا اکھٹے نہیں ہو سکتے. کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے. لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر اُن کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے. یہی حال ان سگان دنیا کا ہے. ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سٹر رہی ہو، وہاں پہنچکر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے. ان کا سرمایہ نازِ علم حق نہیں ہے. جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے، بلکہ یکسر علم جدل و خلاف ہے نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی، اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیزی کرتی رہتی ہے. فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی تندرستی کا جام صحت پیتے ہیں. اور چور اور ڈاکو مل جل کر رہزنی کرتے ہیں، مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا. اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے. میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار اور الفت کی

باتیں سننے میں آجاتی ہیں۔ مگر عین محراب مسجد کے نیچے پیشوائی و امامت کیلئے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے" ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم لیکن ہم نے مسجدوں کی صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ مخدوم الملک نے جب ملا عبد النبی کو بر سر عروج و صدارت دیکھا تو ان کے رد میں ایک پوری کتاب لکھ ماری۔ اور ثابت کیا کہ اُن کے پیچھے نماز بھی درست نہیں۔ "تا بہ صدارت و شیخ الاسلامی چہ رسد؟ باپ نے عاق کر دیا ہے۔ اور مزید براں یہ کہ بواسیر خونی کا عارضہ ہے! خیر پہلی دلیل تو جیسی کچھ ہے ظاہر ہے لیکن دوسری دلیل بڑی ہی دلچسپ اور پر لطف رہی۔ یاران ظرافت پیشہ اس کو لے اڑے اور خوب خوب ستم ظریفیاں کی گئیں۔ اسی طرح یہ دونوں ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے، اور اسی میں دونوں کی چوریاں کھلتیں اور پردے فاش ہوتے گئے۔ حضرت امیر علیہ السلام نے جب یہ آیت کریمہ پڑھی اد قالت الیہود لیست النصاریٰ علیٰ شئی وقالت النصاریٰ لیست الیہود علیٰ شئی۔ تو فرمایا صدقتا۔ ہم دونوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ دونوں اپنے اس قول میں سچے یہی حال ان لوگوں کا ہے۔ یلعن بعضھم ببعض و یکفر و بعضھم بعضا ہم دونوں کی تصدیق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صدقتا!

فصل

طائفۂ مہدویہ اور شیخ عبداللہ نیازی و شیخ علائی رحمہا اللہ تعالیٰ کی یہ سرگذشت ہے جس کی جانب بہ ضمن حالات حضرت شیخ جمال الدین صاحب تذکرۃ الواصلین نے اشارہ کیا ہے، اور یہ حال ان کے مخالفین علی الخصوص مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری کا ہے جن کا ظلم و تعصب اُس عہد کے علماء حق و اہل اللہ کے عزم و ثبات کے لئے بڑی ہی جانکاہ و صبر آزما ابتلاؤں کا باعث ہوا۔ حضرت شیخ جمال الدین اور ان کے مرشد حضرت شیخ داؤد جہنی وال نے انہی لوگوں کی (یعنی اکابر مہدویہ کی) حمایت کی تھی، اور اسی لئے مخدوم الملک ان دونوں بزرگوں کی اذیت و مخالفت میں بھی کمر بستہ و سرگرم رہتے تھے، ہم نے قصداً اس جماعت کے حالات لکھنے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا۔ تذکرۃ الواصلین کی منقولہ عبارت ہیں یہ بات دیکھ کر بہت سی بے خبر طبیعتوں کو تشویش و حیرانی ہوتی کہ ان بزرگوں نے میر محمد جونپوری مدعی مہدیت کی ولایت و بزرگی کے اثبات میں کتاب لکھی، اور شیخ عبداللہ نیازی وغیرہ اکابر مہدویہ کے قتل و تکفیر پر مخدوم الملک کی کہ شیخ السلام وقت تھے، علانیہ مخالفت کی، اور اس طرح ایک بدعتی گروہ کا ساتھ دیا لیکن ان تمام حالات کے پڑھنے کے بعد ہر صاحب حق و انصاف اندازہ کر لے سکتا ہے کہ یہ گروہ کیسا تھا اور اس کے مخالفین علماء دنیا اور مشائخ سوء کا کیا حال تھا؟ اور ایک ایسے پاک نفس و پاک عمل اور مصلح عہد گروہ کی حمایت موجب قدح و سوءظن ہے، یا ان دونوں بزرگوں کی زندگی کا سب سے بڑا خدا پرستانہ و حق شناسانہ کارنامہ؟

کیا ان حالات کے ساتھ مخدوم الملک کا ان دونوں بزرگوں سے برسر پرخاش و عناد ہونا ذرا بھی تعجب انگیز ہو سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ جمال الدین اور شیخ داؤد رحمہما اللہ کے علم و عمل اور بزرگی و تقدس کے جو شواہد تاریخ میں موجود ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی ہمارے سامنے نہ ہوتا اور صرف اتنا ہی معلوم ہوتا کہ انہوں نے مخدوم الملک کی مخالفت اور شیخ نیازی و علائی کی حمایت کی تھی اور میر محمد جونپوری کی توصیف و توثیق میں علانیہ ایک کتاب لکھی تھی، تو انکی بڑی سے بڑی بزرگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ عظمت حقانی و عزت جاودانی کے لئے صرف یہی ایک واقعہ بس کرتا تھا۔ تم گذشتہ اوراق میں پڑھ آئے ہو کہ کیسا پر آشوب و پر امتحان وقت تھا۔ جوان بزرگوں کے حصے میں آیا؟ ہر طرف علماء سوء کی کثرت تھی، اور علی الخصوص مخدوم الملک کے دنیوی جاہ و جلال اور سطوت و قہرمانیت نے سب کی زبانوں کو گنگ اور گردنوں کو نیچا کر دیا تھا۔ بہت سے واقعات ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں مخدوم الملک کے خلاف کسی چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی زبان سے نکالنا موت کی دعوت اور تباہی کا بلاوا تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں۔ کہ نوجوانی میں ایک بار ابو الفضل کے ساتھ مخدوم الملک کے دربار مشیخت میں گیا۔ روضۃ الاحباب کی تیسری جلد سامنے دھری تھی۔ فرما رہے تھے کہ اس کے ہر لفظ سے بوئے رفض آتی ہے۔ "قرار دادہ ام کہ ایں جلد را بجضور شیعہ بسوزانم۔" مجھ کو اس وقت تک ان کے حالات کا پورا پورا علم نہ تھا۔ بے اختیار اتنی بات زبان سے نکل گئی کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں ہے۔ غالباً ان کے بیٹے کا لکھا ہوا ہے۔ نگاہ غضب سے میری جانب دیکھا اور کہا: "در دفتر اول و دوم نیز چیزہا یافتہ ام کہ دلالت بر رفض و فساد اعتقاد دارد و بر آں حواشی نوشتہ ام۔" ابو الفضل میرے پاس بیٹھے تھے۔ بار بار کہنیاں مارتے اور اشارہ کرتے کہ چپ رہو۔ باہر نکلے تو سب نے مبارک باد دی کہ تمہاری قسمت یاور تھی، بچ نکلے۔ بگڑ بیٹھتے تو تمہیں کون بچا سکتا تھا؟ اسی ایک واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مخدوم الملک کی ہیبت و رعب کا کیا حال تھا اور کس طرح انہوں نے اپنی مذہبی پیشوائی و ریاست اور شیخ الاسلامی کے زور سے تمام ملک کو اپنے قبضہ کر رکھا تھا؟ مخالفت تو بڑی چیز ہے۔ بڑے بڑوں کی

زبان ان کے آگے نہیں کھلتی تھی، اور اگر کھلتی تھی تو تباہی و ہلاکت سامنے کھڑی تھی۔ خود سلیم شاہ کا یہ حال تھا کہ ان کی طاقت سے لرزاں و ترساں رہتا اور ہمیشہ کہتا کہ بابر کے پانچ لڑکے تھے۔ چار چلے گئے ایک باقی ہے یعنی مخدوم الملک! دربار میں وہ جاتے تو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا اور دروازے تک پہنچانے جاتا۔ سید رفیع الدین محدث اور شیخ جلال تھانیسری کیسے جاہ جلال علم و بزرگی کے لوگ تھے، لیکن شیخ نیازی و علائی کے معاملہ میں باوجود حقیقت فہمی کے زبان نہ کھول سکے۔ بلکہ مناظرہ کی صحبت میں شریک مخالفین ہوئے۔ شیخ بڈھا کو سلیم شاہ اپنا پیر مانتا تھا۔ اگر وہ مخدوم کی مخالفت کرتے تو ان کے لئے کسی طرح کا خوف نہ تھا۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ جرأت نہ ہوئی اور ان کی تائید و توثیق ہی کرتے بنی۔ بڑی مصیبت یہ رہی کہ علماء دربار و حکومت جو کچھ کرتے ہیں، بادشاہ وقت کے نام سے۔ پس ان کی مخالفت گویا حکومت وقت کی بغاوت ہوتی ہے۔ ان تمام حالات کو سامنے لاکر غور کرو کہ اس عہد کی عالم آشوبی کا کیا حال تھا؛ کس طرح ہر طرف سکوت عن الحق کا سناٹا اور قبول باطل و اطاعت ظلم و طغیاں کی مردنی چھائی ہوئی تھی؛ اور جابروں کی ہیبت اور ظالموں کے جبروت نے کلمۂ حق کی گونج سے تمام فضا ہند کو خالی کر دیا تھا؛ ایک ایسے عزم شکن اور ایمان آزما وقت میں شیخ جمال الدین اور شیخ داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ حکومت وقت کی طاقت سے بے نیاز اور جبابرہ عہد کی خونخواریوں سے بے پروا ہو کر آگے بڑھے، اور اپنے عہد کے تمام مجمع حق شناسان کار کو راہ حق گوئی میں اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ انہوں نے نہ صرف حکومت وقت اور مخدوم الملک کی مخالفت میں صدائے حق بلند کی، بلکہ ارباب حق کی تائید میں علانیہ ایک کتاب بھی لکھی۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ ان مظالم کا نتیجہ حکومت کی تباہی ہے۔ اس واقعہ سے بڑھ کر ان بزرگوں کی عظمت جاودانی کے لئے اور کونسا واقعہ شاہد ثابت ہو سکتا ہے؟ اور اس کے بعد کونسی بات رہ جاتی ہے جس کی جستجو ہو؟ وقال صلعم: فضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جابر! (رواہ الترمذی وابو داؤد وابن ماجہ)

فصل

فی الحقیقت یہی وہ مقام منتہار درجۂ عزیمت وسبقت بالخیرات باذن اللہ ہے جس کو قرآن حکیم نے "عزم امور" سے تعبیر کیا ہے: وان ذالک لمن العزم الامور اور یہی وُہ طبقاتِ ثلاثۂ اعمال انسانیہ کا آخری اور اعلیٰ طبقہ ہے جو صرف وصول الی الحق ہی پر قانع نہیں ہوجاتا۔ بلکہ جادۂ حق میں سب سے آگے نکل جانا اور بڑھ جانا چاہتا ہے اور جس کا مرتبہ "اصحاب" اقتصاد" سے بھی مافوق وارفع ہے: فمنھم ظالم لنفسہ، و منھم مقتصد، و منھم سابق بالخیرات باذن اللہ اور یہی مقام ہے جو ایک دوسری تقسیم میں مرتبۂ "صالحین" سے مرتفع ہوکر مرتبۂ "شہدا" یعنی شاہدین حق تک پہنچا اور پھر "صدیقیت" تک پہنچ کر انسانیت کبریٰ کے آخری نقطۂ علو و ارتفاع، و مرکز دائرہ نوع، و مبدء کمال و ارتقاء بشری یعنی مقام نبوت سے ملحق ہوجاتا ہے کہ کائناتِ ارضی اور نوع انسانی میں جماعت "من انعم اللہ علیھم" ان چار قسموں سے باہر نہیں: من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن واولٰئک رفیقا۔ اور پھر یہی وہ مرتبۂ اعلیٰ اور درجہ کبریٰ منجملہ اقسام ثلاثہ "السابقون السابقون" کا ہے جو "اصحاب المیمنہ" سے بھی بلند تر ہے، اور سبقت، واقدام اور سابقیتہ و ارفعیۃ صرف اسی کے حصے میں آئی ہے: اولائک المقربون فی جنات نعیم ثلۃ من الاولین وقلیل من الاخرین اور بلحاظ اصل واساس تقسیم یہی وہ فرق ہے جس نے ایک دوسرے میدان میں اصحاب عمل کو دو جماعتوں میں منقسم کر دیا، اور دوسری نے پہلی سے ارفع و اعلیٰ مرتبہ پایا کہ لا یستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاھدون فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اور اگرچہ دونوں

جماعتیں مومنین صادقین کی ہیں، وکلا وعد اللہ الحسنی لیکن فضل اللہ المجاھدین علی القاعدین اجراً عظیما۔ کے مفاضلۂ مدارج و تفاوت و معارج کا قانون بھی قطعی و ناگزیر ہے اور سب سے آخر یہ کہ اسی عزیمت و اولیت اقدام کے بنیادی فرق نے "منفقون قبل الفتح" کو "الذین انفقوا من بعد" پر فضیلت بخشی کہ ساری بڑائی سب سے پہلے قدم اٹھانے والے کے لئے ہے نہ کہ دوڑتے ہوؤں کو دیکھ کر دوڑنے والوں کے لئے اگرچہ چلنے والے قدم بہرحال بیٹھے ہوؤں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قاتل، اولائک اعظم درجہ من الذین انفقو من بعد و قاتلوا، وکلا وعد اللہ الحسنیٰ"۔ اصل و بنیاد فرق مراتب و تقسیم مدارج کی ایک ہی ہے مگر اس نے علم و عمل کے مختلف میدانوں میں مختلف حیثیتوں سے مختلف ناموں اور صورتوں میں ظہور کیا ہے اور یہ جو کچھ کہا گیا باب اشارات سے ہے۔ و از قبیل اخذ مطالب کثیرہ بکلمات یسیرۃ و قلیلۂ ورنہ تقسیم طبقات و مراتب امت و اصحاب اعمال و دراست کا موضوع منجملہ معارف مہمۂ و غامضۂ کتاب و سنت کے ہے اور؛

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اسی فرق مراتب اور تفضیل اصحاب عزائم دعوت و مقومین حق علی اصحاب الرخص و ضعفاء الطریق کی طرف حدیث ابو سعید خدری (رض) عند مسلم میں اشارہ فرمایا، اور اس کو بھی آیاتِ کریمۂ متذکرۂ صدر کے ساتھ بہ یک نظر دیکھنا چاہیئے کہ من رأی منکراً فلیغیرہ بیدہ، وان لم یستطع فبلسانہ، وان لم یستطع فبقلبہ، و ذلک اضعف الایمان" تم میں سے جب کبھی کوئی شخص برائی کو دیکھے تو چاہیئے کہ اپنے ہاتھ سے کام لے کر اس کو دور کردے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے، اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو دل سے، اور یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے۔ پس اس حدیث میں بھی تین درجے فرمائے اور جس طرح آخری درجہ اضعف الایمان کا ہوا۔ اسی طرح پہلا درجہ اقوی و اکمل کمال مرتبۂ عزیمت دعوت کا ہوا۔ اس سے بھی

واضح تر حدیث ابنِ مسعود (رض) ہے کہ ما من نبی بعثه الله فی امته قبلی، الا کان له فی امته حواریون و اصحاب، یاخذون بسنته، ویقتدون بامره، ثم انها تخلف من بعدهم خلوف، یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون۔ فمن جاهدهم بیده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن۔ ومن جاهدهم بقلبه فهو مومن، ولیس وراء ذلك من الایمان حبة خردل" (مسلم) یعنی "سنت الٰہی یہ ہے کہ ہر نبی اپنے ساتھیوں اور تربیت یافتہ یاروں کی ایک جماعت اُمت میں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ جماعت حواری یا اصحاب کے لقب سے ملقب ہوتی ہے اور درس گاہ نبوت کی سب سے پہلی تعلیم یافتہ جماعت ہوتی ہے"[1]

---

(۱) یہی حق کو سب سے زیادہ اور سب سے پہلے پالینے والی اور قبول و وصول حق کی سب سے زیادہ استعداد رکھنے والی جماعت ہے جس کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں "صدیقین" سے بھی ملقب کیا ہے۔ اور جو جماعت ابرار کے بعد اصحاب الجنت و اصحاب المیمنہ و اصحاب النعیم اور اہل التقوی اور خیر البریہ کی اولین قسم ہے۔ نبوت کی قوت فاعلہ کے لئے صدیقیت کو ایک کامل قسم کا انفعال سمجھنا چاہئے۔ اسی لئے ہر نبی کے ساتھ سب سے پہلی جماعت صدیقین ہی کی ہوتی ہے، اور اسی طرح ہر داعی حق اور ہر کشف و ظہور حقیقت کے لئے ہمیشہ ایک گروہ ایسے اصحاب استعداد و صلاحیت کا ہوتا ہے۔ جو اوّل نظر میں حق کو پہچان لینے والا، اور سب سے پہلے حقائق و غوامض حقیقت مستورہ کو پالینے والا ہوتا ہے۔ اس کی فطرت جویائے طالب حق و حقیقت سے وہ مناسبت ہوتی ہے، جو لوہے کو مقناطیس سے ہے کہ مجرد تقابل و لقا بے اختیار اس کی طرف دوڑنا اور اس سے واصل ہو جانے کے لئے بالطبع و بالقوت ہر آن و ہر لمحہ مستعد و منتظر رہنا ہے:

آئینہ ما روئے ترا عکس پذیر است
گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست!

صدیقیہ کی مثال اُس نہایت قوی بصارت کی سی ہے۔ جو سب سے پہلے دور کی چیز دیکھ لیتی اور باریک سے باریک ذرہ کو ڈھونڈھ نکال لیتی ہے، حالانکہ دوسری کمزور آنکھیں اس وقت

دیکھتی ہیں جب وہ چیز بالکل سامنے آجاتی ہے یا اُجالا بہت زیادہ ہو چکتا ہے۔ یا صدیقین کے قلب کو تزکیہ فطرت و استعداد اثر پذیری کی وجہ سے ایک ایسا مصفا آئینہ تصوّر کرنا چاہئے جس میں جمال نبوت و حسن حقیقت سب سے پہلے پرتو افگن ہو جاتا ہے کیونکہ کمال جلا و صفا کی وجہ سے کوئی چیز انعکاس میں مانع نہیں ہوتی۔ وما احسن ما ینسب الی مجنون

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوی

فصادف قلباً خالیاً فتمکنا!

آئینے اور بھی ہزاروں ہوتے ہیں اور بوجہ آئینہ ہونے کے اصلاً انعکاس کے لئے مستعد، لیکن کثافت و زنگ کی وجہ سے فوراً عکس قبول نہیں کر سکتے اور کچھ عرصے کی صفائی و تزکیہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر زنگ و کثافت کی بھی مختلف حالتیں اور مختلف مراتب ہیں۔ کوئی آئینہ جلد صاف ہو جاتا ہے، کوئی بہت دیر میں، اور کسی کا زنگ اس درجہ تک پہنچ چکا ہوتا ہے کہ صاف ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، خدیجۃ الکبریٰ، سلمان فارسی، ابوذر رضی اللہ عنہم کے آئینۂ مجلےٰ و مصفیٰ نے کس طرح اوّل نظر ہی میں عکس قبول کر لیا تھا؟ یہ صدیقیت تھی۔ جو جمال نبوت دیکھتے ہی پکار اُٹھی: "واللہ ما ھذا بوجہ کذاب"! مولانا نے اسی مقام کی طرف اشارہ کیا ہے:

در دل ہر امتی کز حق مزہ ست

روئے و آواز پیمبر معجزہ ست!

لیکن بہتوں کا آئینہ مکدر تھا اور کچھ عرصے تک صاف ہوتے رہنے کی ضرورت تھی۔

خاطر کی رقم فیض پذیرد ہیہات　　　مگر از نقش پراگندہ ورق سادہ کنی!

کسی کو تھوڑا، کسی کو زیادہ، کسی کو بہت زیادہ وقت لگا، اور پھر کسی کے آئینۂ استعداد کے زنگ و تکدر کا یہ حال تھا کہ چودہ برس کے متصل جلا و صفائی سے بھی صاف نہ ہو سکا اور آئینہ کی جگہ پتھر اور لوہے کے حکم میں داخل ہو گیا۔ فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ۔ ابوجہل وغیرہ آخر تک کہتے رہے۔ ما لھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق؟ اور ان یتبعون الا رجلا مسحورا۔ اسی آخری مقام تقاوت کی نسبت وہ تمام تصریحات قرآنیہ ہیں جن میں سدِ باب ہدایت و عدم امید قبول حق و منتہا ظلمت و کوری کی خبر دی گئی ہے۔ اور اسی گروہ کا نام الاعمی اور شرالدواب

یہ لوگ نبی کی سنت کو قائم رکھتے اور ٹھیک ٹھیک اس کی پیروی کرتے ہیں یعنی شریعت الٰہی کو جس حال اور جس شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے، اس کو بعینہٖ محفوظ رکھتے اور اس میں ذرا بھی فرق آنے نہیں دیتے ہیں۔ لیکن ان کے بعد بدعات وفتن کا دور آتا ہے اور ایسے لوگ پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جو اسوۂ نبوت سے

اور الاموات اور الاضل ہے: ان شر الدواب عند اللّٰہ الصم البکم الذین لا یعقلون اور صم بکم عمی فھم لا یرجعون اور لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ الخ اور اولٰئک کالانعام بل ھم اضل اور وما انت بمسمع من فی القبور اور انک لا تسمع الصم الدعا اور اسی حالت کی نسبت اشارہ ہے فطبع علی قلوبھم فھم لا یفقھون یعنی طبع اللّٰہ بکفرھم اور کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون اور یہی چیز ہے کہ: ان اللّٰہ لا یھدی القوم الفاسقین لا یھدی ای لا ینظم ولا یبصر اور ومن لم یجعل اللّٰہ لہ نوراً فما لہ من نور؟ اور اسی بنا پر فرمایا کہ انک لا تھدی من احببت۔ ورنہ معلوم ہے کہ انک لتھدی الی صراط مستقیم وامثال ھذہ اکثیر فی الکتاب والسنتہ۔ اور یہ جو فرمایا کہ انک لا تسمع الصم الدعا اور ومن لم یجعل اللّٰہ لہ نوراً۔ تو اس کی تفسیر سورۂ انفال سے ملتی ہے۔ کہ: ولو علم اللّٰہ فیھم خیراً لاسمعھم ولو اسمعھم لتولوا وھم معرضون۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ جس طرح دنیا میں ہمیشہ ہر داعی صادق اور ہر کاشف حقیقت منہاج نبوت پر قطع طریق کرتا اور گویا جزء من اجزاء النبوۃ سے فیض یاب ہوتا ہے، اسی طرح ہر وہ گروہ جو دعوت حق پر سب سے پہلے لبیک کہتا اور رمز ظہور وکشف کا اولین شناسا و مصدق ہوتا ہے، مرتبہ صدیقیت کی استعداد سے حسب درجۂ و احوال حظ بردار و بہرہ ور ہوتا ہے، من حیث یدری ولا یدری۔ اصناف اربعہ" من انعم اللّٰہ علیھم" کے فیضان و برکات کا سلسلہ اناول نشئت انسانی الی یوم القیامۃ قائم و جاری ہے اور جماعت صدیقین و شہداء و صالحین سے کوئی عہد و دور خالی نہیں رہ سکتا کیونکہ نوع بشری کی قسم سعید و مفلح انہی اصناف میں محدود و محصور ہے۔ یہ مبحث منجملہ مہات مباحث قرآنیہ کے ہے اور الحمدللّٰہ کہ تفسیر سورۂ فاتحہ میں اس کے کمال وضوح و بیان پر یہ فقیر فضل الٰہی سے موافق ہوا۔

منحرف ہو جاتے ہیں۔ ان کا فعل ان کے دعوے کے خلاف ہوتا ہے اور ان کے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے شریعت نے حکم نہیں دیا، سو ایسے لوگوں کے خلاف جس کسی نے قیام حق و سنت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا، وہ مومن ہے، جو ایسا نہ کر سکا مگر زبان سے کام لیا۔ وہ بھی مومن ہے، جس سے جہادِ لسانی بھی نہ ہو سکا، صرف دل کے اعتقاد اور نیت کے ثبات کو ان کے خلاف کام میں لایا، وہ بھی مومن ہے، لیکن اس آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں حتیٰ کہ رائی برابر بھی ایمان نہیں ہو سکتا۔" تو اس حدیث میں بھی وہی تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اصحاب عزیمت کا، دوسرا اصحاب رخص کا، تیسرا ضعفا طریق کا وذالک اضعف الایمان اور اس آخری درجے پر ایمان کی سرحد ختم ہو جاتی ہے کہ: ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل! یہاں ذکر اگرچہ صرف مبتدعین و محرفین شریعت کے خلاف جہاد ید و لسان کا ہے، لیکن اصل تقسیم اس میں محدود نہیں مقصود نفس عزیمت و استبقة بالخیرات ہے۔ اور یہ کہ ہر میدان میں علم و عمل میں ایک درجہ عزیمت کا، ایک رخصت کا، اور ایک ضعف و انحطاط کا ہوتا ہے۔ البتہ اس تقسیم کا سب سے بڑا میدان عمل مقام دعوت و تبلیغ حق ہے، اور قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر، و مقاومہ مبتدعین فی الدین و اعداء حق و اسلام، و احیاء سنة و اخماد بدعت، و کشف و ابراز علوم حقہ نبویہ و غوامض و سرائر حکمة شرعیہ، کہ اسی وادی فصل او عقبہ آزمائش میں اصحاب طریق کے ادبار و اقدام کا فیصلہ ہوتا ہے، اور مدارج ایمانیہ و مراتب علمیہ و عملیہ کے جوہر کھلتے اور امتیاز پاتے ہیں۔ یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات۔

در مدرسہ کس را نہ رسد دعوئ توحید   منزل گہ مردان موحد سر دار است!

پس پہلا درجہ بہر حال ہے "السابقون السابقون" و "منفقون الاولون" اور "استبقون بالخیرات" و "مجاهدون بالعمل والجوارح" کا ہے جو جماعت "مقتصد" پر بھی شرف و

مزیت رکھتے ہیں، اور ضعفاء طریق تو ان کے جولان کمال کی گرد و غبار بھی نہیں پا سکتے۔ اور پھر جس طرح ہر قسم و جماعت میں حسب حال و استعداد فرق مراتب و معارج ہوتا ہے۔ اسی طرح سابقون بالخیرات کے بھی مختلف مراتب و مقامات ہیں۔ اور کتاب و سنت نے انکے حالات و علائم بتلائے ہیں۔ انا انجملہ سب سے اعلیٰ و اشل طبقہ ان اخص الخواص نفوس مزکی کا ہے جنکو قائد توفیق الٰہی و سائق فیضان ربانی عزائم امور کے لئے چن لیتا ہے کہ وان ذلک لمن العزم الامور اور جن کا نور علم و عمل مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ اور جن کا قدم طریق منہاج نبوت پر واقع ہوتا ہے۔ انہی افراد خاصہ کو حدیث بخاری میں محدث (بالفتح) کے لفظ سے تعبیر فرمایا، اور یہی مورد و مصداق حدیث مجدد کے ہیں جو مختلف طرق سے مروی اور اس لئے بلحاظ صحت متن اس کی صحت میں کلام نہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا وجود فی الحقیقت نظام حق و ہدایت کا متقوم و منظم ہے، اور انبیاء کرام کی اصلی وراثت انہی میں منتقل ہوتی ہے۔ البتہ یہ مقام از بس ارفع و اعلیٰ ہے، اور ہر عہد و دور میں صرف چند نفوس عالیہ ہی ایسے ہوتے ہیں۔ جن کا قدم ہمت امتحان گاہ مصائب و مہالک سے آگے بڑھکر وہاں تک پہنچتا ہے اور اپنے عہد کے سب سے بڑے عمل حق کو انجام دیدیتا ہے۔ اس کے لئے نہ تو مجرد علم و تدریس کتب کام آتی ہے نہ رسوم و ہیئات زہد و انقطاع، نہ مدارس و معاہد دینی کے غلغلہ و ہنگامۂ فضیلت کو اس میں دخل ہے اور نہ صومعہ و خانقاہ کے گوشہ نشینوں کو۔ انکے عہد میں علماء و اصحاب مشیخت کی کمی نہیں ہوتی اور کچھ یہ بات بھی نہیں کہ مدرسے اجڑ جاتے ہوں اور خانقاہیں منہدم ہو جاتی ہوں، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کثرت و شہرت کے لحاظ سے انکا زمانہ علماء و مشائخ امت کا سب سے بڑا مجمع و ماویٰ ہوتا ہے اور آبادیوں کی آبادیاں اصحاب علم و پیشوائی سے بھری نظر آتی ہیں، تاہم مقام عزیمت دعوت و قیام ہدایت کی ان میں سے کسی کو بھی توفیق نہیں ملتی۔ کوئی دامن رخصت میں پناہ لیتا ہے۔ کوئی گوشہ انزوا و انقطاع میں صرف اپنی عافیت و حفاظت ڈھونڈھتا ہے، کوئی راہ میں فتنہ و فساد کا شور سن کر صرف اسی کو کافی سمجھ لیتا ہے کہ اپنا دروازہ بند کرلے، کسی پر اضعف الایمان کا درجۂ تنزل و تسفل اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ زبان کو بحیر گنگ اور دست عمل کو یک قلم شل پاتا ہے

اور کسی کو نفس خلدع اور خاطر فاسد ضلالت جبلی ونفاق میں مبتلا کر کے سرگرم دنیا پرستی و دین فروشی کر دیتا ہے۔ غرضکہ سب کے سب یا ناچار مقام رخصت ہوتے ہیں یا درماندۂ ضعف و بیچارگی اور یا مدہوش غفلت وہوا پرستی، ان میں سے ایک حصۂ غالب تو علماء سوء اور دعات فتن ومنکرات کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے علماً وعملاً۔ اور جو جماعت علماء حق کی باقی بچتی ہے وہ بھی ضعف کدہ رخصت سے قدم باہر نہیں نکالتی اور حق پرستی کی بڑی سے بڑی بات اور تقویٰ و طہارت نفس کی بڑی سے بڑی فضیلت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اپنے قدم کو لغزش نہ ہو، اور جبکہ ایک دنیا امواج ظلمت وفساد میں ڈوب رہی ہے تو ہم کنارۂ سلامتی پر قدم جمائے باقی رہ جائیں۔ گویا ایمان کا جو سب سے ادنیٰ اور نچلا درجہ عامۂ ناس اور ضعفاء عمل کے لئے تھا، وہی خواص امت اور ہدات ومرشدین ملت کے لئے بلندی وعروج کا سب سے اونچا مقام ہو جاتا ہے اور سب سے بڑا متقی انسان وہ سمجھا جاتا ہے جس کے قدم "جہاد بالقلب" کی پائیں بساط سے پیچھے نہ ہٹیں لیکن کوئی نہیں ہوتا جس کا عزم ایمانی توقف وسکون کی جگہ طالب اقدام وسبقت ہو، جو اپنے نفس کی نجات کی جگہ جماعت و امت بلکہ نوع وارض کی نجات کا عشق رکھتا ہو، جس کا حوصلۂ کار اور عزم راہ صرف اتنے ہی پر قانع نہ ہو جائے کہ خود نہیں ڈوبا کیونکہ یہ تو ضعف وبیچارگی کا سب سے آخری درجہ ہے فضیلت وکرامت اس میں کیا ہوئی؟ بلکہ ہر وجود کا ڈوبنا اس کے لئے ماتم اور ہر قدم کی ٹھوکر اس کے لئے موت ہو۔ جبکہ دنیا اس کو سب سے بڑی بڑائی سمجھ رہی ہو کہ خود کنارے پر بچ جائیں، تو وہ بتلاوے کہ خود بچنا نہیں بلکہ ڈوبتے ہوؤں کو بچانے کے لئے سمندر میں کود پڑنا بڑائی ہے، اور جبکہ لوگ اپنے اپنے دروازوں کو بند کر رہے ہوں تاکہ راہ کے فتنہ وفساد سے محفوظ ہو جائیں، تو وہ اپنا دروازہ کھول دے اور دکھلاوے کہ بند کر کے چھپ رہنے میں فضیلت نہیں ہے بلکہ کھول کر باہر نکلنے میں، اور اگر باہر امن نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دروازہ کھول دینے کا اصلی وقت یہی ہے نہ کہ بند کرنے کا۔ مقام عزیمت ورخصت کا یہی وہ فرق ہے جو ایک صاحب دل نے خانقاہ کے گوشۂ عزلت سے نکل کر شیخ شیراز کو بتلایا تھا۔

گفت آں گلیم خویش بدر میبرد ز موج ۔۔۔ ویں سعی می کند کہ برآرد غریق را

تو اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ سنت الٰہی اپنی عادت جاریہ کے مطابق قیام حق و دفع باطل کے لئے سرگرم انبعاث و ظہور ہوتی ہے، اور توفیق الٰہی اپنے کسی اصلح و امثل بندے کے قلب کا عزیمت دعوت کے لئے انشراح کر دیتی ہے۔ اور اس کے قدم طریق کو منہاج نبوت پر ثابت و مستقیم فرما دیتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے تمام اصحاب علم و فضیلت اور ارباب صوامع و مدارس کو تنگنائے رخصت و ضعف میں پیچھے چھوڑ کر منزلوں آگے نکل جاتا ہے۔ فضائے علو و رفعت اُس کو اپنی طرف کھینچتی اور سمائے کمال و کرامت اپنی ساری بلندیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے دوڑتا ہے، گویا آسمان اس کے لئے اتر آتا ہے اور زمین اس کو خود بخود اچھالنے لگتی ہے۔ اُس کی ہمت رفعت طلب اور اس کا حوصلہ متصاعد و متعارج کسی بلندی پر بھی نہیں رکتا، اور اونچی سے اونچی بلندی کو بھی حضیض تسفل و تنزل سمجھتا ہے۔ مقام عزیمت دعوت کی جس بلندی تک بڑے بڑے کارفرمایان عہد کی نظریں بھی نہیں اٹھ سکتی تھیں اور ضعفا رزمان و بیچارگان رخصت کے وہم و گمان کو بھی اس تک بار نہ تھا، اُس کا شہباز ہمت اور سیمرغ عزم اس کی چوٹیوں پر بھی جا کر دم نہیں لیتا اور پیوستہ سرگرم بال افشانی و ہمدارہ صفیر زنان بلند پروازی رہتا ہے۔ ولسان حالہا ینشد بہذا البیت:

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغی کہ اسیر قفسی!

فصل

یہ جو تم ہر عہد ظہور اصلاح و دعوت میں دیکھتے ہو کہ ایک طرف تو ہزاروں علمائے ملت اور ارباب زہد و اطاعت موجود ہوتے ہیں، درس و تعلیم علوم، ہنگامہ مجالس

و مواعظ، غلغلۂ اذکار و اشغال صوامع و زوایا، اور زمزمۂ وطنین تسبیح و تہلیل مساجد و معابد میں بظاہر کسی طرح کی کمی نظر نہیں آتی، خانقاہوں میں مجاہدات و ریاضات کے حلقے قائم اور صحن مساجد میں تلاوت قرآن و وظائف و اوراد کی صدائیں سرگرم ہوتی ہیں، اور:

اما الخیام فانها کخیامهم

کا پورا پورا عالم نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی دوسری طرف:

وارہٰ نساء الحی غیر نسائها

کا یہ حال ہوتا ہے کہ ظلم و طغیان کا طوفان ہر چہار جانب سے محیط، شر و فساد کا ایک عالم رستخیز برپا، ظلمت بطلان و فتن ہر طرف چھائی ہوئی۔ نورِ حق و صداقت مستور و محجوب، بدعات و محدثات کی گرم بازاری، منکرات و سئیات کی کی مقبولیت و طلب کا دور دورہ، اہل حق و صدق مظلوم و مقہور، خدا کی زمین پر اس کے کلمۂ حق و عدل کا کہنا بمنزلہ جرم اور ظلم و عدوان کیلئے اجر و بخشش، اعمال و طاعات کی حقیقت بکلی مضمحل اور پژمردہ اور روح صلاح و خیر سے تمام اجسام و قوالب خالی! یہ سب کچھ علانیہ سورج کی روشنی میں ہوتا ہے، اور مدرسوں میں شور مچانے والے اندھے نہیں ہو جاتے اور نہ خانقاہوں میں چھپنے والے بہرے ہوتے ہیں۔ سب کی سر کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور اوپر کے کان کھلے، لیکن بحکم فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور دل کی بصیرت اس طرح اندھی اور عبرت کے کان اس طرح بہرے ہو جاتے ہیں کہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں مگر انکے لئے دیکھا ہوا ان دیکھا اور سنا ہوا ان سنا ہو جاتا ہے۔ دیکھنے پر بھی کسی کی زبان نہیں کھلتی اور سننے پر بھی کسی کا قدم نہیں اُٹھتا۔ نفس کا عشق اور زخارف تمتعات دنیوی کی شیفتگی اس طرح ان کے جسموں میں حلول کر جاتی ہے کہ ہمت کی روح اور عزم کی قوت کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ راہ عمل کا ہر تنکا ان کے لئے پہاڑ ہو جاتا اور جادہ ابتلا کا ہر کانٹا تیر و خنجر بنکر

اُن کو ڈراتا اور سہماتا ہے۔ وہ آنکھیں جن میں غمِ نفس اور ماتمِ دنیا کے لئے آنسوؤں کے دریا بند ہوتے ہیں، حق کی غمگینی اور امت کے ماتم کے لئے ایک قطرۂ اشک بھی نہیں رکھتیں اور جن دلوں میں عشقِ ذات اور محبتِ اہل و عیال کے لئے ایک عالمِ شورش اور طوفانِ اضطراب مخفی ہوتا ہے، اس میں اللہ اور اس کے کلمۂ حق کے عشق کے لئے درد کی ایک ٹیس اور غم کی ایک چبھن بھی پیدا نہیں ہوتی۔ عین اس وقت جبکہ زاہدانِ شب زندہ دار راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر تسبیحِ ہزار دانہ کو گردش دیتے ہیں، تو لاکھوں بندگانِ الٰہی مظلومیت کی گرد و خاک پر لوٹتے اور تڑپتے ہیں، اور کلمۂ حق کی بےکسی و بیچارگی سے الغیاث! الغیاث! اعینونی یا عباد اللہ! اعینونی یا عباد اللہ! کے نالہ و بکا کی صدائیں اٹھتی ہیں۔ اور جبکہ حلقۂ مدارس و مجامع تعلیم میں کتبِ فقہ کے ابوابِ قضا و ولایت کے نکات و دقائق حل ہوتے اور صحائفِ حدیث کے ابوابِ اعتصام بالسنت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرح و تفسیر میں مدعیانِ فضل و کمال اپنا اپنا جوہرِ علم و تبحر دکھاتے اور معارکِ مباحث و مطالب کو سر کرتے ہیں، اور مجالس و محافلِ وعظ میں غلغلۂ اعملوا و تذکروا! و قال اللہ و قال الرسول پیہم بلند ہوتا اور سامعین کے سروں کو جنبش میں اور دلوں کو شورش میں لاتا ہے، تو عین اُسی وقت کفر و ضلالت اور بدعات و منکرات کے غلبہ و قہر سے ارضِ الٰہی کا ایک ایک کونا چیختا اور چلاتا ہے، پرستارانِ حق کی غربت ہر طرف سر پیٹتی اور ماتم کرتی ہے، خدا کی زمین کے گوشے گوشے سے واشوقیتا! وادینا! وامصیبتا! وادیلا! کی فریادیں اٹھ اٹھ کر آسمان تک جاتی ہیں، اور فضائے کائنات کا ایک ایک ذرہ داعیِ حق کے لئے روتا اور قائمِ ہدایت کو کھوجتا ہے اور پکارتا ہے:

یا ناعی الاسلام قم وانعہ

قد زال عرف و بدا منکر!

لیکن نہ تو عباد و زہاد وقت کو تسبیحِ ہزار دانہ کی گردش مہلت ساعت دیتی ہے اور نہ ہنگامہ سازانِ مدارس و مجامع کو اساطیرِ جدل و خلافات و دساتیرِ قیل و قال کا شور و غوغا فرصت

بصارت، اصل حقیقت سے اِس درجہ بعد و بجبر بلاری ہوجاتا ہے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی احیاء شریعت و تجدید ملت کا خطرہ نہیں گذرتا، اور کوئی نہیں سوچتا کہ یہ سارے کارخانے اور ہنگامے تو اس لیے تھے کہ لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا سو جب وہی سرنگوں ہوگیا تو پھر ان اجساد بے روح وقشور بے مغز کی پرستش کیا سود مند علم و عمل ہوسکتی ہے؟ اور جب روح امت مضمحل ہوگئی اور حق کی جگہ باطل کی اور سنت کی جگہ بدعت کی حکومت چھاگئی تو پھر یہ تمام باتیں کب مثمر و منتج ہوسکتی ہیں؟ بلکہ ان کا شمار تو اب موانع و مہالک راہ میں سے ہوگیا

من لم یکن للوصال اھلا

فکل طاعاتہ ذنوب!

غرضکہ اگرچہ دنیا بظاہر علم و فضیلت سے لبریز ہوتی ہے اور بڑے بڑے اصحاب طنطنہ و شہرت و ارباب تمغنہ و عظمت موجود ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو اس کی توفیق نہیں ملتی کہ اپنے عہد و دور کی طلب دعوت اور سوال قیام ہدایت پر مردانہ وار لبیک کہے، اور ظلمت کدۂ ضعف و واماندگی سے نکل کر راہِ عزیمت دعوت میں قدم رکھے اور اگرچہ دروازۂ سعادت الٰہی باز اور خزائن رحمت و نصرت ربانی ہموارہ در صدد بخشش و لغیما ہوتے ہیں مگر سینکڑوں ہزاروں علماء عہد اور اصحاب خوانق و صوامع میں سے کسی کو بھی اُس عہد کے احیاء و تجدید اور طائفہ منصورہ "من یجدد لھا دینھا" میں داخل ہونے اور جماعت علیہ یحبہم و یحبونہ میں معدود و محشور ہونے کی توفیق نہیں ملتی: تا آنکہ پردۂ ظلمت چاک ہوتا اور یکایک صبح ہدایت و سعادت مشرق تجدید و انبعاث سے عالم افروز و جہاں تاب ہوتی ہے۔ تو اس وقت تم دیکھتے ہو کہ جس راہ میں قدم رکھنے سے ایک عالم درماندہ و ناچار تھا، اچانک ایک مرد ہمت اُٹھتا ہے اور نہ صرف قدم رکھتا ہے بلکہ دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے راہ کی وہ مشکلیں اور صعوبتیں جو ضعفاء عہد کیلئے مصیبتوں کا پہاڑ اور ہیبتوں اور دہشتوں کی گھاٹیاں تھیں، اور جن کے وہم و تصوّر سے بیچارگان وقت کی ارواح

پر ایسی وحشت و ہیبت طاری ہو جاتی تھی کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون، تو وہ سب اس کے جولان قدم کے لئے ایک مشت غبار اور ایک توده خس وخاشاک سے زیادہ حکم نہیں رکھتیں یہ سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اور وہ بڑھ کر عزیمت دعوت و ہدایت عامہ کا باب مسدود کھول دیتا ہے، اور اس کی زبان ہمت و مقال فتوت اس ترانۂ رجز سے زمزمہ ساز بزم عالم و عالمیاں ہوتی ہے

تاب یک جلوہ نیا درد نہ موسٰی و نہ طور

ایں دلم ہست کہ رنگینئ ہزاراں بدست!

اگرچہ اُس عہد میں ہزاروں مدعیان کار موجود ہوں، مگر اس فضیلت مخصوص میں اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہوتا۔ صرف اسی کو اُس عہد کی اقلیم ہدایت کی سلطانی و فرمانروائی پہنچتی ہے اور صرف وہی اپنے زمانے کا کلید بردار خزائن برکات و فیضان سماویہ ہوتا ہے۔ تمام اصحاب طریق ناچار ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے چراغ اُسی مصباح ہدایت سے روشن کریں، اور تمام رہروان جادہ مقصد مجبور ہوتے ہیں کہ اسی کے کاروان فضل و قافلۂ کرامت کی آواز درا پر اپنے اپنے قدم اٹھائیں۔ وھذہ منزلۃ جلیلۃ ورتبۃ عظیمۃ لا تساویھا مرتبۃ ولا تعادلھا منزلۃ وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

فصل

اور یہ جو کہا کہ ہر عہد میں اللہ تعالیٰ کسی ایک بندے یا چند بندوں ہی کو مقام عزیمت دعوت کے فتح باب کی توفیق دیتا ہے اور وہ اپنے دور کے خزائن فیضان و برکات کا صاحب مفاتیح ہوتا ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اس عہد میں بجز ایک زبان کے کلمۂ حق کی دوسری زبان پر جاری نہیں ہوتا، یا اُس عہد میں اور کوئی دعوت و تبلیغ حق کے لئے ساعی و جاہد

نہیں ہوتا۔ کیونکہ بحکم "لا یزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لا یضرھم من خذلھم حتی یاتی امر اللہ وھم غالبون" (اوکما قال) سخت سے سخت عہد شر وفساد اور ظلمت وضلالت میں بھی ایک جماعت اہلِ حق وظاہرین علی الحق کی ضرور باقی رہتی ہے اور یہ اس عزیز العلیم کی تقدیر اور فطرت کائنات کے داعیہ ومقتضیٰ کے خلاف ہے کہ کوئی زمانہ اور کوئی گوشہ اہلِ حق سے بالکل خالی ہو جاتے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ انبیا کرام کے ظہور کے وقت بھی باوجود ظھر الفساد فی البر والبحر، بما کسبت ایدی الناس کے ایک جماعت اہلِ حق کی ضرور باقی رہتی تھی۔ اگرچہ ان کا ظہور کرۂ ارضی کے کمال بغی وفساد اور منتہا مرتبہ یاس وقنوط کی حالت میں ہوا کرتا تھا خود قرآن حکیم نے جابجا اس کا اعتراف کیا ہے، فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیۃ ینھون عن الفساد فی الارض، الا قلیلاً ممن انجینا منھم؛ اور سورۂ مائدہ میں ہے کہ باوجود علماء یہود کی سخت وہمہ گیر ضلالت ومغضوبیت کے ایک قلیل جماعت ان میں بھی داعیان حق وآمرین بالمعروف کی برابر موجود رہی: لولا ینھاھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت اور آل عمران میں ہے لیسوا سواء، من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون آیات اللہ اناء اللیل وھم یسجدون۔ یؤمنون باللہ والیوم الاخر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویسارعون فی الخیرات واولئک من الصالحین۔ اور اسی طرح غالباً سورۂ مائدہ میں ایک جگہ خاص طور پر علماء یہود کے شر وفساد کا ذکر کر کے فرمایا۔ منھم امۃ مقتصدۃ وکثیر منھم ساء ما یعملون۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ اقوام وملل کے سخت سے سخت دورِ ظلمت وفساد میں بھی ایک جماعت داعیان حق کی ضرور باقی رہتی ہے اور گو علماء اہلِ کتاب کی گمراہی کمال مرتبۂ بغی وعدوان تک پہنچ چکی تھی۔ تاہم ان میں بھی ایک جماعت قلیلہ ایسی موجود تھی جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں کوشاں، تلاوت کتاب اللہ میں سرگرم اور خیرات وطاعات میں تیز گام تھی اور قرآن حکیم ان کو صالحین

میں سے شمار کرتا ہے اور اسی طرح بخاری کی روایت میں ہے۔ "فمقتھم عربھم وعجمھم الا بقایا من اھل الکتاب" یعنی اسلام کے ظہور کے وقت تمام عرب و عجم اپنے کفر و ضلالت کی وجہ سے مستحق غضب و عقوبت الٰہی ہو رہا تھا مگر ایک چھوٹی سی جماعت جو اہل کتاب کے اہل حق کا بقایا تھی اور مختلف گوشوں میں مٹی مٹائی اور بچی بچائی باقی رہ گئی تھی۔[1] اس سے واضح ہوا کہ خاتم الادیان کے ظہور کے وقت بھی کہ کرۂ ارضی کی ضلالت عامہ کا سب سے بڑا تاریک عہد تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ داعیانِ حق بالکل معدوم

---

[1] یہی ارباب حق کا بقایا اور اہلِ کتاب کی باقیۃ الصالحہ جماعت تھی جس نے موحدین عرب کی طرح ظہورِ اسلام پر سب سے پہلے لبیک کہا تھا اور جس کی۔ استعداد قبولِ حق کا یہ حال تھا کہ: واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تریٰ اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق، یقولون ربنا اٰمنا فاکتبنا مع الشاھدین" اور حق و صدق کا یہ بقایا بمقابلہ یہود کے نصاریٰ میں زیادہ تھا اسی لئے اس آیت کریمہ سے پہلے فرمایا: لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا، ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ ذٰلک بان منھم قسیسین و رھبانا و انھم لا یستکبرون، واذا سمعوا ما انزل الی الرسول۔ الخ۔ پس یہاں نصاریٰ کے اقرب فی المودۃ ہونے سے مقصود صرف یہ ہے کہ ان کے رہبان و قسیسین میں قبولیت اسلام کی استعداد بمقابلہ یہود زیادہ تھی اور اس لئے جب کلامِ حق سنتے تھے تو عدی بن حاتم جیسے اصحاب استعداد چشم پر آب ہو کر پکار اُٹھتے تھے: ربنا اٰمنا فاکتبنا مع الشاھدین۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ بمقابلہ تعصب و قساوت و استکبار و غرور یہود، یہ استعداد اس عہد کے بعد بھی نصاریٰ میں عام طور پر زیادہ پائی گئی اور آج بھی موجود ہے۔ لیکن وہ مقصود نہیں ہے جو موجودہ عہد کے بعض دعاۃ فتن و مجددین تحریف شریعت نے بسبیل ابتغاء مرضات النصاریٰ پہلے پہل اپنے بعض کتب و رسائل میں لکھا اور اسکے بعد عام طور پر تمام اہل تحریر و تقریر بطور ایک مسلم و معروف مسئلہ شریعت کے اس آیت سے ولایت و موالات نصاریٰ پر استدلال کر رہے ہیں اور لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء، اور ومن یتولھم منکم فانہ منھم اور لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین، وامثالہا کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنا قطعاً و صریحاً تحریف ہے اور یحرفون الکلم عن مواضعہ میں داخل۔ اگرچہ آجکل کے علماء سوء و دجاجلہ شر و فساد و احبار و رہبان امت نے شل تاور بہت سی تحریفات کے اس تحریف پر بھی گویا اجماع کر لیا ہے "لیشتروا بہ ثمنا قلیلا، فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون"۔

ہو گئے ہوں۔ ایسا ہونا سنت الٰہی کے خلاف ہے اور اس کی مزید تشریح کا یہ موقعہ نہیں

پس جب انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کے ظہور کے زمانوں میں بھی داعیانِ حق و آمرین بالمعروف و سارعون فی الخیرات سے قوم و ملک بالکل خالی نہیں ہو جاتا اور کچھ بقایا اربابِ حق کا موجود رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے اتباع و ذریات اور ورثاء و نقباء کے لئے کہ اصحاب عزیمت دعوت و مجددین امت انہی سے عبارت ہیں۔ ایسا ہونا کیوں ضروری ہو؟ اس اصل الاصول کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ دعوت و قیام حق اور اصلاح و تربیت امم کا اصل سرچشمہ و مرکز مقام نبوت ہے اور ہر عہد و دور میں اس کا جس قدر بھی ظہور ہوتا ہے۔ وہ سب اسی مقام سے ملحق و متصل اور سب کی روشنی اسی شمس نظام و قوام عالم سے مکتسب و مستنیر، اور تمام انہار فیضان و سعادت کے لئے بھی سلسبیل نبوت مخرج و منبع کا حکم رکھتی ہے: عیناً یشرب بھا عباد اللہ یفجرونھا تفجیرا۔ اور کوئی قائم حق و داعی اصلاح و کاشف حقائق فوز و نصرت نہیں پا سکتا جب تک اس کا قدم منہاج نبوت پر واقع نہ ہوا ہو اور اس کے تمام اعمال متاسی باسوۂ حسنۂ نبوت و متبع بہ سنت و حکمت رسالت نہ ہوں اور اس راہ تاسی و تشبہ بالانبیاء میں جس داعی حق کا قدم جس حد تک پہنچتا ہے۔ اسی حد و مقام کے مطابق کم و بیش ثمرات و برکات ظاہر و باطن حاصل ہوتے ہیں اور جس طرح وہاں اختلاف مدارج و مراتب بلحاظ حالات و مقتضیات وقت، اور فضلنا بعضھم علی بعض کا معاملہ واقع ہوا۔ اسی طرح متبعین و ورثاء انبیاء میں بھی فضلنا بعضھم علی بعض اور اختلاف مراتب و ثمرات و مفاضلۂ حالات و برکات ظہور میں آیا۔ یہی حقیقت شیخ اکبر کی اصطلاح میں "فصوص" اور بعض اصحاب اشارات کی اصطلاح میں "نسبت" کے لقب سے ظاہر کی گئی ہے کہ کسی واصل باللہ کا قدم تاسی و اتباع حسب استعداد و داعیاتِ وقت کسی ایک نبی کی منہاج پر واقع ہوتا ہے اور کسی کا کسی دوسرے نبی کی منہاج پر، اور اس کو بوجہ غلبۂ مابہ الاختصاص اس نبی سے ایک خاص طرح کی نسبت حاصل ہو جاتی ہے:

وللناس فی ما یعشقون مذاہب!

اور پھر یہ بھی ہے کہ کسی کا قدم جامعیت فص محمدی کا تعاقب کرنا اور مقام جامعیت کبریٰ اور:

انچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری!

کے اکتساب فیضان سے ایک کیفیت بوقلموں اور جلوہ حسن صد رنگ و گوناگوں پیدا کرتا ہے۔ ساری نزاع مصطلحات و الفاظ کی ہے۔ حقیقت بحکم:

عباراتنا شتی وحسنک واحد!

ایک ہے اور کوئی نہیں کہ پردہ برانداز ظواہر و الفاظ و رسوم ہو، اور نزاع صورت پرستان معنی ناآشنا کو ختم کر دے:

برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے رامی پرستند!

جب دعوت و اصلاح امت کا سرچشمہ و اصل مقام نبوت ٹھہرا اور تمام عوازم امور دعوت اسی سے ماخوذ اور اسی کے اسوہ سے مناسی، تو ضرور ہے کہ عالم تجدید و احیاء شریعت کے بھی تمام کاروبار اسی اسلوب و نہج پر واقع ہوں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اصول و اساسات سے لے کر جزئیات و فرعیات اعمال تک ٹھیک اسی مقام کے حالات و منازل سے متشبہ و متعلق بل کالظل والعکس ظہور میں آئیں اور منجملہ سنن و نوامیس انبعاث نبوت کے یہ ہے کہ دعوت انبیاء کے ظہور کے لئے حق مذکر حق کا بالکل مفقود و معدوم ہو جانا ضروری نہیں بلکہ اس قدر بس کرتا ہے کہ سخت درجہ اضمحلال اور پژمردگی کی حالت اس پر طاری ہو جائے اور داعیان حق کی جماعت نہایت قلیل و مغلوب ہو۔ بجز یکہ چند منتشر و نادر افراد کے سوا اُن کی کوئی ہستی اور جمعیت باقی نہ رہے۔ برخلاف اس کے داعیان فساد و ضلالت کا ہر طرف دور دورہ ہو اور وہ جو ایک چیز ہے یعنی صرف حق کا وجود ہی نہیں بلکہ حق کا قیام و ظہور و نفوذ، اور مجرد امر و دعوت ہی نہیں بلکہ دعوت کا نظام و قوام اور محض دعوت افراد و جماعت ہی نہیں بلکہ دعوت امت و ملت، تو اس کا

کارخانہ بالکل درہم برہم ہو جائے بلکہ نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ کانہ لم یکن شیئاً مذکورا۔ یہی غربت و اقلیت حق ہے جو بسبب کمال ضعف و بیچارگی و عدم حصول نتائج مطلوبہ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے اور جب غایت درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تو ظھر الفساد فی البر والبحر سے تعبیر کی جاتی ہے پس جب انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت اصلیہ و اساسیہ کا یہ حال ہوا اور ہنگام ظہور ایک جماعت قلیلہ دعات حق کی موجودگی ان کے مقام دعوت و تبلیغ کی اساسیت و اولیت کے منافی نہ ہوئی۔ تو ظاہر ہے کہ مجددین امت و نقباء و ورثاء نبوت کے مرتبۂ تجدید کے لئے یہ امر کیوں منافی ہو؟ اس عالم کے معاملات بھی تبعاً و فرعاً ویسے ہی واقع ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس عہد میں حق کی دعوت و تبلیغ کرنے والے بالکل نہ ہوں۔ یا نفس دعوت میں ان کا اور کوئی سہیم و شریک نہ ہو۔ ہوتے ہیں۔ لیکن یا تو ان کی جماعت بہت ہی قلیل و درماندہ اور بجال خود مبتلاؤ گم ہوتی ہے یا دعوت حق کے اعمال بغایت محدود و محصور ہو جاتے ہیں۔ یعنی اربابِ دعوت کی پستی ہمت، بلندی و وسعت میدانِ عمل سے گھبراتی اور اس کے لئے اپنے کو درماندہ پاتی ہے۔ اور محض ایک محدود دائرہ دعوت پر قناعت کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہر چیز کی طرح اس کے بھی مراتب و مدارج، اور گو ہر مرتبہ اس میں داخل لیکن ہر مرتبہ کا حکم دوسرے سے مختلف۔ اپنے پڑوسی کو برائی کرتے دیکھ کر ٹوک دینا بھی نہی عن المنکر ہے، تمام شہر کو برائی سے باز رکھنے کے لئے کھڑے ہو جانا بھی نہی عن المنکر ہے، اور پھر عالم تقیید و تحدید سے آزاد ہو کر اپنے تمام عہد و دور کے شر و فساد کو دور کرنے کے لئے بلا امتیاز قرب و بعد و یمین و یسار و مشرق و مغرب غلغلۂ عمل بلند کرنا بھی نہی عن المنکر ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے راستہ سے پتھر ہٹا دینا بھی ایمان کی شاخ اور عمل حق، مگر تمام امت کی راہ سے سنگ بطلان و فساد کو دور کر دینا بھی عمل ایمان و اقدام حق ہے، پھر کیا ان تمام مراتب کا ایک ہی حکم ہو سکتا ہے؟ کجا وہ مقام ارفع و اعلیٰ جہاں ایک عالم و امت کی اصلاح کے لئے قدم اٹھائے جائیں؟ اور کجا وہ تنگنائے ضعف

جہاں صرف اپنے پڑوسی کی اصلاح ہی پر قناعت کر لی جائے؟ اگرچہ وکلا وعد اللہ الحسنیٰ اصلاح دونوں ہیں، اور دونوں کے لئے اجر، لیکن پہلا منصب نبوت کی شاخ اور دوسرا افرادِ امت میں سے ایک فرد مومن صالح کا مرتبہ اور بس۔ پس یا تو دعوتِ حق کا سلسلہ موجود ہوتا ہے مگر ایک محدود دائرہ سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ یا ایسا ہوتا ہے کہ دعوت کی صدائیں بڑی ہی دھیمی اور پست ہوتی ہیں اور ان میں وہ گرج اور کڑک نہیں پائی جاتی جس کے بغیر سرشارانِ غفلت چونک نہیں سکتے، اس لئے گو اُٹھتی رہتی ہیں لیکن اپنے عہد کو چونکا دینے کا شرف حاصل نہیں کر سکتیں یا ایسا ہوتا ہے کہ نفوذ دعوت و سربانِ امر کے لئے ضروری ہے کہ دعوتِ حق میں ایک ایسی ہمہ گیر جاذبیت و جالبیت ہو جو ایک عالم کے دلوں کو لبھائے اور ایک دنیا کو اپنا فریفتہ و دل دادہ بنا دے حتےٰ کہ سامع و شاہد کی طاقت سے باہر ہو کہ اس کی کشش سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ بغیر اس خاصہ کے دعوت کبریٰ قائم و نافذ نہیں ہو سکتی، لیکن ایسا ہوتا ہے کہ دعوت حق کی صدائیں تو اُٹھتی ہیں مگر اس جاذبیت معنویہ سے محروم ہوتی ہیں اور اس لئے محبوب القلوب عالم نہیں ہو سکتیں۔ یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ بمصداق خلطوا عملاً صالحاً وآخر سیئاً داعیانِ حق کا جو گروہ موجود ہوتا ہے، ان کی دعوت ٹھیک ٹھیک نہج قویم و مستقیم پر نہیں ہوتی یعنی منہاج نبوت کے علوم و اعمال کو ان میں غلبہ و احاطہ حاصل نہیں ہوتا، یا کتاب و سنت کی دعوت خالص و بے آمیزش کی حقیقت سے خالی ہوتی ہیں۔ پس اگرچہ اس لحاظ سے کہ اصلاً طلب حسنات و اصلاح اور قیام شریعت پر مبنی ہیں۔ وہ دعوۃ الی الحق و امر بالمعروف کے حکم میں داخل ہو جاتی ہیں مگر ساتھ ہی اس اعتبار سے کہ طرح طرح کی غلطیوں اور لغزشوں، یا آمیزش ظلمت رائے و قیاس غیر صالح، یا کوری بدعات و محدثات سے پاک و صاف نہیں ہیں۔ اپنا حکم و اثر کھو دیتی ہیں اور برکات نصرت و فوز حاصل نہیں کر سکتیں۔ مثلاً اصل کی جگہ کسی ایک ایسی فرع کی حفاظت کو عزیمت دعوت سمجھ لیا جو بوجہ فقدان ضیاع اصل بالفعل ناقابل

اعتنا تھی۔ یا سلسلہ سفر صحت تعیین منازل و تقرر بدایت و نہایت کے ساتھ شروع نہیں کیا۔ مثلاً جس منزل سے سفر کا آغاز ہونا چاہیئے۔ اس کو درمیانی سمجھ لیا جائے یا آخری منزل، کہ ان حقائق کار کا علم بلا مقام تشبہ بالانبیا و تخلق باخلاق الاصفیاء کے حاصل نہیں ہو سکتا اور یہی وہ غوامض اعمال نبوت ہیں جن کی طرف بعض صحابہ و تابعین اشارہ کر کے کہہ دیا کرتے تھے کہ "وذالک من عمل النبوۃ" یا اس سے بھی بڑھ کر مصیبت یہ کہ گو دعوۃ الی الحق کے لئے قدم اٹھا مگر سنت کی روشنی کی جگہ بدعت کی اندھیاری چھا گئی۔ یا اقلاً طریق کار بدعت کی آمیزش سے محفوظ نہ رہا اور اگر اللہ تعالیٰ نے فہم واسع و سلیم عطا فرمایا ہے تو سمجھ لوگے کہ یہ آخری سبب بڑوں بڑوں کے لئے مذلت اقدام ہوتا آیا ہے اور ایک علت تو یہ ضیاع قوائے عمل و کاروبار دعوت و تبلیغ کی صدیوں سے یہی چیز رہی ہے۔ یا دعوت و تبلیغ کے بلند مقامات کی طرف ایسے نوآموزانِ راہ اور خام مغزان کار نے قدم اٹھایا جو گو اپنے دلولوں اور نیتوں کے لحاظ سے مستحق تحسین ہیں۔ لیکن اس مقام کے لئے جس قوت علمی و عملی کی ضرورت ہے اور جس ثبات قلب و رسوخ عزم کی، وہ ابھی اُن سے منزلوں دور ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو اول قدم ہی میں ٹھوکر لگتی ہے، یا پہلے تیر ہی پر میدان کارزار کو پیٹھ دکھلا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ راہ ہے کہ یہاں کی ایک ادنیٰ لغزش بسا اوقات ہزاروں انسانوں کی مجموعی معصیت و ذنوب سے بھی بڑھ کر مضرت رکھتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسافر کو تلووں سے کانٹا نکالنے کی بھی مہلت نہیں دی جاتی، کیونکہ ممکن ہے کہ اتنی ہی دیر میں قافلۂ امید قرنوں بلکہ صدیوں کی مسافت آگے نکل جائے اور ایک لمحہ کی غفلت برسوں کے لئے یاس و ماتم کا سامان کر دے۔ ملک قمی اسی حقیقت کو شاید نادانستہ کہہ گیا ہے۔ فیضی نے اسکے تمام کلام میں سے اسی ایک شعر کو منتخب کیا۔ اور سبحان اللہ کہ اپنے حسن انتخاب اور ذوق سلیم کا کیسا مرقص ثبوت دے گیا۔!

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد!

وازالہامات شعریۂ عرفی چہ ملیح ست ایں فرد دریں مقام :

ہاں رہِ عشق ست، کج گشتن نہ دارد باز گشت

جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!

غرضیکہ ایک چیز دعوت ہے، ایک عزیمت دعوت اور ایک عزیمت دعوت کا درجۂ تجدید و مقام قیامِ دعوتِ عامہ۔ اور ایک مقام اصلاحِ افراد کا ہے۔ ایک عائلۂ و جماعت کا، اور ایک امت و نوع کا، سو اگرچہ دعوت موجود ہوتی ہے مگر عزیمت دعوت مفقود ہو جاتی ہے اور اگرچہ اصلاح افراد کا سامان ہوتا ہے مگر اصلاح امت کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ اگرچہ چند اصحاب عزائم ہوتے بھی ہیں تو اسباب و موانع مذکورہ سے درجۂ تجدید و کمال عزیمت دعوت تک اُن کی رسائی نہیں ہوتی۔ کاروبارِ دعوت کے کالبد و اشکال تو موجود ہوتے ہیں مگر روحِ فتح و نصرت مفقود ہو جاتی ہے اور اس لئے معاملہ تجدید و احیاء امت اپنے کشود کار کے لئے کسی مردِ غیب کا منتظر ہوتا ہے۔

عشق اگر مرد ست، مردے تاب دیدار آورد

ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد

یہی وجہ ہے کہ جا بجا "عزیمت دعوت" کا لفظ بولا گیا نہ کہ مجرد دعوت کا۔ دونوں میں فرق و امتیاز ملحوظ خاطر رہے۔ پس اپنے عہد کا مجدد و محی الملت وہ شخص یا وہ چند نفوسِ خاصہ ہوتے ہیں جو مجرد دعوت نہیں بلکہ عزائم امورِ دعوت کی راہ میں قدم اُٹھاتے ہیں اور قیام حق کا صور اس زور سے پھونکتے ہیں کہ یکایک فضاءِ ملت جنبش میں آجاتی ہے اور تمام امواتِ غفلت اپنی اپنی قبروں کے اندر چونک اُٹھتے اور اٹھ کر دوڑنے لگتے ہیں۔ گویا یخرجون من الاجداث کانھم جراد منتشر مھطعین الی الداع امرذالک یوم الخروج کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام مخصوص ہے جو ہر عہد میں صرف ایک یا چند افرادِ عالیہ ہی کے حصّے میں آتا ہے اور گو کاروبارِ دعوت سے معاملات رکھنے والے بہت سے موجود ہوں مگر اُس عہد کے فتح باب اور سلطان وامر دعوت کی فضیلت

ان کو نصیب نہیں ہوتی۔ سب ناچار ہوتے ہیں کہ اس فاتح عہد اور عازمِ وقت ہی کے حلقۂ اتباع و ذریات میں داخل ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں بعض افراد کسی خاص شاخ علم و عمل میں درجۂ بلند رکھتے ہوں، مگر اس معاملہ کے لئے وہ کچھ سودمند نہیں ہوتا اور فاتح دور کے آگے ان کو اطفال مکاتب کی طرح زانوئے ادب و استفادہ تہہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس عہد کے خزائن فیضان و برکات کی کنجی اسی کے قبضہ میں دے دی جاتی ہے، پس طالبین فیضان اس کے حلقۂ ارادت سے الگ رہ کر کچھ نہیں پا سکتے۔ اگر کسی نے بطریق استراق سمع کوئی کلمۂ حقیقت حاصل بھی کر لیا تو اول تو وہ مثمر برکات نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو چونکہ عہد کی سلطانی فاتح و عازمِ دعوت کو پہنچتی ہے، اس لئے وہ بھی بالواسطہ اسی کے فیضان و بخشش میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ وقد احسن من قال:

گر گفتہ زعشق گہے حرف آشنا
آنہم حکایتیست کہ از من شنیدۂ

قرآن حکیم نے ہدایت کو حیاتِ ارض سے تعبیر کیا ہے اور ضلالت کو زمین کی موت سے، اور ہدایت خود زندگی ہے: استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم اور ضلالت موت ہے: وماانت بمسمع من القبور اور اموات غیر احیاء۔ بہار کا جب موسم آتا ہے تو گو زمین کے ہر گوشہ کو روئیدگی و سرسبزی سے مالامال کر دینا چاہتا ہے مگر سب سے پہلے اس کی آمد کی برکتیں باغ و چمن ہی میں ظاہر ہوتی ہیں اور صبح کا طلوع اگرچہ دنیا کے گوشے گوشے کے لئے پیامِ نور ہوتا ہے مگر سورج کی پہلی کرنیں اونچی دیواروں اور بلند مناروں ہی پر چمکتی ہیں، گو بعد کو نچلے سے نچلے تہہ خانے بھی روشن ہو جائیں گے۔ یہی حال عہد ہدایت اور دورِ فیوض و برکات سماویہ کا بھی ہے۔ اس عالم میں بھی خزاں و بہار کے موسم آتے ہیں اور لیل و نہار کا اختلاف موجود ہے۔ وما یعقلھا الا العالمون سو اگرچہ بہار سعادت کا موسم سارے جہان اور ساری

زمین کے لئے موسمِ حیات و کامرانی ہے لیکن اس کی سب سے پہلی برکت اصحاب عزائم ونفوس ذکیۂ امت کے ریاحین قلوب وبساتین ارواح ہی سے بروز وظہور کرتی ہے اور اگرچہ آفتاب فیضانِ الٰہی کی تجلی تمام بر و بحر کو ظلمت غفلت وبطالت سے نجات دلانا چاہتی ہے، مگر اس کی سب سے پہلی کرنوں سے درخشندہ وجہانتاب ہونے کا حق صرف انہی طبائع مستعدہ وقلوب صافیہ کو حاصل ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی استعداد سربلندی ورفعت سے اکتساب اسفار ہدایت کے لئے اسبقیت واولیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ موسم بہار ہر پھول کو لالی اور ہر پتے کو سبزی بخشے گا، اور صبح کی تجلی ہر ذرہ کو چمکیلا اور ہر آنکھ کو بینا بنا دے گی، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ جس وقت باغ وچمن میں پھول کھلکھلا رہے تھے اور شاخیں ہنس ہنس کر جھوم رہی تھیں تو اس وقت اموات صحرا وگلخن کا کیا حال تھا؟ اور جس وقت دیواروں کی اونچی منڈیروں اور مناروں کی چوٹیوں اور کلسوں کو صبح تجلی زیورِ طلائی پہنا رہی تھی تو اس وقت صحن مکان کے گوشوں اور ابواب ومحاریب کے نیچے سونے والوں کا بھی اس فیضان اوّل میں حصہ تھا یا نہیں؟ تہہ خانوں اور سردابوں کے بسنے والوں کا تو یہاں ذکر ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کے لئے تو شاید والنہار اذا تجلّیٰ کا وقت ہی روشنی کی پہلی کرن بہم پہنچائے، ورنہ والفجر اور والضحیٰ کے مراتب اولیۂ تنویر تو ان کے لئے واللیل اذا یغشیٰ کے حکم میں داخل ہیں!

فصل

اگر تاریخ اسلام کے مختلف دوروں اور سلسلۂ دعوت وتجدید امت مرحومہ کی پچھلی کڑیوں پر نظر ڈالو تو یہ جو کچھ کہا گیا، اس کی تصدیق ہر دور کے واقعات پیش کریں گے۔

افسوس کہ یہ موقعہ تفصیل کا نہیں۔ ہر دور میں تم پاؤ گے کہ اگرچہ عامۂ علماء و صلحاء امت کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی، اور ان کا فضل و کمال اور ورع و تقویٰ بھی ہر طرح مسلم و ثابت ہے، بلکہ بعض ان میں ایسے تھے کہ علم و عمل کی متعدد شاخوں میں اپنا عدیل و نظیر نہیں رکھتے تھے، بایں ہمہ اس عہد کی عزیمت دعوت اور تجدید ملت کے مرتبۂ مخصوص میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوا، اور صرف چند خاص افرادِ عزائم ہی کی قسمت میں آیا یا تو ان کے قدم ہمت نے علم و عمل کی دوسری شاخوں پر قناعت کر لی، یا اس راہ میں قدم بڑھانے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ عہد اوائل بنو امیہ میں کہ ابھی ہجرت کی پہلی صدی بھی ختم نہیں ہوئی تھی، کتنی بڑی جماعت اجلۂ صحابہ کرام اور ارکان بیت نبوت و بقیہ صالحۂ خیر القرون کی موجود تھی؟ اور کون ہے جو ان کی عظمت و شرف میں ایک لمحہ کے لئے بھی شک کر سکے؟ لیکن بدعات و محدثات بنو امیہ کے مقابلے میں سرفروشانہ اقدام عزیمت و فتح باب مقاومت و ثبات فی الحق والعدل کا جو ایک مخصوص مقام تھا، وہ تو بجز حضرت امام حسین (علیہ و علیٰ اٰبائہ واجدادہ الصلوٰۃ والسلام) کے اور کسی کے حصے میں نہ آیا؟ عبد الملک بن مروان کا زمانہ اجلۂ تابعین و حفاظ سنت و حملۂ علوم نبویہ سے مملو تھا، لیکن اتباعِ سنت و قیامِ حق کی راہ میں سو دروں کی ضرب مردانہ وار برداشت کر لینے اور بخوفِ مبتدعین آل مروان اور محبوب قلبے پر مومنین ہونے کا جو شرف مخصوص سید التابعین و اعلم بقضاء رسول اللہ و خلفائہ یعنی حضرت سعید بن المسیب کے حصہ میں آیا، اس میں تو ان کا کوئی سہیم و شریک نہ تھا؟ منصور عباسی کے زمانے میں کون کہہ سکتا ہے کہ اصحابِ علم و عمل کا کال تھا؟ لیکن معلوم ہے کہ شاہانِ جور کے مقابلے میں ثباتِ حق و اعتقاد کا جو مقامِ عزیمت امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہما کو بہ ضمن مسئلہ یمین و طلاق مکرہ ملا، وہ تو صرف انہی کے لئے تھا؟ یہ کیا چیز تھی کہ عین اس وقت جبکہ مشکیں اس زور سے کس دی گئی تھیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا تھا اور ستر کوڑوں کی ضربیں ان کے جسمِ اقدس پر پڑ رہی تھیں، تو اسی اونٹ کی پیٹھ پر کھڑے ہو گئے جس پر تذلیل و تشہیر

کے لئے سوار کرایا گیا تھا، اور پکار کر کہا: "من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا مالک بن انس اقول ان الطلاق المکرہ لیس بشئی"! یعنی جو مجھ کو جانتا ہے سو جانتا ہے، اور جو نہیں جانتا تو جان لے کہ میں ہوں مالک انس کا بیٹا، اور اسی مسئلہ کا اعلان کرتا ہوں جس کے اعلان سے مجھ کو جبراً روکا جا رہا ہے کہ طلاق مکرہ کوئی چیز نہیں! سبحان اللہ یہ وہی مقام عزیمت کبریٰ کی شاہی و فرمانروائی تھی جس کے آگے دنیا کی بادشاہتیں بال مگس کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں، اور یہی وہ ہیبت ربانی اور جلالت روحانی تھی جس کو دیکھ کر حضرت سفیان ثوری بے اختیار پکار اٹھے تھے:

فھو المھاب ولیس ذا سلطان

کیا خوب فرمایا حافظ ابنِ جوزی نے امام موصوف کے حالات میں کہ "وکانما کانت تلک السیاط حلیا حلی بہ"! یعنی ان کو کوڑوں سے پٹیا گیا اور مشکیں کسی گئیں لیکن ان باتوں سے ان کی عزت و عظمت گھٹنے کی جگہ اور بڑھ گئی۔ گویا یہ ضربِ تازیانہ ان کے جمالِ عظمت و اجلال کا زیور تھا کہ جب پہنا دیا گیا تو اس کی رعنائی و خوبروئی دوچند ہوگئی!

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود!

فصل

تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال و تعمق فی الدین اور بدعت مضلۂ تکلم بالفلسفہ و انحراف از اعتصام بالسنہ نے سر اٹھایا، اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگاتار تین عظیم الشان فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ کی شمشیر استبداد و قہر حکومت نے اس فتنہ کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ بقول علی بن المدینی کے فتنۂ ارتداد و منع زکوٰۃ (بعہد حضرت ابوبکرؓ)

کے بعد یہ دوسرا فتنۂ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا، تو کیا اس وقت علماء امت اور آئمہ شریعت سے عالمِ اسلامی خالی ہو گیا تھا؟ غور تو کرو، کیسے کیسے اساطین علم وفن اور اکابرِ فضل وکمال اس عہد میں موجود تھے؟ خود بغداد علماء اہل سنت وحدیث کا مرکز تھا۔ مگر سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے اور عزیمت دعوت، وکمال مرتبۂ وراثت نبوت وقیامِ حق وہدائت فی الارض والامت کا وہ جو ایک مخصوص مقام تھا، صرف ایک ہی قائم لامر اللہ کے حصہ میں آیا۔ یعنی سید المجددین، وامام المصلحین، حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اپنے رنگ میں سب صاحب مراتب ومقامات تھے لیکن اس مرتبہ میں تو اور کسی کا ساجھا نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قیام سنت ودین خالص کا قیامت تک کے لئے فیصلہ ہونے والا تھا، اور مامون ومعتصم کے جبر وقہر اور بشر مریسی اور قاضی ابن ابی داؤد جیسے جابرہ معتزلہ کے تسلط وحکومت نے علماء حق کے لیے صرف دو ہی راستے باز رکھے تھے۔ یا اصحاب بدعت کے آگے سر جھکا دیں اور مسئلہ خلق قرآن پر ایمان لاکر ہمیشہ کے لئے اس کی نظیر قائم کر دیں کہ شریعت میں صرف اتنا ہی نہیں ہے جو رسول تبلا گیا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جا سکتا ہے، اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے ہر رائے اس پر قاضی وآمر ہے، ہر فلسفہ اس کا مالک وحاکم ہے۔ یفعل مایشاء ویختار۔ اور یا پھر قید خانے میں رہنا، ہر روز کوڑوں سے پیٹا جانا، اور ایسے تہہ خانوں میں بند ہو جانا کہ "لایرون فیہ الشمس ابدا" کو قبول کر لیں۔ بہتوں کے قدم تو ابتدا ہی میں لڑکھڑا گئے۔ بعضوں نے ابتدا میں استقامت دکھلائی لیکن پھر ضعف ورخصت کے گوشے میں پناہ گیر ہو گئے۔ عبداللہ بن عمر القواریری اور حسن بن حماد امام موصوف کے ساتھ ہی قید کئے گئے تھے، مگر شدائد ومحن کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ بعضوں نے روپوشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی کہ کم سے کم اپنا دامن تو بچا لے جائیں۔ کوئی اس وقت کہتا تھا۔ لیس ھذا زمان حدیث، انما ھذا زمان بکاء وتضرع ودعاکدعا الغریق' یعنی یہ زمانہ درس واشاعت علوم وسنت کا نہیں ہے۔ یہ تو وہ زمانہ ہے کہ بس اللہ کے

کے آگے تضرع وزاری کرو اور ایسی دعائیں مانگو جیسے سمندر میں ڈوبتا ہؤا شخص دعا مانگے کوئی کہتا تھا "احفظوا السانکم، وعاجلوا قلبکم وخذوا ماتعرفوا ودعوا ماتنکروا" اپنی زبانوں کی نگہبانی کرو، اپنے دل کے علاج میں لگ جاؤ، جو کچھ جانتے ہو اس پر عمل کئے جاؤ، اور جو برا ہو اس کو چھوڑ دو! کوئی کہتا: هذا زمان السکوت وملازمة البیوت "یہ زمانہ خاموشی کا زمانہ ہے اور اپنے اپنے دروازوں کو بند کرکے بیٹھ رہنے کا"[1] جبکہ تمام اصحاب کار وطریق کا یہ حال ہو رہا تھا اور دین الخالص کا بقاء وقیام ایک عظیم الشان قربانی

---

[1] یہ باتیں بھی اپنے مقام ورنگ میں ٹھیک تھیں اور ہرگز ہرگز موجب قدح نہیں۔ ارباب رخصت کے لئے اسی میں امن وسلامتی ہے۔ یہ مقام بھی ان لوگوں پر بدرجہا مزیت وفضیلت رکھتا ہے جو خود اپنے اعتقاد وعمل کی بھی محافظت نہ کرسکے، اور ہر حال میں اصلاح نفس مقدم، لیکن ارباب عزیمت کا مقام دوسرا ہے۔ اصحاب رخصت کی نہایت ان کے لئے بدایت کا حکم رکھتی ہے، اور حسنات الابرار سیئات المقربین کے معاملات سب کے لئے نہیں ہوسکتے۔ وکلا وعد الله الحسنی اور ولکل وجهة هو مولیها فاستبقوا الخیرات اور یہ جو ترمذی (یا ابوداؤد) میں ہے کہ ابوامیہ شعبانی نے ابوثعلبہ سے یاایها الذین آمنوا علیکم انفسکم کی نسبت پوچھا تو انہوں نے آنحضرت سے روایت کی کہ ایتمروا بالمعروف وانتهوا عن المنکر، حتیٰ اذا رایتم شحًا مطاعًا وهوی متبعًا ودنیا مؤثرة و اعجاب کل ذی رای برایه، فعلیك بنفسك ودع عنك امر العوام" تو اول تو "علیك بنفسك کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بجز اپنے نفس کی اصلاح کے اور کسی کی ہدایت واصلاح سے مطلب ہی نہ رکھو اور لوگوں کو گمراہی میں مبتلا ہونے دو، کیونکہ اگر ایسا ہو تو کتاب وسنت کے دو ثلث احکام ووصایا، بالکل بے کار ہو جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب فتنہ وفساد کا دور آئے اور غالب جماعت مبتلائے منکرات ومعاصی ہو، اور ہر شخص اپنی رائے پر مغرور اور دین کی طرف سے بالکل بے پروا ہو جائے تو اس وقت سب کو گڑھوں میں گرتے دیکھ کر خود بھی نہ کود پڑنا، بلکہ گرنے والوں کو گرنے دو۔ خود اپنی راہ حق پر قائم وثابت قدم رہو۔ ان کا معاملہ ان کے لیے اور تمہارا معاملہ تمہارے لئے ولا تزر وازرة وزر اخری۔ ثانیاً اگر "دع عنك امر العوام" کا یہ مطلب مان بھی لیا جائے کہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، جب بھی یہ وہی عامۂ ناس کے لئے رخصت کا پہلو ہوگا اور عزیمت امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی میں ہوگی، چنانچہ اسی روایت میں اس کے بعد فرمایا: فان من ورائکم ایامًا، الصبر فیهن کالقبض علی الجمر العامل فیهن مثل اجر خمسین رجلا

یعلمون مثل عملکم "۔ یعنی یہ جو کہا کہ اس وقت اپنے وجود کو بچانا اور عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دینا، تو اس لئے کہا کہ ظلم و مصائب کے بڑے سخت دن آنے والے ہیں۔ اس وقت حق کی راہ میں صبر کرنا ایسا سخت ہوگا جیسے انگاروں کو ہاتھ میں لینا، سو جو شخص ایسے دنوں میں بھی عمل حق سے باز نہ آیا، اس کے لئے تم جیسے پچاس آدمیوں کے اعمال کا ثواب ہوگا"۔ اس سے واضح ہوگیا۔ کہ چونکہ شر و فتن میں ان لوگوں کے لئے بڑے ہی سخت مصائب و محن ہونگے جو حق کے اعلان و دعوت کی راہ میں قدم رکھیں گے، اور ان کو برداشت کرنا ہر شخص کا کام نہیں، اس لئے عامۂ ناس کے لئے یہ حکم دیا کہ کم سے کم اپنا دامن تو بچائے جاؤ۔ دوسروں کے پیچھے نہ پڑو کہ اس میں بڑی ہی آزمائشیں اور سختیاں ہیں۔ پھر اگر کوئی مردِ ہمت ان آزمائشوں میں پورا اترے تو فرمایا کہ اس کے اجر و ثواب کا کیا پوچھنا؟ اس کا ایک عمل و صبر پچاس اصحاب عمل کے مقابلے میں رکھا جائے گا کہ کام جتنا سخت ہو اسی کے مطابق مزدوری بھی ملنی چاہیئے۔

پس آجکل کے علماء حیل و بندگانِ نفس نے جو ترک امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے اس حدیث کو اور علیکم انفسکم کو حیلہ بنا رکھا ہے، اور جب کبھی ان کو علماء کے فرائض یاد دلائے جاتے ہیں تو فوراً کہہ دیتے ہیں علیکم انفسکم اور "علیك بنفسك ودع عنك امر العوام" تو یہ صریح قرآن و سنت کی تحریف ہے۔ اگر علیکم انفسکم کا یہی مطلب ہو تو اس تفسیر کی نسبت کیا کہو گے جس کو حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے اپنے خطبہ میں بیان کیا تھا؟ یہاں ایک اور دقیق نکتہ بھی ملحوظ رہے۔ اس حدیث اور اس قسم کی اکثر احادیث میں ایسے فتنوں کی خبر دی گئی ہے جن میں سب سے بڑا فتنہ خلافت راشدہ کا انقراض اور امراء ظلم و جور کا قیام ہے جو حق و عدل کو پامال کر دیں گے اور سچائی کے اعلان کو جبراً و قہراً روکیں گے تو ایسے وقتوں کے لئے اگر عامۂ ناس کو یہ حکم دیا جاتا کہ ہر شخص امر بالمعروف کیلئے اٹھ کھڑا ہو تو اس کا نتیجہ نکلتا کہ پہلی حالت سے بھی بدتر حالت پیدا ہو جاتی۔ ہر طرف طوائف الملوکی اور انارکی پھیل جاتی، حکومتیں قائم نہ رہتیں، بلادِ اسلامیہ کا کوئی محافظ نہ ہوتا، جمعہ و جماعت کا کوئی انتظام نہ کرتا۔ پس ایسے وقتوں کے لئے عامۂ ناس کو یہی وصیت کی گئی کہ بدوں کی برائی کو ان کے لئے چھوڑ دو اور اپنا دامن بچائے رہو۔ اگر تمہارے مسلمان حاکم ظالم و جابر بھی ہوں، جب بھی ان سے سرکشی و بغاوت نہ کرو تا آنکہ کوئی داعیٔ حق کھڑا ہو اور دعوتِ عامہ کا باب مسدود کھل جائے۔ اس وقت عوام کا بھی فرض ہوگا کہ اس کا ساتھ دیں اور نظامِ حق و عدل کو قائم کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اوائل بنو امیہ ہی میں تمام صحابۂ کرام اس پر متفق ہوگئے کہ عامۂ امت کو سلاطینِ امویہ کی اطاعت کرنی چاہیئے، زکوٰۃ انہی کو دینی چاہیئے جمعہ انہی کے پیچھے پڑھنا چاہیئے۔ حفظِ ملت و بلاد کی راہ میں نکلیں تو ان کے علم کے نیچے جمع ہو جانا چاہیئے۔ تا آنکہ کوئی قائم حق کھڑا ہو حامیانِ بنو امیہ اطاعت امیر کی احادیث کثرت کے ساتھ بیان کرتے تھے تاکہ لوگ اُن کے

کا طلبگار تھا، تو غور کرو کہ صرف امام موصوف ہی تھے جن کو فاتح و سلطان عہد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے نہ تو دعاتِ فتن و بدعت کے آگے سر جھکایا، نہ روپوشی و خاموشی و کنارہ کشی اختیار کی، اور نہ صرف بند حجروں کے اندر کی دعاؤں اور مناجاتوں پر قناعت کر لی، بلکہ دین خالص کے قیام کی راہ میں اپنے نفس و وجود کو قربان کر دینے اور تمام خلف امت کیلئے ثبات و استقامت علی السنۃ کی راہ کھول دینے کیلئے بحکم فاصبر وا کما صبر اولوا العزم من الرسل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو قید کیا گیا، قید خانے میں چلے گئے۔ چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں ڈالی گئیں، پہن لیں۔ اسی عالم میں بغداد سے طرطوس لے چلے اور حکم دیا گیا کہ بلا کسی مدد کے خود ہی اونٹ پر سوار ہوں اور خود ہی اونٹ سے اتریں۔ اس کو بھی قبول کر لیا۔ بوجھل بیڑیوں کی وجہ سے ہل نہیں سکتے تھے، اٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ عین رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر میں جس کی طاعت اللہ کو تمام دنوں کی طاعات سے زیادہ محبوب ہے، بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے، اور اس پیٹھ پر جو علوم و معارف نبوت کی حامل تھی، لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر نیا تازہ دم جلاد اس کی جگہ لیتا۔ اس کو بھی خوشی خوشی برداشت کر لیا مگر اللہ کے عشق سے منہ نہ موڑا اور راہِ سنت سے منحرف نہ ہوئے۔ تازیانے کی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۳۵)

قبضہ سے نکل نہ جائیں۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن عمرو العاص لوگوں کو سنا رہے تھے "من بائع اماماً فاعطاہ صفقۃ یدہ فلیطعہ ما استطاع"۔ عبدالرحمٰن بن عبدالرب کہتے ہیں کہ میں نے اس پر سوال کیا "ان ابن عمك معاویہ یامرنا ان ناکل اموالنا بیننا بالباطل ونقتل انفسنا واللہ یقول لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل یعنی یہ جو تم آنحضرت سے روایت کرتے ہو کہ "جس امام کو بیعت کا ہاتھ دیا پس چاہیئے کہ اس کی اطاعت کی جائے" تو تمہارا چچیرا بھائی معاویہ ہم کو حکم دیتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کا مال ناحق کھائیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں حالانکہ خدا کا حکم یہ ہے کہ ایسا نہ کرو۔ اب بتلاؤ ہم کیا کریں؟ امیر کی اطاعت کریں یا خدا کی؟ عبداللہ کچھ دیر چپ رہے۔ پھر کہا "اطعہ فی طاعۃ اللہ واعصہ فی معصیۃ اللہ" نیک بات میں اس کے حکم کی اطاعت کر اور خدا کی نافرمانی میں اس کا حکم نہ مان۔ غالباً یہ مسلم میں ہے۔

ہر ضرب پر بھی جو صدا زبان سے نکلتی تھی، وہ نہ تو جزع و فزع کی تھی اور نہ شور و فغاں کی، بلکہ وہی تھی جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا یعنی "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق"! اللہ اللہ! یہ کیسی مقام دعوت کبریٰ کی خسروی و سلطانی تھی، اور وراثت و نیابت نبوت کی ہیبت و سطوت کہ خود المعتصم باللہ جس کی ہیبت و رعب سے قیصر روم لرزاں و ترساں رہتا تھا، سر پر کھڑا تھا، جلادوں کا مجمع چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا، اور وہ بار بار کہہ رہا تھا "یا احمد! واللہ انی علیك لشفیق، وانی لاشفق علیك کشفقتی علی هارون ابنی، وواللہ لئن اجابنی لاطلقن عنك بیدی۔ ما تقول؟" یعنی واللہ میں تم پر اس سے بھی زیادہ شفقت رکھتا ہوں جس قدر اپنے بیٹے کے لئے شفیق ہوں۔ اگر تم خلق قران کا اقرار کر لو تو قسم خدا کی ابھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں۔ لیکن اس پیکرِ حق، اس مجسمۂ سنت، اس مرید بالروح القدس اس صابرِ اعظم کما صبر واولوالعزم من الرسل کی زبانِ صدق سے صرف یہی جواب نکلتا تھا: "اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او سنة رسوله حتی اقول به" اللہ کی کتاب میں سے کچھ دکھلا دو یا اس کے رسول کا کوئی قول پیش کر دو تو میں اقرار کر لوں، اس کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا!

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

اگر اس چراغ تجدید و مصباح عزیمت دعوت کی روشنی مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر نہ تھی، تو پھر یہ کیا تھا کہ جب معتصم ہر طرح عاجز آ کر قاضی ابن ابی داؤد وغیرہ علماء بدعت و اعتزال سے کہتا "ناظروہ وکلموہ" اور وہ کتاب و سنت کے میدان میں عاجز آ کر اپنے اوہام و ظنون باطلہ کو باسم عقل و رائے پیش کرتے کہ سرتاسر یونانیات ملعونہ سے ماخوذ تھے، تو وہ اس کے جواب میں بے ساختہ بول اٹھتے "ما ادری ما هذا" میں نہیں جانتا یہ کیا بلا ہے؟ "اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او من سنة رسوله حتی اقول" اس تمام کائنات ہستی میں میرے سر کو جھکانے والی صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔ اس کے سوا

نہ میرے لئے کوئی دلیل ہے نہ علم:

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس!

امام موصوف کو جب قید کرکے طرطوس روانہ کیا گیا تو ابو بکر الاحول نے پوچھا "ان عرضت علیك السیف تجیب؟" اگر تلوار کے نیچے کھڑے کر دیئے گئے تو کیا اس وقت مان لوگے؟ کہا نہیں۔ ابراہیم بن مصعب کوتوال کہتا ہے کہ میں نے کسی انسان کو پادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل سے بڑھ کر بارعب نہ پایا۔ "یومئذ ما نحن فی عینیه الا کامثال الذباب" ہم عمال حکومت ان کی نظروں میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے اور یہ بالکل حق ہے جن لوگوں کی نظروں میں جلال الٰہی سمایا ہو، وہ مٹی کی ان پتلیوں کو جنہوں نے لوہا تیز کرکے کاندھے پر ڈال رکھا ہے بہت سا چاندی سونا اپنے جسم پر لپیٹ لیا ہے کیا چیز سمجھتے ہیں؟ انکو خود اقلیم عشقِ الٰہی کی سروری و شاہی اور شہرستان صدق و صفا کا تاج و تخت حاصل ہے۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق را، کیں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند!

ابو العباس الرقی سے حافظ ابن جوزی روایت کرتے ہیں کہ جب رقہ میں امام موصوف قید تھے تو علماء کی ایک جماعت گئی اور اس قسم کی روایات و نقول سنانے لگی جن سے بخوف جان تقیہ کر لینے کی رخصت نکلتی ہے۔ امام موصوف نے سب سن کر جواب دیا: کیف تصنعون بحدیث خباب؟ ان من کان قبلکم کان ینشر احدھم بالمنشار ثم لا یصدہ ذٰلك عن دینه۔ قالوا فئیسنا منه۔" یعنی یہ تو سب کچھ ہوا مگر بھلا اس حدیث کی نسبت کیا کہتے ہو کہ جب صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مظالم و شداید کی شکایت کی تو فرمایا۔ تم سے پہلے ایسے لوگ گذر چکے ہیں جن کے سروں پر آرہ چلایا جاتا تھا اور جسم لکڑی کی طرح چیر ڈالے جاتے تھے مگر یہ آزمائشیں بھی ان کو حق سے نہیں پھرا سکتی تھیں! [1] ابو العباس کہتے ہیں۔ کہ

---

[1] اصل حدیث کے الفاظ صحیح بخاری میں یہ ہیں، یا قریب قریب اس کے "شکونا

جب ہم نے یہ بات سنی تو مایوس ہو کر چلے آئے کہ ان کو سمجھانا بیکار ہے۔ یہ اپنی بات سے پھرنے والے نہیں" یہ جو میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ عزیمت دعوت، عزیمت دعوت نبوی ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۳۸)

الی رسول اللہ صلعم وھو متوسد بردۃ لہ فی ظل الکعبہ، قلنا الا تدعو اللہ لنا؟ قال: کان الرجل فی من قبلکم یحفر لہ فی الارض فیجعل فیہ فیجاء بالمنشار فیوضع علی راسہ فیشق، وما یصدہ ذٰلک عن دینہ۔ ویمشط بامشاط الحدید مادون لحمہ من عظم وعصب، وما یصدہ ذٰلک عن دینہ۔ واللہ لیتمن ھذا الامر حتیٰ یسیر الراکب من صنعاء الی حضر موت لا یخاف الا اللہ ولکنکم تستعجلون"
یہ ہجرت سے پیشتر کا واقعہ ہے۔ بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اعدائے حق کے ظلم وجور کی حد ہو گئی۔ آپ ہمارے لئے دعا نہیں کرتے؟ فرمایا تم سے پہلے ایسے لوگ گذر چکے ہیں کہ ظالموں نے ان کو گڑھوں میں کھڑا کر کے آرہ سے چیر دیا مگر اس پر بھی انہوں نے حق سے منہ نہ موڑا، اور ایسا ہوا کہ حق پرستوں کی کھالوں پر لوہے کی کنگھیاں پھرائی گئیں جو گوشت کو ہڈی اور پٹھے سے جدا کر دیتی تھیں، لیکن اس کو بھی انہوں نے سہہ لیا اور حق سے منہ نہ موڑا۔ خدا کی قسم! دعوتِ حق کا جو کام شروع ہوا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ وہ وقت قریب ہے جب یمن سے حضر موت تک ایک سوار چلا جائے گا اور بجز اللہ کے اور کسی کا خوف اس کے دل میں نہ ہوگا (یعنی راہ میں ہر جگہ صرف مسلمان ہی ہوں گے۔ کوئی غیر نہ ہوگا جو حملہ کرے یا لوٹے) یہ ہونے والا ہے مگر تم جلد بازی کرتے ہو" امام بخاری باب علامات النبوت میں ایک دوسری حدیث عدی بن حاتم کی بھی لائے ہیں کہ "لترین الظعنیۃ ترتحل من الحیرۃ حتیٰ تطوف بالکعبہ" اور "لتفتحن کنوز کسریٰ" یعنی آپ نے فرمایا: عدی، اگر تم جیتے رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت تن تنہا سفر کر کے آئے گی اور کعبہ کا طواف کرے گی۔ اور اس تمام سفر میں اللہ کے سوا کوئی چیز اس کے لئے موجبِ خوف نہ ہوگی۔ اور قریب ہے کہ مسلمانوں کیلئے کسریٰ کے خزانے کھول دیئے جائیں۔ عدی کہتے ہیں کہ میں زندہ رہا اور دونوں باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ وکنت فی من افتتح کنوز کسریٰ!

وہ زمانہ کیا ہوا جب ہم سے گریہ میں اثر تھا   یہی چشمِ خوں فشاں تھی، یہی دل یہی جگر تھا!

عزیمت دعوت اور یہ ہے وراثت و نیابت مقام فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل کی، اور یہ ہے خاصہ مرتبۂ عظیمہ "من یجد لها دینها" کا، اور یہ ہے ان ایام فتن کا صبر اعظم و اکبر جن کی نسبت ترمذی کی روایت میں فرمایا: "الصبر فیهن کالقبض علی الجمر" تو یہی وہ لوگ ہیں جو اگر چاہیں تو گوشۂ رخصت و بیچارگی میں امن و عافیت کے پھول چن سکتے ہیں، لیکن وہ پھولوں کو چھوڑ کر دہکتے ہوئے انگارے پکڑ لیتے ہیں، اور اسی لئے ان کا اجر و ثواب بھی "مثل اجر خمسین رجلاً یعملون مثل عملکم" کا حکم رکھتا ہے۔ مانا کہ ضعیفوں اور درماندوں کے لئے رخصت و گلو خلاصی کی راہیں بھی باز رکھی گئی ہوں لیکن اصحاب عزائم کا عالم دوسرا ہے۔ ان کی ہمت عالی بھلا میدان عزیمت و اسبقیت بالخیرات کو چھوڑ کر تنگنائے رخصت و ضعف میں پناہ لینا کب گوارا کر سکتی ہے؟ جوانانِ ہمت اور مردانِ کارزار اس ننگ کو کیوں قبول کرنے لگے کہ کمزوروں اور درماندوں کی لکڑی کا سہارا پکڑیں؟ جن کے لئے اس میں سلامتی ہے؟ ہوا کرے؟ مگر ان کے لئے تو ایسا کرنا ہمت کی موت ہے، ان کی پامالی ہے، اور عشق کی جبینِ عزت کے لئے داغ ننگ و عار سے کم نہیں۔ حسنات الابرار سیئات المقربین! رخصت و عزیمت کی تفریق اور اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز اصحابِ عمل کے لئے ہے نہ کہ اصحاب عشق کے لئے۔ عشق کی راہ ایک ہی ہے اور اس میں جو کچھ ہے عزیمت ہی عزیمت ہے۔ ضعف و بیچارگی کا تو ذکر ہی کیا؟ وہاں رخصت کا نام لینا بھی کم از معصیت نہیں۔ کما قال بعض المحبین العارفین۔

ملتِ عشق از ہمہ دیں ہا جدا است   عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب معتصم باللہ نے جلادوں کو ضربِ تازیانہ کے لئے حکم دیا تو وہ علماء اہل سنت بھی دربار میں موجود تھے جو شدتِ محن و مصائب کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ ان میں سے بعض نے کہا: "من صنع من اصحابك فی هذا الامر ما تصنع" خود تمہارے ساتھیوں میں سے کس نے ایسی ہٹ کی جیسی تم کر رہے ہو؟ امام احمد نے کہا۔ یہ تو کوئی

دلیل نہ ہوئی۔ "اعطونی شیئاً من کتاب اللہ اوسنۃ رسولہ حتیٰ اقول بہ" میں حالت صوم میں کہ صرف پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا، نو تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چور ہوگئی اور تمام جسم خون سے رنگین ہوگیا۔ خود کہتے ہیں کہ جب ہوش آیا تو چند آدمی پانی لائے اور کہا پی لو مگر میں نے انکار کر دیا کہ روزہ نہیں توڑ سکتا۔ وہاں سے مجھ کو اسحاق بن ابراہیم کے مکان میں لے گئے۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا تھا۔ ابن سماعہ نے امامت کی اور میں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ابن سماعہ نے کہا: تم نے نماز پڑھی حالانکہ خون تمہارے کپڑوں میں بہہ رہا ہے؟ یعنی دم جاری و کثیر کے بعد طہارت کہاں رہی؟ میں نے جواب دیا۔ "قد صلی عمرو جرحہ یثعب دماً" ہاں مگر میں نے وہی کیا جو حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے اور قاتل نے زخمی کیا مگر اسی حالت میں انہوں نے نماز پوری کی!

ابن سماعہ کے جواب میں حضرت امام نے حضرت عمرؓ کی جو نظیر پیش کی تو یہ ان کی تشفی کے لئے بس کرتی تھی، مگر میں کہتا ہوں کہ جو خون اس وقت امام احمد بن حنبل کے زخموں سے بہہ رہا تھا، اگر وہ خون ناپاک تھا اور اس کے ساتھ نماز نہیں ہوسکتی تو پھر دنیا میں اور کونسی چیز ایسی ہے جو انسان کو پاک کر سکتی ہے اور کونسا پانی ہے جو طاہر و مطہر ہو سکتا ہے، اگر یہ ناپاک ہے تو دنیا کی تمام پاکیاں اس ناپاکی پر قربان اور دنیا کی ساری طہارتیں اس پر سے نچھاور۔ یہ کیا بات ہے کہ پاک سے پاک اور مقدس سے مقدس انسان کی میت کے لئے بھی غسل ضروری ٹھہرا کہ "اغسلوہ بماء وسدر وکفنوہ فی ثوبین" [1] مگر شہیدان حق کے لئے یہ بات ہوئی کہ ان کی پاکی شرمندۂ آبِ غسل نہیں "لم یصل علیھم ولم یغسلھم"۔

---

[1] اخرجہ البخاری عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

[1] بلکہ ان کے خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کو بھی ان سے الگ نہ کیجئے "یدفنوا فی ثیابھم ودمائھم" [2] اور اسی لباس گلگوں و خلعتِ رنگیں میں وہاں جانے دیجئے جہاں ان کا انتظار کیا جا رہا ہے، اور جہاں خون عشق کے سرخ دھبوں سے بڑھ کر شاید اور کوئی نقش و نگار عمل مقبول و محبوب نہیں: عند ربھم یرزقون فرحین بما آتاھم اللہ!

خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ ترست
ایں گناہ از صد ثواب اولیٰ ترست

اللہ اللہ! یہاں طہارت جسم و لباس کا کیا سوال ہے؟ امام احمد بن حنبل نے اپنی تمام عمر میں اگر کوئی پاک سے پاک اور سچی سے سچی نماز پڑھی تھی، تو یقیناً وہ وہی ظہر کی نماز تھی۔ ان کی تمام عمر کی وہ نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئیں تھیں، اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جس کو راہِ ثبات حق میں بہنے والے خون نے مقدس و مطہر کر دیا تھا! سبحان اللہ جس کے عشق میں چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں پہن لی تھیں، جس کی خاطر سارا جسم زخموں سے چور اور خون سے رنگین ہو رہا تھا، اسی کے آگے جبینِ نیاز جھکی ہوئی! اسی کے ذکر میں قلب و لسان لذت یاب تسبیح و تحمید! اسی کے جلوۂ جمال میں چشم شوق وقف نظارہ و دید! اور اسی کی یاد میں روح مضطر محو و سرشار عشق و خود فراموشی!

یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

اور یہ جو امام موصوف نے افطار سے انکار کر دیا، اور نماز کا وقت آیا تو بہ اول وقت و بہ جماعت ادا کرنے سے باز نہ آئے حالانکہ جسم زخموں سے چور اور

---

[1] بخاری و ترمذی میں شہداء احد کی نسبت غالباً حضرت جابر کی روایت ہے۔ یہ اس کے الفاظ ہیں۔ (او کما قال) [2] ابوداؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے "امر بقتلی اُحد ان ینزع عنھم الحدید والجلود وان یدفنوا فی ثیابھم ودمائھم" (قریب قریب اس کے الفاظ ہیں)

پیٹھ کا خون پانوں تک بہہ رہا تھا، تو اب بتلاؤ کہ وہ تمہارا رخصت والا معاملہ کیا ہوا؟ کیا ایسی حالت میں رخصت نہ تھی کہ روزہ کھول دیتے اور نماز کے لئے اس قدر توقف کر جاتے کہ زخموں پر مرہم تو لگا دیا جاتا؟ اور اگر تم اس عالم میں ہو کہ امن و فراغت اور طاقت و فرصت کی حالت میں بھی مصائب و خطرات سے بچنے کے لئے دعوت الی الحق کو ترک و ملتوی اور عزم و ثباتِ حق سے انحراف کیا جا سکتا ہے، اور تمہارے نزدیک مصلحت و رخصت اسی میں ہے کہ بطلان و ضلالت کے آگے سر جھکا دیا جائے، تو خدارا بتلاؤ کہ یہ عالم کونسا تھا؟ کبھی اس عالم کی بھی کوئی خبر تم تک پہنچی ہے؟

یاران خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟

افسوس، حیلہ جوئی و بہانہ سازی کا نام تمہاری بولی میں رخصت ہے، اور ہمت کی موت اور ایمان کی جانکنی کو تمہاری بستی میں مصلحت بینی اور دانشمندی کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ تم کو اس عالم کی کیا خبر؟ اقلیم عزائم اور ہمت آباد عشق کے معاملات تمہارے وہم و گمان سے بھی بالاتر ہیں۔ تمہارے لئے یہی بہت ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ایمان کی بچی بچائی اور بچی کھچی پونجی بچا لے جاؤ۔ اگرچہ اس کی بھی امید نہیں:

تو اے گرد توہم! شوکت دریا چہ میدانی؟
اسیر عذر لنگی، وسعت صحرا چہ مے دانی؟

تم کہتے ہو کہ دیدہ و دانستہ اپنی جان ہلاکت میں ڈال دینا کونسی عقلمندی اور کہاں کی حق پرستی ہے؟ بلکہ ایک طرح کی ضلالت و جنون: حتیٰ تکون حرضاً او تکون من الھالکین۔ تو تمہاری مثال ٹھیک ٹھیک لائمات مصر کی سی ہے، جو جمال عصمت یوسفی سے بے خبر امراۃ العزیز کو ملامت کیا کرتی تھیں: تراود فتاھا عن نفسہ قد شغفھا حبا۔ انا لنراھا فی ضلال مبین۔ لیکن کاش ایسا ہوتا کہ پردہ

اٹھایا جاسکتا اور یہ کہا جاسکتا کہ اخرج علیھن! تو اس وقت ملامت گران بے درد پر اپنی ملامتوں کی حقیقت کھلتی۔ لائماتِ مصر نے تو صرف ہاتھ ہی کاٹ لئے تھے: اکبرنہ، وقطعن ایدیھن وقلن حاش للہ! ماھذا بشرا، ان ھذا الا ملک کریم[1] لیکن عجب نہیں کہ تمہارے ہاتھوں کی چھریاں خود تمہارے ہی گردنوں پر چل جاتیں اور اس وقت دل باختگانِ عشق یوسفی کہتے: فذالکن الذی لمتننی فیہ! ولقد احسن القائل:

لو یسمعون کما سمعت کلامھا

خروا لعزۃ رکعا وسجودا!

---

[1] عام طور پر یہ واقعہ یوں سمجھا جاتا ہے کہ وہ عورتیں حضرت یوسف کا جمالِ صورت دیکھ کر ایسی بے خود ہوئیں کہ پھلوں کی جگہ اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے، مگر قرآن حکیم سے ایسا ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت یوسف نے اس واقعہ کے بعد ہی دعا مانگی: والا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن۔ خدایا اگر ان عورتوں کے مکر و فریب سے تو نے نہ بچایا تو ممکن ہے کہ میں ان پر جھک پڑوں یہاں ان عورتوں کے معاملہ کو "کید" کہا۔ لیکن اگر وہ تاب نظارۂ جمال نہ لاکر بے خود ہو گئی تھیں اس میں "کید" کی کونسی بات تھی؟ پھر خدا فرماتا ہے "فصرف عنہ کیدھن" ہم نے ان عورتوں کے کید کو اس کی طرف سے ہٹا دیا۔ پھر قید خانے میں پادشاہ کے پیامبر سے کہا: ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن، ان ربی بکیدھن علیم یعنی پہلے اس معاملہ کو صاف کر لو کہ وہ جو عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے تو اس کی حقیقت کیا تھی؟ میرا پروردگار ان کے مکر کو خوب جانتا ہے۔ ان دونوں مقامات میں بھی اس معاملہ کو کید سے تعبیر کیا اور آخری آیت میں تو صاف قطع ید کو حضرت یوسف "کید" کہہ رہے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب حسب تحریک حضرت یوسف بادشاہ نے ان عورتوں سے معاملہ کی تحقیق چاہی تو ان لفظوں میں پوچھا: ما خطبکن اذ راودتن یوسف عن نفسہ؟ بتلاؤ کیا حال تھا جب تم لوگوں نے یوسف کو پھسلانا چاہا تھا؟ یہاں وہی "راودتن عن نفسہ" کا لفظ ہے جو اُن عورتوں نے امرأۃ العزیز کی نسبت کہا تھا: تراود فتاھا عن نفسہ اور راودتہ التی ھو فی بیتھا عن نفسہ اور ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم پس اگر وہ عورتیں صورت ہی دیکھ کر محو و بیخود ہو گئی تھیں تو اس میں پھسلانے اور بہلانے کا مکر کیا ہوا؟ اگر کہا جائے کہ ہاتھ کاٹنے کے بعد انہوں نے پھسلانا چاہا تھا تو یہ قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ وہاں تو

صرف اس اعتراف پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے کہ ان ھذا الا ملک کریم اور بلاغت قرآنی کے خلاف ہے کہ ایک غیر متذکرہ و مجہول واقعہ کی طرف جا بجا اشارہ کیا جائے۔ پس اس آیت کی یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ صاف بات یہ ہے کہ ملامت کرنے والی عورتوں کے دلوں میں دراصل پہلے سے کھوٹ تھا۔ وہ خود حضرت یوسف پر ریجھی ہوئی تھیں، مگر بظاہر امرأۃ العزیز کو طعنہ دیا کرتی تھیں کہ ایک نوخیز غلام پر مرنے لگی اور اس کو بھی قابو میں نہ لا سکی؟ یعنی ہم ہوتے تو ایک ہی چلتر میں پاکبازی کی ساری دھوم ختم کر دیتے۔ فلما سمعت بمکرھن جب امرأۃ العزیز نے ان کی اس مکاری کا حال سنا تو حضرت یوسف سے مقابلہ کرا دیا کہ اچھا میں تو اس کو قابو میں نہ لا سکی۔ اگر اس کی پاکبازی ایسی ہی پھسل پڑنے والی ہے تو تم بھی اپنے سارے داؤ آزما دیکھو۔ جب حضرت یوسف سامنے آئے تو اکبرنہ ان کی عصمت و پاکی کی عظمت نے ان کو قائل کر دیا۔ وقطعن ایدیھن جب اظہارِ عشق و فریفتگی کے سارے چلتر ناکام رہے تو پھر یہ کیا کہ اپنا کمال عشق جتانے کے لیے اپنے ہات کاٹ لیے۔ یعنی زخم لگا کر خون بہا دیا۔ یہ بھی ایک چلتر تھا کہ نہ مانو گے تو یہی چھری ہو گی اور ہماری جان۔ لیکن جب وہ کوہِ عصمت اس پر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا تو بے اختیار پکار اٹھیں: ماھذا بشرا، ان ھذا الا ملک کریم! ہم نے تو وہ وہ ناز و عشوہ دکھلائے اور وہ وہ چلتر کیے کہ کوئی کیسا ہی انسان ہوتا مگر اپنے کو قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ تو پاکی و قدوسیت کا فرشتہ ہے۔ جس کو گناہ کا کوئی دام بھی پھنسا نہیں سکتا! اس پر امرأۃ العزیز بولی: فذلکن الذی لمتننی فیہ۔ دیکھا! یہ ہے وہ پیکرِ عصمت اور مجسمۂ ملکوتیت جس کے لیے مجھ کو ملامت کیا کرتی تھیں!:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے!

خواہ امرأۃ العزیز کا یہ قول ہی تفسیر مشہور کی تغلیط کے لیے کافی ہے: ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم ہاں، بیشک، میں نے اس کو بہت پھسلانا چاہا تھا، مگر۔۔ بے قابو نہ ہوا۔ یعنی ایسے پاک شخص کے مقابلے میں اپنی ناکامی کا اقرار باعثِ عار نہیں اگر یہ معاملہ صرف محویت حسن صورت ہی کا تھا تو اس موقعہ پر یہ کہنے کا کون موقع تھا؟ ان عورتوں نے کہا تھا: الا ملک کریم۔ اگر وہ صرف حسن صورت ہی دیکھ کر بے خود ہو گئی تھیں۔ تو ملک کریم کیوں کہا؟ فرشتوں کی خوبصورتی کا تو شہرہ نہیں ہے۔ پاکی اور عصمت کا ہے۔

فلما سمعت بمکرھن اگر صرف ان عورتوں نے حضرت یوسف کی تحقیر ہی کی تھی، اور بنیاد ملامت صرف یہی تھی کہ ایک غلام پر کیوں جان دینے لگی اور خود ان کے دل میں کھوٹ نہ تھا، تو اس میں مکر کی کونسی بات ہوئی؟ مکر کے معنی عربی میں یہ ہیں۔ "ایصال الشی الی الغیر بطریق خفی" وکذالك الکید والمخادعہ۔ جب ان عورتوں کے خیال کو مکر کہا تو اس میں کوئی مخفی بات بھی اندر کی ہونی چاہیئے۔ ایک مرتبہ مجھکو خیال ہوا کہ یہ مشہور تفسیر تو خود ایک حدیث کے خلاف ہے۔ حضرت عائشہ کی مشہور روایت میں ہے کہ مرض الموت میں آپ نے بلال سے کہا۔ حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے کے لئے کہہ دو۔ اس پر حضرت عائشہ نے اور پھر ان کی تحریک سے حضرت حفصہ نے کہا۔ "رجل اسیف" حضرت ابوبکر بڑے ہی رقیق لقلب آدمی ہیں۔ ان سے نہ ہو سکے گا کہ آپ کی جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھائیں حضرت عمر کے لیئے فرما دیجئے۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ "انکن صواحب یوسف" اگر وہی مشہور تفسیر مان لی جائے تو آپ کی یہ تمثیل کسی طرح بھی درست نہیں ہوتی۔

ہم ان تاویلوں سے بے خبر نہیں ہیں جو مفسرین نے لائمات کا مکر و کید ثابت کرنے کے لئے کی ہیں، مگر اس صاف صاف تفسیر کے بعد ان تکلفات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حضرت یوسف کے جمال صورت سے بھی ہمیں انکار نہیں، اور حضرت یوسف پر کیا موقوف ہے؟ دنیا میں کوئی نبی بھی بدصورت نہیں آیا۔ انبیاء کرام فطرت و مزاج انسانی کا کامل ترین ظہور ہوتے ہیں۔ کمال فطرت بغیر اعتدال و قوام خلقت و کمال نشو جسم و ہیکل ممکن نہیں۔ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یشب شباباً لایشبہ الغلمان" اور اعتدال و قوام خلقت میں اعتدال ظاہر و باطن دونوں داخل ہیں۔ پس انبیاء کرام کے ظاہر و باطن، دونوں میں بجز جمال و حسن و خوبروئی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ مگر مجرد جمال صورت کوئی ایسی چیز نہیں جو انبیاء کے لئے موجب فخر و مباہات یا معجزہ ہو اور قرآن حکیم اس کا خاص طور پر ذکر کرے۔ حضرت یوسف کا اصلی جمال، جمالِ عصمت و باطن تھا، جس کا جلوہ قال معاذ اللہ! ان ربی احسن مثوی کے مقام پر بھی نمایاں ہوا، ما ھذا بشرا کے معاملہ میں بھی، السجن احب الی مما یدعوننی الیہ

امام موصوف کے لڑکے عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ کہا کرتے ۔
"رحم اللہ ابا الھیثم، غفر اللہ لابی الھیثم" خدا ابوالہیثم پر رحم کرے، خدا ابوالہیثم کو بخش دے! میں نے ایک دن پوچھا - ابوالہیثم کون ہے؟ کہا جس دن مجھ کو سپاہی دربار میں لے گئے اور کوڑے مارے گئے تو جب ہم راہ سے گذر رہے تھے، ایک آدمی مجھ سے ملا اور کہا مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں مشہور چور اور عیار ابوالہیثم حداد ہوں۔ میرا نام شاہی دفتر میں ثبت ہے۔ بارہا چوری کرتے پکڑا گیا اور بڑی بڑی سزائیں جھیلیں۔ صرف کوڑوں ہی کی مار اگر گنوں تو سب ملاکر اٹھارہ ہزار ضربیں تو میری پیٹھ پر ضرور پڑی ہوں گی۔ باایں ہمہ میری استقامت کا یہ حال ہے کہ اب تک چوری سے باز نہ آیا۔ جب کوڑے کھا کر جیل خانے سے نکلا، سیدھا چوری کی تاک میں چلا گیا۔ میری استقامت کا یہ حال شیطان کی طاعت میں رہا ہے۔ دنیا کی خاطر۔ افسوس تم پر اگر اللہ کی محبت کی راہ میں اتنی استقامت بھی نہ دکھلا سکو اور دینِ حق کی خاطر چند کوڑوں کی ضرب برداشت نہ کرو۔ میں نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہا۔ اگر حق کی خاطر اتنا بھی نہ کر سکے جتنا دنیا کی خاطر ایک چور اور ڈاکو کر رہا ہے تو ہماری بندگی پر ہزار حیف اور ہماری خدا پرستی سے بت پرستی لاکھ درجہ بہتر!

حاشیہ بقیہ صفحہ (۱۴۶)

کے اعلان میں بھی، یا صاحبی السجن الخ کے وعظ و اعلانِ حق میں بھی، اور انی حفیظ علیم کے تحت جلال و عظمت پر بھی! کیا وہ جمال ان کے حسنِ مقدس کی جہاں آرائی کیلئے بس نہیں کرتا؟ لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب!

تفسیر یوسف کی جو مشہور و عام غلطیوں میں سے ایک غلطی یہ تھی۔ سورۃ مذکورہ کی تفسیر میں یہ مبحث بالتفصیل لکھا جا چکا ہے۔

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا!

حافظ ابن جوزی نے محمد بن اسماعیل کا قول نقل کیا ہے "ضربت احمد بن حنبل ثمانین سوطاً لو ضربتھا فیلاً لھدتہ!" احمد بن حنبل کو اسی کوڑے ایسے سخت مارے گئے کہ اگر ہاتھی کے بھی مارے جاتے تو چیخ اٹھتا، مگر اس کوہ عزم و ہمت نے اُف تک نہ کی۔ جب تک ہوش رہا، ہر ضرب پر یا تو وہی جملہ زبان سے نکلتا رہا جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا: "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" اور یا یہ آیت کریمہ: لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا!

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ
آنجا کہ لطمہ ہائے ید اللہ مے زند!

یہ ہے مقام ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا کا، اور یہ ہے وراثت و نیابت حقیقی وکامل فاستقم کما امرت اور انک باعیننا اور فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصداً کی، اور یہ ہیں مجسم و ممثل معنی کریمہ اولائک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ اور رضی اللہ عنہ ورضوا عنہ، اولئک حزب اللہ، الا ان حزب اللہ ھم المفلحون! کے اور یہ ہے وہ معاملہ کہ ان عبادی لیس لک علیھم سلطان! جب بندگانِ حق کو شیاطین وابالیس کا وہ مکر و خدع بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا کہ لتزول عنہ الجبال تو ظاہر ہے کہ چمڑے کے کوڑے اور لوہے کی دھار ان کی استقامت پر کب غالب آنے والی ہے؟ یہ تو اس کے مقابلے میں محض ایک ابتدائی اور آزمائشی منزل ہے:

کریں گے کوہ کن کے جذبِ دل کا امتحاں آخر
ابھی اس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

فی الحقیقت حضرت امام موصوف کی نسبت محمدی اور کمال مرتبۂ تاسی باسوۂ نبوت

کی یہی وہ شان وجلالت ہے جس نے ان کو تمام آئمہ و مجددین امت کی صفوفِ مراتب وکمال سے بلند کر کے ایک دوسرے ہی مقام پر پہنچا دیا ہے۔ حتیٰ کہ تمام آئمہ اسلام میں یہ فضل مخصوص صرف انہی کے حصے میں آیا کہ ان کی محبت وپیروی اہلِ حق وسنت ہونے کی دلیل ٹھہری اور ان سے انحراف بدعتی ہونے کی سب سے بڑی پہچان! اللہ تعالیٰ نے ان کو فنافی السنۃ ہونے کا وہ مرتبہ عطا فرمایا کہ کمال استغراق وتفانی کی وجہ سے خود ان کی ذاتِ گرامی ہی یکسر سنت واتباع سنت کا پیکر ومجسمہ بن گئی۔ بحدیکہ:

نتواں ترا وجاں را بہم امتیاز کردن

جو اس امام کے قدم بقدم چلا اس نے سنت کو پایا، اور جس نے اس کی راہ چھوڑی اس نے سنت رسول ومنہج اصحاب رسول سے انحراف کیا۔ یہ کیا تھا کہ بڑے بڑے آئمہ عصر کو اعتراف کرنا پڑا۔ "اذا رائیت الرجل یحب احمد بن حنبل، فاعلم انہ صاحب سنۃ! اگر کسی کو دیکھو کہ امام احمد سے محبت رکھتا ہے تو بس جان لو کہ صاحبِ سنت ہے! خطیب نے تاریخ میں ہمدانی کا قول نقل کیا ہے۔ "یعرف بہ المسلم من الزندیق" اسی کسوٹی پر مسلم کو زندیق سے پرکھا جائیگا۔ دورقی نے کہا۔ "من سمعتموہ یذکر احمد بن حنبل بسوء فاتھموہ علی الاسلام"

انا من اھویٰ، ومن اھویٰ، انا

نحن روحان حللنا بدنا!

فاذا ابصرتنی، ابصرتہ

و اذا، ابصرتہ، ابصرتنا

ویقرب من ھذا ما قیل بالفارسیۃ:

جذبۂ وصل بحدیست میانِ من وتو

کہ رقیب آمد و نشناسد نشانِ من وتو

امام موصوف کے متعلق اسی حقیقت کو مزاحم الخاقانی نے ایک قطعہ میں نظم کیا تھا:

لقد صار فی الآفاق احمد محنۃ — وامر الوریٰ فیہا فلیس بمشکل

تریٰ ذا الھویٰ جھلا لاحمد مبغضاً — وتعرف ذا التقویٰ یحب ابن حنبل

اور یہ بالکل حق ہے۔ آج بھی دیکھ لو۔ ارباب بدعت کو کبھی امام موصوف کا مسلک خوش نہ آئے گا۔ ان کی محبت سے ان کا دل بالکل کورا ہوگا۔ بلکہ کہیں گے کہ ان کا طریقہ تو تاویل ورائے کی عقلمندی سے خالی اور محض ظاہر پرستی اور بے دانشی و بے علمی کا مجموعہ ہے۔ حتیٰ کہ الرحمٰن علی العرش استوی اور ید وعلو و نزول کے دقیق فلسفیانہ معانی بھی ان کو معلوم نہ تھے اور تجسم وجہت کے اعتقاد میں مبتلا! برخلاف اس کے عصابۂ صالحہ کتاب وسنت وطائفۂ حقۂ ما انا علیہ واصحابی کہ جمیع طرق ومذاہب بدعیہ سے یکسو و دامن کشاں ہیں اگرچہ "ان تعض باصل شجرۃ" کی نوبت آجائے[1]۔ اور مبتدعین وارباب ہوائے کے تمام شیوہ ہائے تیرہ وروش ہائے نافرجام سے بکلی پناہ ڈھونڈھتے ہیں اگرچہ اس کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے نزدیک مبغوض ومردود ہوجائیں، تو ان کا حال یہ ہے کہ اس امام اہل السنت کی محبت و پیروی کو اپنے ایمان کی زینت اور اپنے عقاید کی خوبروئی و زیبائی سمجھتے ہیں اور ان کے مسلک سنت وحکمت[2] اور طریق محمدیہ

---

[1] یہ وصیت کی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ اعلم الصحابہ بالفتن کو فاعتزل تلک الفرق کلھا ولوان تعض باصل شجرۃ حتیٰ یدرکک الموت" یعنی جب مسلمانوں کی ایک جماعت اور ایک سبیل نہ رہے اور بہت سے مذہبوں اور طریقوں میں بٹ جائیں تو طالب حق کو چاہیئے کہ ان سارے بناوٹی مذہبوں اور جماعتوں سے الگ ہوجائے اور صرف مسلم ومومن رہے۔ اگر ایسا کرنے میں غربت وبیکسی کی وجہ سے درختوں کی جڑ چبا کر جینا پڑے، تو اس کو بھی گوارا کرے مگر الگ الگ مذہب بنانے والوں کا ساتھ نہ دے! پوری روایت صحیحین میں ہے۔

ان السلامۃ عن سلمیٰ وحادیھا — ان لا تمر علی حال بوادیھا!

من حام حول الحمی یوشک ان یقع فیہ

[2] یہاں "حکمت" کا لفظ دیکھ کر آج کل کے عقلاء ملت ومجتہدین علم کلام جدید چونکیں گے کہ ظاہر پرستان حدیث وسنت کے مسلک کو حکمت سے کیا علاقہ؟ ان لوگوں کے نزدیک ظنون وشکوک کا نام حکمت ہے۔ جبکہ "فلسفہ" کے لفظ سے تعبیر کی جائے، اور وہم پرستی والحاد خفی کا نام طریق حکیمانہ

ہے جبکہ تطبیق عقل و نقل کے لقب سے اس کی نمائش کی جائے۔ یہ موقعہ اس کی تفصیل کا نہیں ہے اگر تفسیر البیان کی اشاعت کی نوبت آئی تو اس میں تفصیل ملے گی۔ یہاں صرف اس قدر اشارہ بس کرتا ہے کہ قرآن حکیم کی اصطلاح میں لفظ "حکمت" سے مقصود سنت و اسوۂ اعمال انبیاء کرام ہے۔ لاغیر۔ یہی معنی اللہ کے رسول نے "حکمت" مستعملۂ قرآن کے بتلائے ہیں۔ وہ معنی نہیں ہیں جو معتزلۂ قدیم اور ان کے خوشہ چینوں نے (مثلاً امام رازی رحمۃ اللہ علیہ) یا ان کے چھوٹے بھائیوں نے (یعنی اکثر اشاعرہ رحمہم اللہ نے) سمجھے، اور نہ وہ معنی جس کو آجکل کے معتزلۂ جدید باسم دین الفطرت، اور ان کے چھوٹے بھائی باسم مسلک حکمائے اسلام و حکمت کلامی بیان کرتے ہیں۔ بل قالوا مثل ما قال الاولون۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کو ایک ساتھ دو چیزیں دی گئیں۔ "کتاب" اور "حکمت"۔ وآتیناھم الکتاب والحکمۃ۔ کتاب وحی متلو ہے اور حکمت اس نبی کی منہاج عمل و سنت۔ ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ یہی حکمت وہ خیر کثیر ہے کہ من یؤتی الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی نسبت مقدام کی روایت میں زور دے کر تین بار فرمایا "الا، انی اوتیت الکتاب ومثلہ" تو یہ "مثلہ" ہے۔ یعنی کتاب اللہ اور مثل اس کے سنت و اسوۂ حسنہ رسول اللہ:

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند

اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح کتاب اللہ کی اشاعت و تبلیغ ضروری ہوئی، اسی طرح اس کی بھی کہ "فلیبلغ الشاھد الغائب" تاکہ ایسا نہ ہو کہ "یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ، وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ" لیکن افسوس کہ ایسا ہی ہوا۔ کہا گیا کہ الزیادۃ علی الکتاب نسخ، اور نسخ ہو نہیں سکتا جب تک خبر متواتر نہ ہو، اور خبر متواتر بشروطہ کالمعدوم۔ پس ما وجدتم فیہ کے سوا اور کچھ نہیں یہ پچھلے وقتوں کی بات ہے جبکہ معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھا تھا، مگر اب ترک حکمت و سنت کا جو حال ہو رہا ہے وہ اس سے بھی اشد و اعم ہے۔ واللہ ناصر دینہ وارفع اعلام سنۃ رسولہ وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ اور یہ جو کہا کہ معتزلۂ جدید اور ان کے چھوٹے بھائی، تو ان لوگوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ان کو دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے کہ اللہ نباش اوّل پر رحم کرے! معتزلۂ قدیم علم و عمل دونوں اعتبار سے بدرجہا ان سے بہتر تھے، اور پھر اپنی ایک راہ رکھتے تھے

گر نہ پڑھے نماز کیجیے نیاز   آدمی چاہے کرے کچھ تو؟

یہ عجائب المخلوقات تو کسی مرض کی دوا نہیں اور عملی زندگی سے یک قلم کورے۔ ولھم اعمال من دون ذالک ھم لھا عاملون!

خالص بے مزج بدعت قیاس ورائے کے عشق وشغف سے اپنے قلب و روح کو ہمیشہ معمور و آباد رکھتے ہیں۔ ورحمة اللہ علی القائل وھو ابن اعین (کما نقل الخطیب فی التاریخ) اذا یقول:

اضحی ابن حنبل محنة ماموتة — وبحب احمد یعرف المتنسك

واذا رأیت لاحمد متنقصاً — فاعلم بان ستوره ستهتك!

امام موصوف کا یہی وہ مقام ہے جس کی طرف بُشر حافیؒ نے اشارہ کیا تھا۔ "قام احمد مقام الانبیاء" اور کہا کہ امام احمد کی استقامت وثبات کی آزمائشیں لگاتار چار بادشاہوں نے کی۔ "بعضھم بالضراء وبعضھم بالسراء" مامون، معتصم اور واثق نے ضرب وحبس سے آزمائش کی، اور متوکل نے تعظیم وتکریم اور عطار وبخشش دنیا سے، لیکن "فکان فیھا معتصما باللہ عزوجل" ان کی استقامت و عشق حق پر نہ تو خوف دنیا غالب آیا اور نہ طمع دنیا، دونوں کسوٹیوں پر ان کا سونا یکساں طور پر کھرا نکلا! والبلاء للولاء کالنار للذھب:

بندگان تو کہ درعشق خداوندانند

دوجہاں را بہ تمنائے تو بفروختہ اند

ماموں و معتصم اور الواثق نے جو کچھ کیا وہ معلوم ہے۔ جعفر المتوکل کا یہ حال ہے کہ اس کی خلافت بدعت وارباب بدعت کے زوال وخسران اور سنت و اصحاب حدیث کے امن وعروج کا اعلان عام تھی۔ حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں۔ کہ متوکل باللہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتا کہ کسی طرح پچھلے مظالم کی تلافی کرے۔ ایک بار اس نے بیس ہزار سکے بھیجے اور دربار میں بلایا۔ ایک بار ایک لاکھ درہم بھیجا اور سخت اصرار کیا کہ اس کو قبول کر لیجئے۔ لیکن ہر مرتبہ امام موصوف نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا میں اپنے مکان میں اپنے ہاتھ سے اس قدر کاشتکاری کر لیتا ہوں

جو میری ضروریات کے لئے کافی ہے[1] اس بوجھ کو اٹھا کر کیا کروں گا؟ کہا گیا کہ اپنے لڑکے کو حکم دیجئے وہ قبول کرلیں۔ فرمایا وہ اپنی مرضی کا مختار ہے۔ لیکن جب عبداللہ سے کہا گیا تو انہوں نے بھی واپس کر دیا۔ آخر مجبور ہو کر لانے والوں نے کہا کہ خود نہیں رکھنا چاہتے تو امیرالمؤمنین کا حکم ہے قبول کر لیجئے اور فقرأ و مساکین کو بانٹ دیجئے۔ فرمایا میرے دروازے سے زیادہ امیرالمؤمنین کے محل کے نیچے فقیروں کا مجمع رہتا ہے۔ فقیروں ہی کو دینا ہے تو وہیں دے دیا جائے۔ اس ہنگامہ کی یہاں کیا ضرورت ہے؟ ایک مرتبہ اسحاق بن ابراہیم کے سخت اصرار سے دس ہزار درہم لے لئے تو اسی وقت مہاجرین و انصار کی اولاد میں تقسیم کر دیئے۔

عدیل ہمت ساقی ست فطرتِ عرفی
کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن ست!

ان کے لڑکے راوی ہیں کہ جب خلیفہ متوکل ان کی تعظیم و تکریم میں حد درجہ غلو کرنے لگا تو انہوں نے کہا۔ "هذا امر اشد علی من ذاك۔ ذاك فتنة الدین و هذا فتنة الدنیا" یہ معاملہ تو گذشتہ معاملہ سے بھی کہیں زیادہ میرے لئے سخت ہے۔ وہ دین کے بارے میں فتنہ تھا اور یہ فتنۂ دنیا ہے! یعنی مصائب و محن کی آزمائش کہیں زیادہ پرامن ہے، بمقابلۂ آزمائش نعیم دنیا و دعوت طمع و ترغیب کے، اور یہ بالکل حق ہے۔ کتنے ہی شہسواران ثبات و استقامت ہیں جو پہلے میدانِ آزمائش سے تو صحیح و سلامت نکل گئے، مگر دوسری راہ سامنے آئی۔ تو

---

[1] حافظ ابن جوزی اور خطیب نے لکھا ہے کہ امام موصوف کا ذریعۂ معاش یہ تھا کہ اپنے مکان کی زمین میں تھوڑی سی کاشتکاری کر لیتے اور اسی کے حاصل پر قانع رہتے۔ زراعت کی زکوٰۃ سال بسال ادا کرتے اور اس بارے میں ان کا عمل حضرت عمر کے فرمانِ خلافت پر تھا۔ جو انہوں نے ارضِ سواد (عراق) کی نسبت نافذ فرمایا تھا۔ علی کل جریب درهمًا و قفیزًا۔" غور کرو۔ یہ حال علماء سلف کا تھا، اور جو حال آج علماء دنیا کی دنیا پرستیوں کا ہو رہا ہے وہ معلوم ہے۔ یاکلون اموال الناس بالباطل۔ الخ

اول قدم ہی میں ٹھوکر لگی، حالانکہ مرد کامل وہ ہے جس پر یدعون ربہم خوفاً و طمعاً کا مقام ایسا طاری ہوجائے کہ دنیا کا خوف اور دنیا کی طمع، دونوں قسم کے حربے اس کے لئے بالکل بیکار ہو جائیں - فھم القوم الذین لا یشقی جلیسھم، ولا یستوحش انیسھم، قد تاملوا مطالبھم برفع اکفھم الی خالقھم، لا یحتاجون فی حوائجھم الا الیہ، ولا یعولون فی مقاصدھم الا علیہ! وللہ در ما قال:

ونبئت لیلی ارسلت بشفاعۃ الی، فھلا نفس لیلی شفیعھا

اکرم من لیلی علی، فتبتغی بہ الوصل، ام کنت امرءًا لا اطیعھا

فصل

یہ تو اوائل کا حال تھا- عہد متاخرین میں بھی دیکھو تو ظہور عزیمت دعوت و تجدید امت کی بوالعجبیوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا- آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں جب دعوت عامۂ امت، و تجدید شریعت و احیا السنۃ بعد موتھا و اخماد البدعت بعد شیوعھا وارتفاعھا کی روح القدس نے آیۃ من آیات اللہ، و حجۃ قائمۃ من حجج اللہ، شیخ المصلحین و ملاذ المجددین، سند الکاملین، و امام العارفین وارث الانبیاء، و قدوۃ الاولیاء، حضرت شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وجود مبارک میں ظہور کیا، اور عہد اواخر کے تمام مسالک دعوت و تجدید کی ریاست و فاتحیۃ اور قطبیت و مرکزیت کا مقام اس مجدد اعظم کے سپرد کیا گیا، تو کیا اس زمانے میں بجز شیخ الاسلام ممدوح کے اور کوئی عالم حق نہ تھا؟ تاریخ اسلام میں اس عہد کی جس قدر تفصیلات ملتی ہیں، کسی عہد کی نہیں ملتیں- اگرچہ عربی خلافت کے بکلی اختتام، اور فتنۂ عظیمہ یاجوج و ماجوج (تاتار) کے من کل حدب ینسلون، اور

تفرق مذاہب، وتشتت جماعت، وشیوع بدعات، واحاطۂ تقلید، وسد باب نظر و اجتہاد کے مفاسد و مصائب اس زمانے میں پوری طرح ظہور کر چکے تھے، اور مسلمانوں کے علمی و عملی تنزل کا بیج اچھی طرح بار آور ہو چکا تھا، بایں ہمہ آئمۂ دین اور کاملین علوم کی ایک جماعتِ کثیرہ ہر حصۂ ملک میں موجود تھی، اور علی الخصوص دیارِ مصر و شام تو علماء و کاملین امت سے مملوٗ و مشحون تھے۔ حتیٰ کہ قاضی ابوالبرکات مخزومی اپنے بائیہ میں صرف دیارِ شام کی نسبت کہتے ہیں:

وکان فی عصرہ بالشام یومئذ

سبعون مجتہداً من کل منتخب!

پھر یہ بھی نہیں کہ صرف ایسے ہی لوگ ہوں جن کا شمار عامۂ علماء و مشائخ میں کیا جائے، بلکہ بڑے بڑے حفاظ و نقاد علوم اور خواص وا ظم نظر و اجتہاد موجود تھے۔ جن کے بعد اس درجہ کے لوگ تمام عالم اسلامی میں پیدا نہیں ہوئے۔ ابوالفتح ابن سیدالناس اشبیلی، شمس الدین مقدسی، ابوالعلاء انصاری السبکی، قاضی ابن الزملکانی، سید ابوالمحاسن دمشقی، ابوعبداللہ حریری، ابوالعباس ابن عمر الواسطی، حافظ ابوالفداء عماد الدین، حافظ احمد بن قدامہ مقدسی، ابواسحاق السعدی، امام برہان الدین الفزاری، حافظ صلاح الدین بعلبکی، شیخ صفی الدین بغدادی، حافظ ابن شامہ دمشقی، قاضی تقی الدین دقوقی، شیخ عمر بن الوردی، امام ابوالعباس بن حجی، حافظ جمال الدین عقیلی، حافظ برزالی الاشبیلی تقی الدین السبکی، حافظ جمال الدین المزی، امام تقی الدین ابن دقیق العید، ابوحیان صاحب تفسیر، حافظ ابوعبداللہ الذہبی، اور ان کے علاوہ بے شمار آئمہ و اعلامِ عہد جن کے حالات حافظ ذہبی اور ابن قدامہ و عسقلانی کی مصنفات میں موجود ہیں۔ تو تم ان لوگوں کی نسبت کیا سمجھتے ہو؟ کون ہے جو ان بزرگوں کے فضل و کمال اور ورع و تقویٰ اور اتباع حق و سداد سے انکار کر سکتا ہے؟ علی الخصوص حافظ مزی، برزالی، ابن دقیق العید، اور حافظ ذہبی تو اس پایہ کے بزرگ تھے، کہ ان میں سے ہر شخص علومِ سنت

کا خزانہ اور حفظ و نقد کا امیر المومنین تھا۔ علماء حدیث متاخرین میں سے کسی مصنف کا بھی ہم اخلاف امت، و بیچارگان دورۂ آخر پر اس درجہ احسان نہیں ہے جس قدر حافظ ذہبی کا۔ اور اگر کوئی دوسرا اس وصف میں ان کا شریک ہے تو وہ صرف ان سے متاخر حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ ولیس لھما ثالث۔ یہی وہ دو حافظ و ناقد علوم حدیث ہیں جنہوں نے نہ صرف سلف کے ذخائر و خزائن خلف کے لئے محفوظ کر دیئے، بلکہ تمام مشکلات و معضلات کار کو صاف کر کے اور ضبط و اتقان، و تہذیب و ترتیب و تلخیص و تشریح، و نقد رجال و اسناد سے آراستہ و پیراستہ کر کے تمام آنے والی امت کے لئے اتباع سنت کی راہ بالکل سہل و آسان کر دی۔ علوم اسلامیہ پر پہلا دور تدوین کا گذرا ہے اور دوسرا انضباط و تنقیح اور تہذیب و تنظیم کا، سو علم حدیث کے دور دوم میں ان دو بزرگوں کی خدمات سب پر فائق اور سب سے انفع واقع ہوئی ہیں۔ یہ انہی کی خدمات حسنہ کا نتیجہ ہے کہ آج یہ علم مقدس اس قدر صاف و سہل ہو گیا ہے کہ طالبین عمل بالسنت کے لئے کسی طرح کی عذر داری و بہانہ جوئی کی گنجائش باقی نہ رہی۔ امت کا کوئی فرد اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ حدیث پر عمل کرنا بمقابلہ کتب جدل و خلاف و قال اقول، وکذا عند زید و کذا عند فلاں کے زیادہ مشکل ہے۔ بلکہ جس طالب صادق کا جی چاہے، آنکھیں بند کر لے اور اس صراطِ مستقیم پر بے غل و غش و بے خوف و خطر دوڑتا چلا جائے فھو طریقا مستقیما سھلاً، مسلوکا، واسعًا، موصلاً الی المقصود والمطلوب اور رضی اللہ عن الذھبی حیث یقول

الفقہ قال اللہ قال رسولہ   ان صح، والاجماع فاجھد فیہ

وحذار من نصب الخلاف جھالۃ   بین النبی و بین رای فقیہ

پس غور کرو کہ ایسے اصحاب کمال و آئمہ علم تھے جو اس عہد میں موجود تھے، با ایں ہمہ یہ حقیقت سورج کی طرح چمک رہی ہے اور ہر صاحب بصارت پر روشن کہ مقام عزیمت دعوت کا جو ایک مقام خاص ہے، وہ ان میں سے کسی کے حصے میں بھی نہ آیا۔ وہ صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہی کے لئے تھا۔ سب اپنے دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے، لیکن

انہوں نے وہ سب کام بھی ان سے بہتر کیے جو وہ سب کر رہے تھے۔ اور پھر ان سے بڑھ کر یہ کہ سب کو راہِ عزیمت، دعوت و تجدید و احیاء ملت، و رفع اعلام سنت، و اخماد شر و بدعت، و کشف و ابراز معارف مستورۂ کتاب و سنت، و غوامض و سرائر معارف و حکمت نبوت، و انفجار ینابیع الحکمت من اللسان والجنان، و جہاد فی سبیل اللہ بالسیف والقلم واللسان میں منزلوں اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ اور علوم و اعمال وہبیہ و سماویہ کی ان بلندیوں پر تن تنہا جا کھڑے ہوئے جہاں ان کے اقران و معاصرین کے وہم و تصور کو بھی بار نہیں۔ حتیٰ کہ خود ان کے معاصرین کو یک زبان و یک قلم ہو کر اعتراف کرنا پڑا: "ما رأینا مثلہ وانہ ما رای مثل نفسہ" نہ تو ہماری آنکھوں نے اس کا مثل دیکھا اور نہ خود اس کو اپنا سا کوئی نظر آیا

اے تو مجموعۂ خوبی، بچہ نامت خوانم؟

خود حافظ ذہبی اپنے معجم شیوخ میں جب اس نادرۃ الارض و اعجوبۃ الدھر کے اوصاف و مدائح لکھتے لکھتے تھک گئے اور وہ ختم نہ ہوئے، تو بالآخر یہ کہہ کر خاموش ہو جانا پڑا "وھو اکبر من ان ینبہ علی سیرۃ مثلی۔ و واللہ لو حلفت بین الرکن والمقام انی ما رایت بعینی مثلہ و انہ ما رای مثل نفسہ، لما حنثت!" ان کا مقام اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ مجھ جیسا شخص اُن کی سیرت و فضیلت بیان کرے۔ قسم خدا کی اگر میں خانہ کعبہ میں عین رکن و مقام کے درمیان کھڑے ہو کر قسم کھاؤں کہ نہ تو میری آنکھوں نے ان کا مثل دیکھا اور نہ خود انہوں نے اپنا سا، تو میری قسم سچی ہوگی، اور میرے لئے کفارۂ یمین نہیں!" وکفاك بالذھبی شاھداً[1]:

تقی الدین اضحی بحر علم ۔۔۔ یجیب السائلین بلا قنوط
احاط بکل علم فیہ نفع ۔۔۔ فقل ما شئت فی البحر المحیط

---

[1] یہ امام ذہبی کا قول ہے، اور خود امام موصوف کے تبحر و جامعیت علم کا جو حال تھا، اُس کیلئے ان کے شاگرد علامہ تاج سبکی کا یہ قول کفایت کرتا ہے: "وھو رجل الرجال فی کل سبیل کانما جمعت الامۃ فی صعید واحد فنظرھا!" (قال فی طبقاتہ الکبریٰ۔

حافظ ابو الحجاج مزی صاحب تہذیب جس مرتبہ کے امام الحدیث تھے، اس کا حال امام ذہبی کی مصنفات خصوصاً تذکرہ و معاجم اور طبقاتِ کبریٰ سبکی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اُن کے تمام معاصرین اس پر متفق ہیں کہ وہ نہ صرف جرح و تعدیل رجال کے امام تھے بلکہ اس فن کے اماموں کے امام۔ ہزاروں انسانوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت کا فیصلہ ان کے قبضۂ علم میں تھا۔ بااین ہمہ یہ مقامات اور ہیں، اور نسبت نبوت، و نیابت کاملۂ منصب رسالت، و عزیمت دعوت کبریٰ، و تشبہ و تخلق بالانبیاً کا مقام دوسرا ہے۔ وہ تو اس عہد میں صرف ابن تیمیہ ہی کے لئے تھا چنانچہ خود ان کو بھی وہی کہنا پڑا جو اس عہد کے تمام اصحاب حق نے کہا تھا۔ "ما رائت مثلہ ولا رای ھو مثل نفسہ، وما رایت احداً اعلم بکتاب اللہ و سنۃ رسولہ ولا اتبع لھما منۃ" نہ میں نے ان کا مثل دیکھا، اور نہ خود انہوں نے کسی کو اپنا ہمتا پایا۔ اور نہ میں نے کسی شخص کو ان سے زیادہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والا اور کتاب و سنت کا اتباع کرنے والا دیکھا حافظ موصوف نے ایک اور موقعہ پر کہا۔ "لم یر مثلہ منذ اربع ماتہ سنۃ" چار سو برس سے ایسا باکمال پیدا نہیں ہوا:

قمریاں پاس غلط کردۂ خود می دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے۔ "ما رایت مثلہ ولا رائ ھو مثل نفسہ" یہ جملہ ان کے اکثر معاصرین کی زبان پر بعینہٖ جاری ہوا ہے۔ ذہبی اور مزی کی زبانی سن چکے۔ حافظ برزالی اور ابن حجی سے ایسا ہی منقول ہے۔ شیخ عماد الدین واسطی، ابن سید الناس، ابن نصر مقدسی، ابن دقیق العید وغیرہم نے بھی یہی کہا۔ الرد الوافر اور قول الجلی کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ تقریباً سبھوں نے بعینہٖ اسی جملے کو دہرایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یا تو کسی عارف و جوہر شناس نے ان کے وصف میں سب سے پہلے یہ جملہ کہا تھا، لیکن کچھ ایسا صحیح و موزوں واقع ہوا کہ تمام باکمالان عہد کی زبانوں پر

خود بخود چڑھ گیا:

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود!

یا اس نادرۃ الدھر کی بے ہمتائیوں کا یہ حال تھا کہ جو نظر پڑتی تھی۔ بے ساختہ یہی کہہ اٹھتی تھی۔ سورج کو کروڑوں آنکھیں دیکھتی ہیں، لیکن ہر آنکھ کو یہی نظر آتا ہے کہ روشن ہے۔ یہ تو کوئی نہیں کہتا کہ روشن نہیں؟ پریوں کے وجود میں لوگوں کو اختلاف ہے لیکن خوبصورت انسانوں کے بارے میں سب کی رائیں متفق ہیں۔ ایک حسین چہرے کو جو دیکھے گا وہی کہے گا جو سب کی زبانوں سے نکل رہا ہے:

این نگاہیست کہ شائستہ دیدارے ہست!

مشہودات و محسوسات میں ہمیشہ تمام ارباب انظار و احساس یک حکم و یک زبان ہوتے ہیں۔ یہاں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ الا یہ کہ کوئی اندھا یا فاتر الحس ہو سو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے عہد میں بھی ایسے لوگ تھے جن کی نظروں پر تعصب و نفسانیت یا جہل و تقلید کا حجاب پڑ گیا تھا، پس ان کو وہی نظر آیا جو بند آنکھوں کو نظر آسکتا ہے:

وما ضر نور الشمس ان کان ناظراً الیھا عیون لم تزل دھرھا غمضاً

لیکن ان کا یہاں ذکر نہیں۔ اصحاب بصارت جتنے تھے، ان سب نے بالاجماع یہی کہا "ما رأینا مثله ولا رای ھو مثل نفسه" اور یہی وہ خصائص بینۂ و باہرۂ مقام تجدید و نیابت نبوت کے ہیں جن کی نسبت بار بار کہہ رہا ہوں کہ بڑے سے بڑے سر کو بھی وہاں جھکے بغیر چارہ نہیں:

فانك شمس والملوك كواكب اذا طلعت لم يبد منهن كوكب!

تم جانتے ہو کہ ایک چیز خوبصورتی ہے، اور ایک چیز اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جس کے لئے زبان کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن آنکھ سمجھتی اور ذوق پہچان لیتا ہے۔ خواجہ حافظ نے اس کو "آن" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اور پھر جب بالکل مجبور ہو گئے تو اشارہ کر کے چھوڑ دیا:

این کہ می گویند "آں بہتر ز حسن" یار ما "این دارد و" "آن" نیز ہم!

تو وہ جو ایک چیز ہے کہ "آنے دارد" اُس کے لئے کسی کا صرف خوبصورت ہونا ہی کافی نہیں۔ خوبصورت تو ہزاروں ہوتے ہیں مگر "آن" رکھنے والے چشم و ابرو لاکھوں خوبان روزگار میں بھی ڈھونڈھے نہیں ملتے۔ اور اگر مل جائیں تو سمجھنا چاہیئے کہ فطرت کی بڑی ہی فیاضی بلکہ غیر متوقع اسراف ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے عہد میں حسینوں اور خوبرویوں کی کمی نہ تھی۔ معاجم ذہبی اور دوو کامنہ عسقلانی سے اگر اس عہد کے صرف ایسے علمار کبار کی ایک فہرست تیار کی جائے جو اپنے تبحر اور کمال علم و عمل کی بنا پر ائمہ عصر و اساطین علوم تسلیم کئے گئے تو ان کی تعداد سو سے بھی یقیناً متجاوز ہو گی۔ صاحب الرد الوافر نے صرف ان علمار کا ذکر کیا ہے جنھوں نے شیخ الاسلام کے مرتبۂ اجتہاد مطلق و امامت فی الدین اور تجدید و احیار شریعت کا اعتراف کیا۔ اُن میں سے صرف معاصرین کو چھانٹ لیا جائے تو ساٹھ ستر سے کم نہ ہونگے۔ یہ سب یقیناً حسین تھے اور بعض کی حسن و رعنائی پر تو ایک زمانہ فریفتہ و شیدا ہوا اور کتنے ہی حسینان روزگار نے ان سے دلربائی و دلآویزی کے بھید اور نکتے سیکھے۔ تاہم اس کو کیا کیجئے کہ وہ جو ایک چیز حسن و خوبروئی سے بھی بلند تر ہے یعنی عزیمتِ دعوت و تشبہ بالانبیار کی شان و آن، تو اس کے لئے صرف حسن طلعت و بلندی قامت ہی کافی نہیں۔ ان باتوں کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیئے۔ اور وہ اس عہد میں صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہی کے حصے میں آیا تھا:

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری ست
کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری ست!

حافظ برزالی، ابوالحجاج مزی، ابن سیدالناس، ابن دقیق العید، ذہبی، ابن نصر مقدسی، ابوحیان صاحب تفسیر، ان خوبانِ عہد کے حسن و جمال پر کون نام دھر سکتا ہے؟ لیکن وہ سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ کا سا جمال ہماری آنکھوں نے بھی

دیکھا اور ان کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ ہم جیسے ان کی تعریف و توصیف کریں۔ تو غور کرنا چاہیئے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس کو یہ سب بھی نہ پا سکے؟ اس کو خود شیخ ابوحیان نے امام ابن تیمیہ کی ایک مجلس دیکھتے ہی کہہ دیا تھا[1]

قام ابن تیمیۃ فی نصر شرعتنا — مقام سید تیم اذ عصت مضر

فاظہر الحق اذ آثارہ دوست — واخمد الشواذ طارت لہ شرر

کنا نحدث عن حبر یجئ، فھا — انت الامام الذی قد کان ینتظر

تو یہ جو کہا کہ "مقام سید تیم" اور "انت الامام الذی قد کان ینتظر" سو یہی وہ چیز ہے کہ اوروں کو سب کچھ ملا تھا مگر یہ چیز نہیں ملی تھی، اور یہی ہے کہ ہمیشہ سینکڑوں ہزاروں اصحاب طریق میں سے کسی ایک رجل الرجال ہی کے حصے میں آئی ہے۔ شیخ نجم الدین اسحاق نے اپنے مشہور رثائیہ میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ کیا تھا:

---

[1] یہ وہی ابوحیان امام النحو والادب ہیں جن کی تفسیر بحر المحیط اور اس کا مختصر نہر مصر میں چھپ گیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے "دور" ذہبی سے نقل کیا ہے کہ جب امام ابن تیمیہ مصر گئے تو شیخ ابوحیان سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی مجلس میں اس درجہ معترف ہوئے کہ فی البدیہہ اشعار مذکورۂ متن انکی مدح میں کہہ کر سنائے، اور کہا "واللہ ما رایت عینای مثل ھذا الرجل" لیکن بعد کو صحبت سازگار نہ ہوئی۔ نحو کے کسی مسئلہ کی نسبت ابوحیان نے سیبویہ کا حوالہ دیا۔ ابن تیمیہ نے کہا۔ یہ سیبویہ کی ان غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے جو اس نے قرآن کے متعلق کی ہیں۔ وما کان سیبویہ نبی النحو ولا معصوما اس پر ابوحیان نہایت برافروختہ ہوئے اور پھر آخر تک مخالف رہے۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں "وصیر ذلک ذنبا لا یغفر" یہی وجہ ہے کہ تفسیر میں ایک موقعہ پر امام ابن تیمیہ کا ذکر اس طرح کیا ہے جس سے نہایت نفرت و مخالفت ٹپکتی ہے۔ کیا خوب فرمایا حبرۃ الامۃ حضرت ابن عباس نے "استمعوا علی العلماء ولا تصدقوا بعضھم علی بعض، فوالذی نفسی بیدہ، لھم اشد تغایرا من التیوس فی زربھا" وقال بعض الائمۃ یوخذ بقول العلماء فی کل شیئ الا قول بعضھم فی بعض" حافظ ابن عبدالبر نے کتاب العلم میں یہ اقوال نقل کئے ہیں اور حافظ ذہبی نے قول العلماء بعضھم فی بعض پر ایک رسالہ لکھا اور کہا کہ معاصرت سے بڑھ کر علماء کے لئے کوئی ابتلا نہیں۔ "ولو فتحنا

وقد علم الرحمٰن أن زماننا | تشعب فيه الرای ای تشعب
فجاء بحبر عالم من سراتهم | لسبع مئين بعد هجرة يثرب
يقيم قناة الدين بعد اعوجها | ينقذها من قبضة المتحصب
وجاهد فی ذات الإله بنفسه | وبالمال والاهلين والام والاب
ومن رام حبراً دونه اليوم فی الورا | فذاك الذی قد رام عنقاء مغرب
عليم بادواء النفوس يسوسها | بحكمة فعل الطبيب المجوب

آخری شعر محض شاعرانہ مداحی نہیں ہے۔ ایک نہایت ہی دقیق نکتہ کی طرف اشارہ ہے "علیم بادواء النفوس" اور بحکمۃ فعل الطبیب المجوب" یعنی مقام نبوت کی وراثت و نیابت کاملہ۔ یہ بات کہ جس طرح ایک طبیب حاذق ہر طرح کی بیماریوں اور ان کے اسباب و آثار و نتائج کو جانتا، اور ہر عمر و مزاج کے بیماروں کا علاج کرتا، اور کمال حذاقت و فراست طبیہ کی وجہ سے صرف چہرہ دیکھ کر یا نبض

حاشیہ بقیہ صفحہ (۱۶۱)

هذا الباب واخذنا بقول المعاصرين بعضهم فی بعض لما سلم لنا احد من الائمة بل اجل الصحابة والتابعين" اور یہ بالکل حق ہے۔ امام ابن عبد السلام کا قول اگر حافظ ابن الصلاح کی نسبت ہم قبول کرلیں اور حافظ ابن صلاح کا ابن عبد السلام کی نسبت، یا حافظ سیوطی کی رائے حافظ سخاوی کی نسبت مان لی جائے اور حافظ سخاوی کی سیوطی کی نسبت تو اس کا نتیجہ صرف یہی نکلے گا کہ ہم دونوں سے بدظن ہو جائیں گے۔ حالانکہ دونوں کمال حسن ظن و اعتقاد کے مستحق ہیں۔ بڑے بڑے اعاظم علم و عمل کو اس بارے میں لغزش ہوئی اور ہم کو یقین ہے کہ ان کی خدمات کثیرہ و عظیمہ علم و عمل کے مقابلے میں یہ لغزش ضرور بخش دی جائے گی۔ ہم بے مائگان علم و تہی دستان عمل کو زیب نہیں دیتا کہ ان میں سے کسی کی نسبت بھی حرف سوء نکالیں یا ان کے ادب و تعظیم میں مضائقہ کریں۔ جنہوں نے اشرفیاں کمائی تھیں انہوں نے ایک مٹھی مٹی کی بھی بھر لی لیکن ہمارے دامن میں بجز گرد و خاک کے اور کیا ہے؟ ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذين سبقونا بالايمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذين امنوا!

پر انگلیاں رکھ کر سب کچھ سمجھ لیتا اور پرکھ لیتا ہے، اسی طرح جماعت و ملت کے تمام امراض جدیدہ و مزمنہ اور ظاہرہ و مخفیہ کا نباض ہونا، اور انسان کی ذہنی و نفسی اور روحانی و معنوی بیماریوں کو بہ یک نظر تفرس پہچان لینا، اور ٹھیک ٹھیک ان کی حالت و استعداد اور مقتضیات کے مطابق درجہ بدرجہ علاج کرنا، اور ہر مریض کو اس کی حالت کے مطابق نسخہ دینا، اعمال مہمۂ و مختصۂ نبوت میں سے ہے

اور یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ میں "یزکیھم" اسی جانب اشارہ، پس انبیاء کرام کے بعد یہ مقام صرف انہی نفوسِ خاصہ کو حاصل ہو سکتا ہے جو اسوۂ حسنہ نبوت اور اخلاق و صفات نبوت کے کامل تاسی اور سنت سنیہ مخالصۂ و مخصنہ کے کمال اتباع و تفانی سے وراثت و نیابت انبیاء و رسل کے مرتبہ پر پہنچ جاتے ہیں، اور معالجۂ نفوس، و تداوی ارواح و قلوب، و طبابت اقوام و ملل کے تمام اسرار و خفایا ان پر اس طرح کھل جاتے ہیں کہ بقول صاحب تفہیمات "گویا ہمہ را میان ہر دو چشم خود متمثل و متشبح می بینند، و نہ از چشم بصیرت بلکہ از چشم سر مشاہدہ می کنند" کا مقام کشف و رفع حجب حاصل ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے غنیۃ الطالبین میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "ھم حراس القلوب، جواسیس الارواح، الامناء علی السرائر والخفیات، المطلعون علی ما اضمرت بواطن العباد وانطوت علیہ النیات" وہ دلوں کے نگران و نگہبان، روحوں کی جاسوسی کرنے والے، رازوں اور بھیدوں کے خزانچی، اور سینوں کے اندر کی چھپی ہوئی باتوں اور دلوں کی تہہ کی نیتوں کی خبر رکھنے والے لوگ ہیں! تو اگرچہ اس عہد میں بڑے بڑے اصحاب علم و عمل موجود تھے، مگر "علیم بادواء النفوس" اور "الطبیب المجرب" ہونے میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، اور کچھ تھا تو مرتبۂ قوت نظری سے قوت عملی تک نہیں پہنچا تھا۔ ذٰلک من عمل النبوۃ۔ یہ بات صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہی کے حصے میں آئی تھی اور ہر عہد میں صرف، ورثاء و نقباء نبوت و اصحاب عزائم و تجدید ہی کے

حصے میں آتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کی طرف حافظ ذہبی نے ان کے حالات میں اشارہ کیا کہ "ولقد نصر السنۃ المحضۃ والطریقۃ السلفیۃ، واحتج لہا ببراھین و مقدمات وامور لم یسبق الیہا واطلق عبارات احجم عنہا الاولون والاخرون" یعنی ابن تیمیہ نے سنت محضہ اور طریقت خالصۂ سلف واوائل کی حمایت کی، اور اس کے لئے ایسی دلیلوں اور مقدموں سے احتجاج کیا جو ان سے پہلے کسی سے بھی بن نہ آئے۔ تو یہ جو کہا کہ "نصر السنۃ المحضۃ" تو ایک عجیب نکتہ کہہ دیا اور گویا ابن تیمیہ کی پوری سوانح عمری بیان کر دی۔ یہی وہ فضل مخصوص ہے جو ذہبی و برزالی و مزی و ابن دقیق العید جیسے شیوخِ عہد کے سروں کو بھی ابن تیمیہ کے سامنے اطفال مکاتب کی طرح جھکا رہا ہے۔ صدر اول کے بعد سے ہدیٰ سنت کا معاملہ بہت نازک ہو گیا۔ اور ایک راہ "اتباعِ سنت" کی ہو گئی اور ایک اتباع "سنت خالص و محض" کی، والقصہ بطولہا۔ تو اس عہد میں علم و عمل سنت والے ضرور تھے۔ مگر سنت محضہ و خالصہ" کا مقام صرف ابن تیمیہ ہی کو ملا تھا، اور اسی کمال تشبہ و تخلق بصفاتِ نبوت اور بے میل و بے داغ اتباع و تقائی سنت نے ان کو اعمال نبوت کی وراثت کاملہ و نیابت حقہ کے منصب ارفع و اعلیٰ پر پہنچا دیا تھا:

اے گل بہ تو خور سندم، تو بوے کسے داری

یہی حافظ ذہبی ایک دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں۔ "وھو عجیب فی استحضار السنۃ واستخراج الحجج منہا بحیث یصدق علیہ ان یقال کل حدیث لا یعرفہ ابن تیمیۃ فلیس بحدیث ولکن الاحاطۃ للہ تعالیٰ" [1] یعنی علوم سنت کے

---

[1] حافظ ذہبی نے امام ابن تیمیہ کا ترجمہ سات سے زیادہ موقعوں پر لکھا ہے۔ ہر مقام پر پوری تفصیل سے حالات لکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے ہوئے جوشِ ارادت و اضطرابِ عقیدت سے بے خود ہو ہو جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ تفصیل تینوں معاجم میں کی ہے۔ یعنی معجم کبیر، اوسط، صغیر۔ اور چونکہ بہ لحاظ اخذ سند و اجازت مسند امام احمد و سماعت روایات،

وقرأت مصنفات، امام ابنِ تیمیہ کے شاگردوں میں داخل ہیں۔ اس لئے اپنے معجم شیوخ میں بھی حالات لکھے ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ تذکرۃ الحفاظ میں بالاختصار اور تاریخِ الاسلام کبیر میں بالتفصیل تذکرہ کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان کے ابتلاؤں اور واقعات مصریہ وشامیہ کے حالات لکھے ہیں۔ امام موصوف کی ایک مشہور کتاب منہاج السنہ ہے۔ اس کو انہوں نے مختصر کیا تھا۔ اس کے دیباچہ میں بھی مفصل ترجمہ درج کیا ہے۔ علاوہ بریں ابن تیمیہ کی اکثر مصنفات اپنے قلم سے لکھی ہیں، اور ان کے آخر میں یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ "میں نے خود مصنف سے بہ شرائط قرات وسماعت ان کی اجازت لی" مختصراً تذکرہ حالات ومناقب بھی کر جاتے ہیں۔ من احب شیئاً اکثر ذکرہ۔ قول مندرجۂ متن معجم کبیر میں ہے۔ حافظ ابن ناصر الدین شافعی نے الرد الوافر میں اور حافظ عسقلانی وسیوطی نے درر کامنہ اور طبقات الحفاظ میں یہ تمام اقوال یکجا کر دیئے ہیں۔ نیز حافظ ابن قدامہ وحافظ عماد الدین واسطی اور ابوحفص بزار وغیرہم نے سیرت ابن تیمیہ میں۔ اور واضح رہے کہ صرف حافظ ذہبی ہی کا یہ حال نہیں ہے۔ الرد الوافر میں تقریباً ایک سو اکابر ومشاہیر عہد وقریب العہد کے اقوال نقل کئے ہیں۔ جنہوں نے بالاتفاق ان کے مجتہد مطلق، امام العصر، نادرۃ الدہر، نابغۃ الاسلام، اوحد الزمان، مجدد کتاب وسنت، محی الملت، انموذج الخلفاء الراشدین، آخر الائمۃ المجتہدین، مفتی الفرق، الامام فی کل علم وفن اعجوب العلماء القرون الوسطی ہونے کا ایسے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ جن سے زیادہ توصیف وتمجید کے الفاظ نہیں ہو سکتے:

نہ من براں گلِ عارض غزل سرایم وبس

کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند!

یہ حال تو معاصرین اور قریب العہد علماء کا ہے۔ بعد کے مؤرخین کا یہ حال ہے کہ الرد الوافر پر مصر وشام کے مشاہیر علماء وائمۂ عصر نے تقریظیں لکھی ہیں۔ ان میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور قاضی عینی حنفی شارح بخاری بھی ہیں۔ قاضی عینی لکھتے ہیں کہ جو شخص ابن تیمیہ کے مراتب عالیہ علم وعمل واجتہاد وامامت سے انکار کرتا ہے وہ یا تو مجنون لایعقل ہے، یا کمال سفیہ وبلید یا سمعت شریر ومفسد۔ حافظ عسقلانی کی رائے اس تقریظ پر موقوف نہیں۔ ان کی شیفتگی وارادت کا جو حال ہے۔ وہ درر کامنہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں نہایت شرح وبسط سے ترجمہ لکھا ہے۔ اور معاصرین کی شہادتیں ان کے فضل وکمال مخصوص پر جمع کی ہیں۔

استحضار اور ان سے دلائل و براہین کے استنباط میں ان کا رسوخ و احاطہ عجیب و غریب ہے۔ یہاں تک کہ ان پر یہ بات صادق آتی ہے کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں! اور معجم شیوخ میں لکھتے ہیں "نصر السنۃ المحفوظۃ حتی اعلی اللہ تعالیٰ منارہ وجمع قلوب اہل التقویٰ علی محبتہ" تو "سنت محفوظہ" کا علم و عمل ہی وہ نعمت عظمیٰ ہے جو اعمالِ نبوت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ حافظ برزالی کا قول شاید اوپر گذر چکا ہے۔ "ما رأینا احداً اعلم بکتاب اللہ وسنۃ رسولہ ولا اتبع لھما منہ" ہم نے ابن تیمیہ سے بڑھ کر نہ تو کسی کو کتاب وسنت کا عالم دیکھا اور نہ عامل۔ سبحان اللہ کیسے جامع و مانع لفظوں میں تعریف کی ہے کہ اس آدھی سطر کے اندر وہ سب کچھ آگیا جو ابن تیمیہ کی نسبت کہا جا سکتا تھا۔ ایسے ممدوح کے لئے ایسے ہی مداحوں کے قلم و زبان کی ضرورت تھی۔ پس یہ چیز کہ کمال علم کتاب وسنت کے ساتھ کمال عمل کتاب وسنت بھی جمع ہو جائے، وہ فضل مخصوص ہے جس کے بغیر نبوت کا پورا پورا علمی و عملی ورثہ نہیں مل سکتا گو بقدر استعداد و استحقاق ہر سالک طریق کے حصے میں کچھ نہ کچھ ضرور آتا ہے۔ معاصرین ابن تیمیہ کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ اس وراثت میں حصہ نہیں رکھتے تھے؟ لیکن ورثہ کا پانا دوسری چیز ہے اور وہ کامل اور پوری پوری وراثت دوسری چیز ہے جس پر خلافت و نیابت اور جانشینی و قائم مقامی کا لقب صادق آجائے۔ ولنعم ما قیل:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

اور یہ جو کہا، تو صرف جوش عقیدت کی مداحی نہیں ہے، بلکہ ان کے معاصرین میں جو لوگ صاحب نظر و نقد تھے، خود ان کی زبانوں سے بعینہ یہی حقیقت نکل چکی ہے حافظ ابو العباس عماد الدین واسطی الحزامی صاحب البلغۃ فی الفقہ باعتبار علم کے شیخ العصر اور باعتبار عمل و زہد و ورع کے بڑے بڑے اہل اللہ و اصحاب طریقت

کے ممدوح و مقصود تھے۔ حافظ ذہبی نے ان کو اپنے شیوخ کتب[1] میں سے شمار کیا ہے۔ کتاب المشتبہ میں ان کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں: "قال شیخنا المقدوہ عماد الدین الحزامی" یہی حافظ عماد الدین ایک رسالہ میں جو اصحاب و تلامذہ ابن تیمیہ کے نام لکھا تھا، لکھتے ہیں: "واللہ ثم واللہ، لم یر تحت ادیم السماء مثل شیخکم ابن تیمیہ علماً وعملاً، وحالاً وخلقاً واتباعاً، و

---

[1] "شیوخ کتب کا صحیح مطلب سمجھ لینا چاہیئے۔ اوائل میں تعلیم صرف درس و املاء روایت و تحدیث' اور صحبت و حضور مجالس میں محدود تھی۔ اس کے بعد تدوین و علوم و ترتیب کتب کا دور شروع ہوا۔ اس لئے تعلیم و تحصیل کی بھی مختلف صورتیں اور قسمیں پیدا ہو گئیں۔ ان جملہ تین صورتیں ہیں۔ جن کے لئے گو خاص الفاظ وضع نہیں کئے گئے۔ مگر انضباط و امتیاز کے لئے اگر ان کو تعلیم علوم، تعلیم کتب، تعلیم روایات سے تعبیر کیا جائے تو بہتر ہے۔ "تعلیم علوم" سے مقصود وہی طریق اصلی و قدیم کہ بذریعہ درس و املاء (لکچرز) شیوخ سے علوم کی تحصیل کرنا۔ تمام فنون آلیہ اور مہمات عربیہ و قرآن و سنت کی تعلیم پہلے اس طریق سے حاصل کر لی جاتی تھی۔ آئمہ علوم کی کتب امالی ایسے ہی مجامع درس و املاء کے نوٹس یا لکچر نہیں۔ منتہیوں کے لئے اس میں کسی مخصوص علم کی قید اور خصوصیت بھی نہ تھی۔ اکثر اوقات اساتذۂ علوم حسب وقت و حضور افکار مختلف علم و فن کی ملی جلی صحبتیں جاری رکھتے تھے۔ قاضی ابو یوسف کی امالی مخصوص بر فقہ ہے، لیکن زجاجی، ابو علی القالی، سید مرتضی، قاضی عبد الجبار، ابن فارس وغیرہم کے جو دواوین املاء اب نکل آئے ہیں، ان میں تفسیر، لغت، ادب، تاریخ و وقائع مغازی و ایام وغیرہا مختلف مباحث و مطالب پائے جاتے ہیں۔ البتہ ابو علی قالی اور زجاجی وغیرہ کے یہاں غالب صحبت لغت و عربیۃ کی ہے۔ ابتدا میں ان مجامیع کی بنیاد یوں پڑی کہ تلامذہ اپنے حفظ و یادداشت کے لئے اساتذہ کے تمام امالی یا ان کا خلاصہ لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ چیز اس قدر مقبول ہوئی کہ اقسام تصنیف میں سے ایک خاص قسم بن گئی، اور خود اساتذہ و علمائے فن اپنی مرویات کو بطور تصنیف کے

مرتب کرنے لگے۔ اس طرح کہ حلقۂ درس میں مطالب و مسائل املاء کرتے اور ساتھ ساتھ لکھتے بھی جاتے۔ یا پہلے مجموعہ مرتب کر لیتے اور پھر اسی کو املاء کرتے۔ ابو علی قالی نے قرطبہ میں اپنی مشہور کتاب الامالی مرتب کی اور جامع زہرا میں اس کے مطالب کا املاء کیا۔ اس دور کے اصحاب تصنیف جب کبھی بولتے ہیں "أملت هذا الكتاب" یا أملت بحفظی" یا ابن خلکان وغیرہ میں اکثروں کی نسبت دیکھو گے "أملى كتاب فلاں" یا أملى كتابه" تو اس سے یہی مقصود ہے۔ آج کل کے بعض ارباب جرائد و رسائل نے اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ اور اس قسم کی تصریحات سے بالکل غلط استدلال کر بیٹھے۔ دراصل "مل" اور أملا" کے معنی پڑھنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ بعض اصحاب لغت نے "ملت" کو بھی أملت الكتاب" سے ماخوذ بتلایا ہے۔ سورہ بقر میں ہے: وليملل الذى عليه الحق اور فان كان الذى عليه الحق سفيها او ضعيفا او لا يستطيع ان يمل هو فليملل وليه بالعدل اور سورۂ فرقان کے اوائل میں قرآن کے نزول و تلاوت کی نسبت کفار کا قول نقل کیا۔ وقالوا اساطير الاولين اكتتبها فهى تملى عليه بكرة واصيلا۔ بہر حال ادب و حدیث میں طریق جمع املاء اور تمام علوم سے زیادہ رائج و مقبول تھا۔ البتہ محدثین کے یہاں "املاء" ایک مخصوص اصطلاح ہو گئی۔ انہوں نے "سماع من لفظ الشيخ" کی دو مختلف قسمیں "املاء" اور مجرد "تحدیث" کو قرار دیا ہے۔ اور یہ منجملہ اقسام ثمانیۂ تحمل حدیث عند المتاخرین (مثلاً قرأت و اجازت و مناولت و وجادہ وغیرہا) ایک خاص اور اعلیٰ قسم ہے۔ كما صرح به الحافظ ابن الصلاح فى النوع الرابع والعشرين دوسری قسم "تعلیم کتب" ہے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جب مبادی و اوائل علوم کی تعلیم سے فارغ ہو جاتے تھے تو پھر آئمہ علوم کی معتبر و معتمد کتابوں کو تصحیح الفاظ و معانی و ضبط و اتقان و غرائب و مشکلات و تشریح مطالب و غوامض کے ساتھ ایسے شیوخ و اساتذہ کے سامنے پڑھتے اور سُنتے تھے جنہوں نے انہی شرائط کے ساتھ اُن کتابوں کو بہ سلسلۂ اسناد و اجازت و مناولت تا مصنفین حاصل کیا ہو۔ یا خود معاصرین و شیوخ میں جو لوگ صاحب مصنفات معتبرہ ہوتے تھے۔ اُن کی مصنفات کو خود ان کے سامنے جزءً یا کلاً پڑھتے اور سنتے تھے

اور فوائد و تشریحات متعلقہ کے اخذ و سمع کے بعد بہ شرائط املاء و اجازت و مناولت اُن کی سند حاصل کرتے تھے۔ یہ معلوم ہے کہ کسی مصنف کی کتاب کا بطور خود مطالعہ کر لینا اور ہے اور خود مصنف سے اُس کو سُننا اور اُس کے غوامض و مبانی و تشریحات کا حاصل کرنا اور۔ "تعلیم روایت" سے مقصود یہ تھا کہ قرآن حکیم و احادیث و آثار و وقائع کو حسب طریق محدثین بہ سلسلۂ اسناد تا بہ صاحب قرآن و حدیث صلی اللہ علیہ وسلم، یا تا بہ حاضر و سامع حاصل کرنا، اور ایسے شیوخ حدیث سے شرائط مقررۂ محدثین کے مطابق روایت کا سننا اور تحمل جنہوں نے لقاؤ سماع و تصافح وغیرہ مختلف طرق اسناد سے روایات صحاح و مسانید و معاجم و کتب مشہورہ کو اخذ کیا ہو۔ اس طریق تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے اکابر و اعاظم علوم آخر عمر تک سند اقرب وجید کی جستجو میں رہتے تھے اور اس کی طلب میں سفر و غربت کی بڑی بڑی محنتیں اور قربانیاں گوارا کرتے تھے۔ "اقرب" یہ کہ سند کتاب و روایت میں از اصل مبدء تا بہ شیخ کم سے کم واسطے ہوں۔ "جید" یہ کہ سلسلۂ اسناد کے اشخاص علم و معرفت اور حفظ و اتقان اور کثرت تلامذہ و شیوخ و شہرت و اعتماد کے اعتبار سے ممتاز ہوں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک اہل علم کو کسی کتاب یا حدیث کی متعدد اسناد حاصل ہیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ فلاں معاصر کے پاس انہی چیزوں کی سند ایسے سلسلوں سے ہے جن میں ایک واسطہ کم ہے، یا واسطۃ العقد کوئی مشہور و ممتاز شخص ہے تو صرف اتنی سی بات کے لئے ممالک بعیدہ کا سفر اختیار کرتے یا مراسلت کی راہ نکالتے تھے، اور اس سند کو حاصل کر کے چھوڑتے تھے۔ حافظ ساوی نے مسند امام احمد کی ایک ایسی سند کے لئے جس میں ان کی حاصل کردہ سند سے ایک واسطہ کم تھا، مصر سے عراق تک سفر کیا۔ اور علامۂ فلانی خود لکھتے ہیں کہ صحاح کی اقرب ترین اسناد کی جستجو میں تمام دیار مصر و شام و جزیرہ اور نجد و حسا کی خاک چھانی۔ طلب سماع روایت و تلقی و تحمل علوم و احادیث میں سلف کا جو حال رہا ہے، اس کے سامنے یہ باتیں بھی ہیچ ہیں اور وہ اپنے مواقع پر درج ہیں۔ فربری کا قول مشہور ہے کہ امام بخاری سے ان کی زندگی میں نوے ہزار آدمیوں نے جامع صحیح کی سند حاصل کی اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ جس دن امام علی رضا نیشاپور میں داخل ہوئے، بیس ہزار آدمی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، تاکہ صرف ایک حدیث ان کے آبائی سلسلہ سے

سن لیں اور اہلِ بیت کرام کے سلسلۂ علیہ اسناد سے مشرف و مفتخر ہوں۔ ان بیس ہزار آدمیوں میں حافظ ابو زرعہ اور امام مسلم بھی تھے۔ حاکم نے تاریخ میں لکھا ہے کہ اس دن نیشاپور کا عجیب حال تھا بہ یک وقت ہزاروں آدمیوں کے ہجوم و مرور سے تمام شہر گرد غبار میں چھپ گیا۔ راستوں میں راہگیر ایک دوسرے کو سوجھائی نہیں دیتے تھے!

رشک آیدم بہ روشنی دیدہ ہائے خلق

دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست!

امام ابن تیمیہ حافظ ذہبی کے شیوخ کتب میں سے ہیں۔ حافظ موصوف نے معجم شیوخ میں لکھا ہے کہ مسند امام احمد بن حنبل اور مصنفاتِ قاضی ابو یعلی و ابن بطہ و ابن مندہ وغیرہم اکابر حنابلہ، اور بعض دیگر صحائف سنت کی اجازت قرأت و سماع کے ساتھ میں نے ابنِ تیمیہ سے لی ہے۔ اس کے علاوہ خود امام موصوف کی تمام مصنفات کی اجازت و اسناد بھی حاصل کی ہیں۔ الفیہ میں سب سے پہلے امام ابن تیمیہ کی اجازت جمیع مصنفات کے لئے درج کی ہے۔ ان کا ایک مشہور رسالہ رفع الملام عن آئمۃ الاسلام ہے۔ اس کو اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اس کے خاتمہ میں لکھتے ہیں "سمعت ھذا الکتاب علیٰ مولفہ شیخنا الامام العلامۃ الاوحد شیخ الاسلام، ومفتی الفرق، قدوۃ الامۃ، اعجوبۃ الزمان، تقی الدین، سید العباد، ابی العباس احمد بن تیمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ" حافظ عماد الدین الواسطی بھی (جن کا ذکر متن کتاب میں آیا ہے) حافظ ذہبی کے شیوخ کتب میں سے ہیں۔ خود ان کی بعض مصنفات کی اجازت اُن سے لی تھی۔ یا کسی کتاب کی سند اقرب وجید ان کے پاس ہوگی۔ اس کی اسناد حاصل کی اور اپنے شیوخ میں شمار کیا۔ اس بارے میں علماء سلف خصوصاً محدثین کرام کے ذوق علم کا کچھ عجیب حال رہا ہے۔ خود معاصرین باہمدگر ایک دوسرے سے اجازت و اسناد حاصل کر لیتے اور کمال حق پژوہی و بے نفسی سے ایک دوسرے کو بلا تکلف اپنے شیوخ میں شمار کرتے۔ حتےٰ کہ اگر اُن کے شاگردوں کے پاس بھی کسی کتاب کی سند ہوتی، یا کوئی عمدہ اور اقرب سلسلۂ اسناد ہوتا تو بلا تامل اُن کے سامنے شاگردانہ بیٹھ جاتے اور سند حاصل کر لیتے۔ یہ معاملہ بڑے بڑے اکابر

کرہ أو علماً، وقیاماً فی حق اللہ تعالی عنہ انتہاك حرماتہ" قریب قریب ایسے
ہی الفاظ ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک موقعہ پر لکھتے ہیں۔ "و واللہ ما رائینا فی
عصرنا ھذا من تستجلی النبوۃ المحمدیۃ وسنتھا من اقوالہ وافعالہ
الا ھذا الرجل۔ یشہد القلب الصحیح ان ھذا ھو الاتباع حقیقۃ!" یعنی
قسم خدا کی، پھر کہتا ہوں کہ قسم خدا کی، .... آسمان کے نیچے آج
تمہارے شیخ ابنِ تیمیہ کا نظیر ومثیل کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ نہ علم میں نہ عمل میں، نہ حال
میں ...... نہ اخلاق میں، نہ اتباعِ حق اور نہ شیوۂ کرم وکمال حلم میں، اور نہ اللہ
اور اس کے شعائر کے حفظ وقیام کی راہ میں۔ اور قسم خدا کی، ہم نے اپنے زمانے
میں کسی کو نہ دیکھا جس کے اقوال وافعال سے نبوت محمدی کے انوار اور ان کی سنت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰)

محدثین کی نسبت منقول ہے۔ ابن أبی شیبہ نے وکیع کا قول نقل کیا ہے " لا یکون الرجل
عالماً حتی یحدث عمن ھو فوقہ، وعمن ھو مثلہ، وعمن ھو دونہ" خود امام بخاری
کا قول وعمل یہ تھا۔ لا یکون المحدث کاملاً حتی یکتب عمن ھو فوقہ ومثلہ ودونہ نقلہ الحافظ ابن حجر فی
ھدی الساری۔ دنیا کی کسی قوم کی علمی تاریخ علم پرستی کی ایسی سچی اور پاک مثالیں پیش نہیں کر سکتی۔

(مصنف نے یہاں اس فٹ نوٹ کو بہت طول دیا تھا۔ مسودہ کے انیس
صفحوں تک برابر چلا گیا تھا۔ جناب مصنف اپنے جوشِ تحریر میں اس کی پروا نہیں
کرتے، لیکن کئی کئی صفحوں کے فٹ نوٹس کا ہونا میرے خیال میں سخت قابلِ
اعتراض ہے، اور اصل کتاب کے مطالعہ میں اس سے بے لطفی ہو جاتی ہے
میں نے اس قدر ٹکڑہ یہاں کے لئے ضروری پایا تو رہنے دیا۔ باقی باب پنجم
میں داخل کر دیا۔ وہاں مولانا نے اپنے .... والد مرحوم کے حالات
تعلیم واسناد کتب کا مفصل حال لکھا ہے اور بعینہ یہی مبحث وہاں بھی چھڑ گیا
ہے۔ پس ایک ہی چیز کو دو جگہوں میں بیان کرنے سے کیا فائدہ؟ چنانچہ اس حاشیہ
کا بقیہ بھی اسی مبحث میں ملا دیا گیا۔ اس طرح ایک مستقل فصل اس مبحث پر مرتب
ہوگئی۔ "پبلشر")

کی روشنیاں چھن چھن کر نکلتی ہوں۔ الا ابن تیمیہ کو۔ ان کو دیکھ کر دل بے اختیار بول اٹھتا ہے کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی اتباع اس کو کہتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے! انتہیٰ۔ یہ حافظ موصوف کی شہادت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسوۂ محمدی کے کامل تاسی اور علوم و معارف نبوت کے کامل استفاضہ کا یہی وہ مقام ہے جس کو اصحاب اشارات نے "نسبت محمدی" سے تعبیر کیا ہے، تو یہ "نسبتِ محمدی" ہے۔ اور "فصِ محمدی" کا وہ استفاضۂ تامہ جس کی نسبت صاحب فتوحات نے کہا کہ امتِ مرحومہ کے لئے قطبیت وفاتحیت اور ولایت کبریٰ کا منتہیٰ مرتبہ یہی ہے۔ اور پھر یہی وہ حقیقت ہے، جس کو بعض اصحاب اصطلاح نے "اتحاد" کے مقام سے تعبیر کیا یعنی اتباع اور تعشق وتشبہ بالانبیاء کے کمال تفانی واستہلاک، سے بحکم "المرء مع من احبہ"

عن المرء لا تسئل، وسل عن قرینہ!

مطیع و محب کا مطاع و محبوب کے تمام صفات و خصائص سے متمثل و متخلق ہو جانا، او بحکم "من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما" اور "حتیٰ یکون ھواہ تابعاً لما جئت بہ" اس درجہ اعتقاداً وعملاً استغراق محبت رسول وترک ماسواہ کہ بحکم ومن یطع اللہ ورسولہ فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم الخ کامل مرتبہ معیت ویگانگت سے بہرہ اندوز وفائز المرام ہونا، اور فاذا ابصرتہ، ابصرتنی کے معاملہ کا پیش آجانا۔ نہ وہ "اتحاد" جو ملاحدۂ حلولیہ کا اتحاد ہے، اور جو فی الحقیقت انسان کے تمام مخترعہ اقسام شرکیں سے اکبر واغلظ قسم شرک کی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ کیونکہ فی الاصل "اتحاد" مصطلحۂ اصحابِ حق و توحید کے معنی اس سے زیادہ نہیں کہ تخلقوا باخلاق اللہ"

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست!

حافظ ابن کثیر (صاحب تفسیر) نے اپنی تاریخ کبیر "البدایت والنہایت" میں انہی

شیخ عماد الدین واسطی کی نسبت لکھا ہے کہ ابتدا میں ان کا مسلک دوسرا تھا، لیکن پھر دوسرا ہی رنگ چڑھ گیا۔ اس تبدیلی کا باعث صرف امام ابن تیمیہ کی ایک صحبت ہوئی۔ ان کی نشو و نما، فقہا و متکلمین کی جماعت میں ہوئی تھی، اسلئے جدل و خلاف اور کلام و رائے کا اثر غالب تھا مصر سے بغداد گئے تو وہاں خیالات میں توسیع ہوئی۔ اور اپنی حالت کا محاسبہ کیا تو یقین و طمانیت سے قلب کو خالی پایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فقہا و متکلمین کے طریق سے دل برداشتہ ہو گئے اور تصوف کی طرف توجہ ہوئی، لیکن عامۂ متصوفین کی صحبتوں کا جو رنگ ڈھنگ نظر آیا، اس سے طبیعت اور زیادہ مکدر ہو گئی۔ بالآخر دمشق آئے اور امام ابن تیمیہ کی صحبت میں داخل ہوئے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب پہلی مرتبہ ان کی صحبتِ درس میں حاضر ہوا تو عجیب اتفاق ہے کہ علم کلام ہی کی نسبت صحبت تھی۔ امام موصوف فرما رہے تھے۔ "دنیا میں متکلمین و فلاسفہ سے بڑھ کر مضطرب و محروم اور اطمینان قلب و سرور روح کی لذت سے یک قلم نا آشنا اور کوئی گروہ نہیں" پھر مشاہیر فلاسفۂ قدما و ارباب مقالات کے چند اقوال سنائے جن میں انہوں نے خود اپنے وجود پر مجہولیت و نامرادی اور بدحالی و بے بصیرتی کی شہادت دی ہے، اسی سلسلے میں امام رازی کے اشعار پڑھے کہ ان کی مدت العمر کی کاوش و تعمق اور طلب و جستجو کا ماحصل یہ تھا:

لعمری لقد طفت المعاهد کلها — وسیرت طرفی بین تلك المعالم

فلم أرالا واضعا کف حائر، — علی ذقن، اوقارعا سن نادم

اور کہا کہ بعضوں نے اپنی مدت العمر کے قیل وقال اور کیف و لماذا کا حاصل یہ بتلایا ہے (دراصل اشعار بالا شہرستانی کے اور آیتہ امام رازی کے ہیں)

نهایة ارباب العقول عقال — واکثر سعی العالمین ضلال

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا — سوی ان جمعنا فیه قیل وقلوا

آخر میں ایک ایسے قاطع اور اوقع طریق سے جو سارے شکوں کو مٹا دینے والا اور

ساری بے چینیوں سے نجات دلا دینے والا تھا، ثابت کیا کہ جن لوگوں نے اپنی محرومی و محجوبیت اور کوری و مجہولیت پر خود یہ کچھ شہادتیں دی ہیں، بھلا ان کی پیروی سے کب باب معرفت تک رسائی ہو سکتی ہے؟ قلت و ما احسن القول الشاعر العارف:

آں لعل گراں بہا ز کان دگر ست　　واں درِ یگانہ را نشانے دگر ست

اندیشۂ ایں واں خیال من و تست　　افسانۂ عشق را بیانے دگر ست

پس حقیقت وہی ہے جس کو وحی الٰہی اور حاملین منصب نبوت علی الخصوص آخرہم و اعظمہم محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب و اتباع نے دنیا کے آگے پیش کیا، اور شک وظن کی ظلمت و محجوبیت کی جگہ علوم سماویہ و نبویہ کی یقینیات و براہین کا دروازہ نوع انسانی پر کھول دیا۔ اور جس کے علم و عمل کا نمونہ سلف صالح و اوائل امت مرحومہ من السابقین الاولین من المہاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان من ورثۃ الانبیاء و خلفاء الرسل و ائمۃ الھدیٰ، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ نے اخلاف و آخر امت کو ہمیشہ کے لئے دکھلا دیا: اولئک علی ھدی من ربھم و اولئک ھم المفلحون۔ شیخ موصوف کہتے ہیں کہ اس ایک ہی صحبت میں سارے پردے شکوک و اضطراب کے اٹھ گئے، اور میرے دل نے حلاوت ایقان و طمانیت کی لذت پالی۔ میرا دل بے اختیار پکار اٹھا کہ جس نورِ حقیقت کی جستجو میں سرگرداں و حیراں ہوں، اس کی شعاعیں امام ابنِ تیمیہ کے ناصیۂ امامت پر چمک رہی ہیں۔ جب وہ میرے حالات سے مطلع ہوئے تو وصیت کی ساری چیزیں چھوڑ کر صرف سیرتِ نبویہ کے مطالعہ اور تدبر و تفکر کو اپنے اوپر لازم ٹھہرالو۔ یقین اور ایمان کی تمام بیماریوں کے لئے یہی ایک نسخہ کافی ہے۔ چنانچہ میں نے اس وصیت کو حرزِ جان بنایا، اور جو کچھ پایا اسی کے وسیلہ سے پایا۔ اور ہلاکت دنیا و آخرت سے نہیں بچا مگر اسی کے طفیل۔ انتہیٰ۔

شیخ موصوف نے سیرت طیبہ کے مطالعہ ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کمال شغف و ربط قلب

سے اس باب میں بعض مفید تالیفات بھی کیں۔ ازاں جملہ سیرت ابن اسحاق کا خلاصہ ہے جس کی حافظ ذہبی نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ گو ماخذ اس کا تہذیب ابن ہشام ہے لیکن حسنِ قبولیت و اضافۂ فوائد کے لحاظ سے مستحق ترجیح ہے۔

فصل

شیخ عماد الدین واسطی رح نے امام موصوف کی جس صحبت کا ذکر کیا ہے تو یہ مبحث منجملہ ان اہم ترین مباحث شریعت اور دقیق ترین مقامات معارف کتاب و سنت کے ہے، جن کی کشف و تحقیق اور بحث و تنقیب امام ابن تیمیہ کے مخصوص معارف میں سے ہے۔ بلکہ ان کے منصب تجدید و امامت فی الدین کا اصلی جوہر اور ان کے تمام علوم و مقالات کا روح الروح اور صفرۃ المقال یہی مقام ہے۔ حقیقت اگرچہ سلف کے یہاں حالاً و عملاً بجد کمال موجود تھی۔ لیکن قولاً و علماً اس کو منتہا درجہ بحث و تحقیق و وضوح تک پہنچا دینا اور بطریق جوامع و کلیات قواعد و مقالید اس کا اثبات کرنا اور اس درجہ منقح و صاف کر دینا کہ لو کشف الغطاء لما ازددت یقیناً کا جملہ اس پر صادق آئے، تو یہ فضل مخصوص صرف امام موصوف اور ان کے اصحاب و تلامذہ ہی کے حصہ میں آیا۔ اسی لئے امام ذہبی نے کہا: "ولقد نصر السنۃ المحضۃ والطریقۃ السلفیہ ...... واحتج لہا براھین ومقدمات وامور لم یسبق الیھا، واطلق عبارات احجم عنہا الاولون و الآخرون" اور اسی لئے ان کا مرتبۂ تجدید اور جامعیت تمام مجددین و فاتحین اعصار اواخر میں سب سے بالاتر وارفع واقع ہوا۔ کیونکہ اکثر مجددین امت کی تجدید و دعوت متعلق اعمال و فروع کے ہے، لیکن امام موصوف کی تجدید براہِ راست علوم و عقائد و اصول و اساسات شریعت سے متعلق ہوئی۔ پس جو نسبت اصل اور فرع میں ہے، وہی نسبت ان کے

مرتبۂ تجدید اور دیگر مجددین امت کے مراتب میں سمجھنی چاہیئے اور پھر بسبب اکتساب فیضان نسبت جامعیت محمدیؐ علم وعمل کی اور تمام شاخوں اور راہوں کا بھی ان کے مقام دعوت و تجدید نے احاطہ کیا، اور اس طرح "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا معاملہ بھی واقع ہوا۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء اور اس لئے گو ان کا ظہور دورِ متاخرین میں ہوا، لیکن بہ لحاظ مرتبہ و معنویت کے داخل صفوف اوائل واسلاف امت و مصداق صحیح و آخرون منھم لما یلحقوا بھم اور پھر اسی لئے سلسلۂ اصلاح و تجدید امت میں ان کی دعوت خلف کے لئے واسطۃ العقد کا برزخ واقع ہوئی جو خلف کو سلف سے جوڑتی اور اواخر پر اوائل کے فیضان و برکات کا دروازہ کھولتی ہے اور یہی بات ہے کہ عہد آخر کے تمام معاملات و کاروبار تجدید و دعوت کی فاتحیت و قطبیت انہی کے سپرد ہوئی۔

وما احسن ما قال الشیخ بدر الدین بن عز المغیثی فی رسائلہ۔ رحمۃ اللہ علیھما:

فلئن تاخر فی القرون لثامن فلقد تقدم فی العلوم امام!

بہرحال اصحاب تاویل و رائے اور متکلمین و اتباع فلاسفہ کی بے حاصلی و نامرادی اور سلف امت و اصحاب تفویض کے مذہب حق و طریق حکمت اور عقلیاتِ صادقہ و فاضلہ کے اثبات و نصرت میں امام ابن تیمیہ کے مباحث و مقالات اور براہین و قواطع کا عالم ہی دوسرا ہے اور افسوس امت کی محرومی و واماندگی پر کہ صدیوں سے یہ خزائن معارف و کنوز حقائق موجود ہیں مگر کوئی ان کا آشناسا و عارف پیدا نہ ہوا۔ بلکہ ہمیشہ غفلت و جہل اور تعصب و جمود کی تاریکیوں میں مدفون و مجہول رکھا گیا۔ وھذہ الیست اول قارورۃ کسرت فی الاسلام۔ وکم من نوبۃ قد رموا الحق والعلم عن قوس واحدۃ! علی الخصوص آجکل مسلمانوں میں جس فتنۂ عقائد نے سر اٹھایا ہے اور بحکم بل قالوا مثل ما قال الاولون وہ تمام فتنے اکٹھے ہو کر پلٹ آئے ہیں جو عقائد اسلامیہ کے مختلف دروں میں فرداً فرداً ظاہر ہوئے تھے، اس کے لحاظ سے تو آج معارف ابن تیمیہ سے بڑھ کر اور کوئی چیز مطلوب و مقصود وقت نہیں۔ البتہ ضرورت بہت کچھ اضافۂ مطالب و تفصیل اجمال و توضیح اشارات و ضبط و تالیف اشتات و انتشار کی ہے۔ اور اس کا بہترین محل و موقعہ امام ابن تیمیہ اور انکے اصحاب و تلامذہ کی سیرت و سوانحات عمریہ میں مل سکتا ہے۔ اس چیز کا خیال عرصہ سے تھا۔ لیکن ان سطور کو لکھتے

ہوئے بے اختیار اس کام کی طرف دل مائل ہو رہا ہے۔ اگر تفسیر کے سلسلے سے ذرا بھی مہلت نکلی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی سیرت کی تکمیل سے فراغت ہوئی تو انشاءاللہ سیرت ابنِ تیمیہ و اصحابہ کی ترتیب پر متوجہ ہوں گا۔ باقی رہا اصل مبحث تو الحمدللہ تفسیر البیان میں بہ تحت سورۂ بقرہ نہایت شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے اور جستہ جستہ دیگر مقامات تفسیر میں بھی اس کی تحقیق و توضیح ہو چکی ہے اور چونکہ مسئلہ کی اہمیت طالب انفراد بحث و استقلال نظر تھی۔ اس لئے گذشتہ سال ایک مستقل رسالہ "اتحاف الخلف بطریقۃ السلف" کے نام سے بھی انجام کو پہنچا۔ انشاءاللہ اس باب میں کافی و شافی ہوگا۔ اس موضوع پر بعض دیگر تالیفات بھی پیش نظر ہیں۔ لیکن ابھی یہی کس کو معلوم ہے کہ یہ تمام اوراقِ پریشان جن کو بلا فکر مال و مستقبل لکھتا جاتا ہوں اور (بقول ابن رشد) اس شخص کی طرح جو اپنے آتش زدہ مکان کا سامان جلد جلد کھڑکی سے باہر پھینک رہا ہو باوجود ہجوم نوازل، و انبوہِ زلازل، و احاطہ حوادث، و تشتت بال، و بے سر و سامانی حال، جس قدر بھی فراغِ خاطر ساتھ دیتا ہے۔ صحبت قرطاس و قلم و تسوید واردات و افکار میں کمی نہیں کرتا، کبھی جمعیت و ترتیب اور صورت انطباع و اشاعت بھی نصیب ہو گی یا نہیں؟ البتہ مزدور کا کام محنت ہے اور چاکر کا چاکری، بعد کی فکر نہ ہم کو کرنی چاہیئے اور نہ کرنے سے کچھ حاصل:

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند!

واللہ لا یضیع عمل عامل من ذکر و انثیٰ و علیہ فلیتوکل المتوکلون!

یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، اگر ایک ذرۂ اخلاص و صداقت بھی رکھتا ہے، تو پھر نہ خوفِ زیان ہے اور نہ خدشۂ ضیاع، اور انشاءاللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کا معاملہ ارباب عمل کے لئے ہر وادی اور ہر گوشۂ کار میں کارفرما۔ شاہانِ عالم کے بنائے ہوئے محل مٹ گئے اور قوموں کے آباد کئے ہوئے شہر ویران ہو گئے۔ کان لم یغنوا فیھا۔ لیکن اصحاب اخلاص کا ایک کلمۂ حق اور ایک نقشِ صدق بھی لوحِ عالم سے محو نہ ہو سکا۔ حتے کہ جو

بقائے ذکر عظیم الشان بابل کے آباد کرنے والوں اور مصر کے سربفلک مناروں کے بنانے والوں کو بھی نصیب نہ ہوا (حالانکہ شاید اسی غرض سے جبل مقطم کی چٹانیں کاٹ کر چار سو ساٹھ گز کی بلندی تک پہنچادیں) وُہ اصحاب کہف کے ایک بے زبان کتے کو اس غیر فانی کتاب کی لوح محفوظ میں حاصل ہے جس کی دائمی حفاظت کی تصدیق میں خود اللہ نے اپنی ذمہ داری پیش کی ہے: وکلبھم باسط ذراعیہ بالوصید! (وللہ درما قال)

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شیخ واسطی نے امام موصوف کے جو اشارات متکلمین و ارباب تاویل کے باب میں نقل کئے ہیں۔ ان کو زیادہ تفصیل کے ساتھ انہوں نے اپنے مشہور مقالہ عقیدت الحمویہ میں لکھا ہے۔ یہ وہی تحریر ہے جس کی بنا پر سب سے پہلے امام موصوف کے خلاف علماء سوء نے فتنہ اُٹھایا اور ربیع الاول ۶۹۸ھ میں مبتلائے محن و آلام ہوئے۔ یہ رسالہ مصر میں دو بار چھپ چکا ہے۔ علامہ سفارینی نے کہ گیارھویں صدی کے کبار اصحاب اثر و اعاظم حماتِ طریقِ سلف میں سے ہیں ایک ضخیم مجلد میں اس کی شرح بھی لکھی ہے اور اُن طالبان حق وجویانِ حقیقت کے لیے جن کے امراض قلب و اعتقاد کو علامۂ نسفی و تفتازانی و دوانی (رحمہم اللہ) کے شفاخانوں نے اور زیادہ مزمن و شدید کرکے چھوڑ دیا ہو۔ اکسیر اعظم و تریاق مجرب و شفاء لمافی الصدور کا حکم رکھتی ہے: ففیہ ما تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین:

سرِ خدا کہ عارف و زاہد کسے نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟

فصل

بہرحال اس واقعہ میں قابلِ غور وہ عشق و شغف ہے۔ جو امام موصوف کو خصوصیت کے ساتھ سیرت نبویہ سے تھا۔ ایک سرسری نظر رکھنے والا تو اس واقعہ کو معمولی سی بات سمجھ کر معترضانہ آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن صاحب نظر و بصیرت اسی ایک بات سے امام موصوف کے تمام علوم و اعمال کا محور و مرکز معلوم کر لے سکتا ہے۔

انہوں نے ایک ایسے صاحب علم مگر مریض شک و اضطراب کو جو مدعیان علم و حکمت کی دانش فروشیوں کے ہاتھوں اپنا یقین و اطمینان ضائع کر چکا تھا۔ یہ وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف حیات طیبۂ نبوت کے مطالعۂ و تفکر میں لگ جاؤ اور گویا اس طرح بتلا دیا کہ علم و بصیرت کا اصلی سرچشمہ صرف حیات نبوت اور منہاج مقام رسالت ہے۔ جس کو قرآن حکیم نے "الحکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے: ومن یوتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔ کیونکہ دنیا میں "حکمت صادقہ کا اس "حکمت" سے الگ کوئی وجود ہی نہیں۔ "حکمت" یا تو خود منہاج و سنت نبوت ہے، یا علم و عمل کی ہر وہ بات جو اس سے ماخوذ اور صرف اسی پر مبنی ہو۔ یہی "خیر کثیر" مبدء جمیع خیرات و برکات ارض و نوع ہے اور صرف اسی نسخۂ شفا سے دل اور روح کی ساری بیماریاں دور ہو سکتی ہیں خواہ شکوک و ارتیاب کی بیماری ہو خواہ اوہام و انکار کی۔ خواہ ادعاء ادریت کا ہیجان ہو۔ خواہ حیرانی و سرگردانی لا ادریت کا خمار:

زہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہمید!

کوئی بیماری ہو، دوا صرف ایک ہی ہے:

یکے دو است بدار الشفاء میکدہ ہا!

باقی یا تو اسماء مختلفہ ہیں اور مسمیٰ وہی ایک ہے۔ مثلاً "سنت وسیرت" کی جگہ "قرآن و کتاب" کا لفظ بول دیا جائے کہ نام دو ہو گئے مگر حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی بات وہی ایک رہی۔ دلالت و تسمیہ میں تعدد ہوا مدلول و مسمیٰ میں نہیں۔

عبارا تنا شتی وحسنك واحد!

یا پھر اسی نسخہ کے اجزاء و توابع جیسے آثار و سیرت صحابہ و سلف امت اور معارف و بصائر ماخوذہ و مکتسبہ کتاب و سنت کہ گو اشکال و اسماء میں تفرقہ و امتیاز ہوا مگر بکم علیکم بسنتی وسنۃ خلفاء الراشدین" اور و اخرین منھم لما یلحقوا بھم اور فاولئك مع الذین انعم اللہ علیھم الخ اور ما انا علیہ واصحابی معناً و حکماً جزء و کل، اصل و فرع، مصدر و مشتق، یا شمس و کواکب کا سا معاملہ واقع ہوا ہے۔ روشنی صرف ایک ہی ہے اور ایک ہی کی ہے۔ اگرچہ چاند سے بھی مل جائے اور چمکیلے ستاروں سے بھی

بحر یست متحد کہ باشکال مختلف
باران و قطرہ و صدف و گوہر آمدہ
مشتق چو نیک درنگری عین مصدر است
کین در صفات ظاہر خود مضمر آمدہ

ویقرب من ھذا ما قیل بالعربیہ،

وما البحر الا الموج لا شیٔ غیرہ
وان فرقتہ کثرۃ المتعدد!

اور اگر یہ دونوں صورتیں بھی نہیں، تو پھر جو کچھ ہے۔ نہ تو علم ہے اور نہ شفا، بلکہ خود جہل ہے اور مرض۔ اگرچہ افسوس کہ اس دنیا میں زیادہ حصہ انہی مریضوں کا بستا ہے جنہوں نے ہمیشہ طلب مرض کو طلب شفا سمجھا ہے اور سم قاتل سے امید حیات رکھی ہے اور پھر یاد رہے کہ یہی معنی ہیں سلف کے اس قول کے کہ علم نہیں ہے مگر وہ جس میں حدثنا اور اخبرنا ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وساوس و ضلالت سے زیادہ نہیں۔ کما قال الشافعی رضی اللہ عنہ

کل العلوم سوی القران مشغلہ الا الحدیث والا الفقہ فی الدین
العلم ما کان فیہ قول حدثنا وماسوا ذاک وسواس الشیاطین

اور یہی معنی ہیں اس قول نبوی صلعم کے کہ علم صرف تین ہیں۔ ماسوا ان کے جو کچھ ہے فضل ہے آیت محکمہ، سنت قائمہ، فریضۂ عادلہ۔ اور یہ منجملہ جوامع الکلم نبویہ کے ہے کہ اس دنیا میں علم کی حقیقت اور اس کے حدود و مقاصد و مراتب و انواع کی نسبت جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ سب کچھ ان تین لفظوں میں جمع کر دیا گیا اور بتلا دیا گیا۔ ولکن لا یعقلہا الا العالمون۔ و قدس اللہ روح القائل وھو حجۃ السلام ابن قیم اذ یقول فی النونیۃ الکبریٰ:

العلم قال اللہ قال رسولہ قال الصحابۃ ھم اولو العرفان
ما العلم نصبک للخلاف سفاھۃ بین الرسول وبین رای فلان
کلا ولا عزل النصوص وانھا لیست تفید حقائق الایمان
اذ لا تفید کم یقینا لا، ولا علماً، فقد عزلت عن الایقان
والعلم عندکم ینال بغیرھا بزبالۃ الافکار والاذھان
سمیتموہ قواطعاً عقلیہ نفی الظواھر حاملات معان
کلا ولا احصاء اراء الرجا ل وضبطھا بالحصر والحسبان
کلا ولا التاویل والتبدیل والتحریف للوحیین بالبھتان
کلا ولا الاشکال والتشکیک والوقف الذی مافیہ من عرفان
ھذی علومکم التی من اجلھا عادیتمونا یا اولی العرفان!

وقال شیخ الاکبر، من جملۃ ابیات افتتح بھا الباب الثامن وثلاث مائۃ من الفتوحات:

کل علم یشھد الشرع لہ فھو علم نبہ فلتعتصم
فاذا خالفہ العقل فقل طورک الزم ما لکم فیہ قدم

اور سبب اس کا ظاہر ہے۔ قلب و روح کی جتنی بیماریاں بھی ہیں۔ اصل مبدء ان کا دو قسموں

سے باہر نہیں۔ ایک قسم مرض کا نام الحاد و انکار ہے۔ دوسری کا توہم و سوفسطائیہ۔ باقی تمام بیماریاں اسی کے اتباع و عوارض و فروع ہیں اور دونوں قسموں میں ظہور مرض کے علائم و آثار و عواقب مشترک ہیں یعنی دونوں کا نتیجہ شک و جہل و اضطراب اور فطرت کی طمانیت اور سرور و راحت قلبی کا ازالہ یعنی باصطلاح قرآن حکیم نفس مطمئنہ[1] کا فقدان۔ بس مرض

---

[1] انسان کی نفسی و قلبی حالت بلحاظ سعادت و شقاوت تین قسموں سے باہر نہیں۔ یا تو نور فطرت کی محجوبیت و مظلومیت بمصداق کلا بل ران علیٰ قلوبهم ما کانوا یکسبون اور اس کا بحدِ مسخ و انقلاب پہنچ جانا۔ حتیٰ کہ احساس و تمیز تک باقی نہ رہنا۔ یہ حالت ہو جائے کہ روشنی اور تاریکی، سنکھیا اور دودھ دونوں کو ایک سمجھنے لگے۔ نہ اچھائی پر خوشی نہ برائی پر غم۔ سو قرآن حکیم نے اس کو "نفس امارہ" سے تعبیر کیا ہے۔ ان النفس لامارة بالسوء۔ اور یا پھر اس ظلمت کدے سے قدم باہر نکلتا ہے۔ نور فطرت کی بجھتی ہوئی روشنی ٹمٹمانے لگتی ہے حتیٰ کہ احساس و امتیاز خفتہ جاگ اٹھتا ہے اور روشنی کی تمنا اور تاریکی سے بیزاری محسوس ہونے لگتی ہے۔ برائی سے بچنے اور کانٹوں میں نہ الجھنے کی طاقت تو نہیں ہوتی۔ لیکن فطرتِ اصلیہ کا سروش غیبی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس کی صدائیں بار بار سنائی دینے لگتی ہیں۔ اچھائی اور نیکی سے وہ خوش ہوتا ہے اور تحسین کرتا ہے اور بدی و بے راہی پر غمگین ہوتا اور ملامت کرنے لگتا ہے۔ یہ "نفس لوامہ" کی تندرستی و حصول کا مرتبہ ہے اور اسی لئے قرآن حکیم نے اپنے طرزِ مخصوص میں اس کی اندرونی شہادت پر انسان کو توجہ دلائی ہے جو قانون مجازات و مکافات کی تصدیق کرتی اور نتائج و ثمرات عمل و تفریق عمل حسن و سوء کا یقین دلاتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو ایک کام پر خوشی و سرور کا احساس کیوں ہو اور دوسرے کام پر ملامت و احساس ندامت و خوف کیوں؟ لا اقسم بیوم القیامه ولا اقسم بالنفس اللوامه۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حدیث ابن معبد عند احمد والدارمی میں اشارہ فرمایا اور جو حقیقت خیر و شر و فطرت انسانیہ اصلیہ کے باب میں چند لفظوں کے اندر ایک صحیفۂ علم اور ایک دیوان درسِ حقیقت ہے اور اسی لئے طالب انفراد و بحث و استقلال نظر کہ "البر ما اطمانت علیه النفس واطمان الیه القلب، والاثم ما حاك فی النفس وتردد فی الصدر وان افتاك الناس وافتوك" یعنی فرمایا۔ کیا نیکی اور اچھائی کی حقیقت اور پہچان پوچھتے ہو؟ سو پہچان اس کی یہ ہے کہ "استفت قلبك" اپنے ضمیر سے فتویٰ طلب کر۔ نیکی وہ کام ہے۔ جس پر نفس کو اطمینان اور خوشحالی ہوئی اور دل کے لئے اس پر قرار اور اٹکاؤ ہو آ۔ اور گناہ وہ ہے کہ اطمینان کی جگہ تمہارے اندر چبھن اور خلش

پیدا کرے، اور دل کو اُس پر جماؤ اور قرار نہ ہو۔ اگر سیکڑوں آدمی فتوے دے دیں۔ کہ فلاں بات اچھی ہے۔ لیکن خود تمہارے اندر اس پر اطمینان اور جمعیت خاطر نہ ہو۔ تو سمجھ جاؤ کہ اس میں کوئی کھوٹ ضرور ہے۔ انتہیٰ۔ البتہ یہ یاد رہے۔ کہ اس حدیث میں "قلب" کا جو لفظ آیا ہے تو اس سے مقصود "قلب سلیم" ہے۔ نہ کہ سقیم و مریض۔ کیونکہ ذائقہ کے باب میں تندرست آدمی کا ذائقہ معتبر ہوگا۔ نہ کہ بیمار کا۔ رات بھر کے تپ صفراوی نے جس کی زبان کے ذوق اصلی پر قبضہ کر لیا ہے۔ وُہ تو شہد کو بھی چکھ کر مُنہ بنا لے گا کہ کڑوا ہے۔ اس کا ذوق، معیار حلاوت و تلخی نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یہی معنی ہیں۔ بعض عرفا کے اس قول کے کہ طالب کی کامیابی کی پہچان یہ نہیں ہے کہ غفلت سے بالکل محفوظ ہو جائے۔ بلکہ یہ کہ غفلت پر احساس حسرت و غم اور ذکر وعمل پر وفورِ مسرت و شادمانی کا معاملہ مضبوط ہو جائے۔ تیسری قسم سعادت قلبی اور ارتقاء معنوی کا آخری مرتبہ ہے اور اس کو قرآن حکیم نے "نفس مطمئنہ" سے تعبیر فرمایا ہے: یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیۃ مرضیۃ یعنی علم و یقین (وباصطلاح قرآن ایمان) کی وُہ حالت جب فطرت اصلیہ سازی پیدا کی ہوئی بیماریوں اور مکتسبہ و خارجیہ علتوں سے نجات پا جائے اور قلب کا آئینہ فطرت ہر طرح کے زنگوں اور کدورتوں سے پاک و صاف ہو کر اپنی اصلی چمک اور درخشندگی حاصل کر لے۔ غرضیکہ قلب "سلیم" ہو جائے کہ نجات کامل اور سعادت دارین کا مستحق بجز اس کے اور کوئی نہیں۔ مطلوب و مقصود اصلی صرف وہی ہے۔ یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔ سو یہ حالت اطمینان و سکون کامل اور یقین و راحت تامہ کی وہ بے میل اور بے داغ حالت ہے۔ جس میں شک کا ایک ذرا سا دھبہ اور اضطراب و تذبذب کا ایک رائی برابر بھی داغ نہیں ہوتا۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے خطبۂ غزوۂ تبوک میں فرمایا۔ وخیر ما وقر فی القلوب الیقین والارتیاب من الکفر"۔ اور قول حضرت ابن مسعود کہ "الیقین الایمان کلہ" وقال ابن عمر "لا یبلغ العبد حقیقۃ التقویٰ حتی یدع ما حاك فی الصدر" اور حضرت ابن عمر نے یہ جو

فرمایا کہ "یدع ماحاك فی الصدر" تو یہ وہی بروایمان کی ضد ہے جس کی نسبت قول نبوی صلعم اوپر گذر چکا کہ "ماحاك فی النفس وتردد فی الصدر" فی الجملہ نفس مطمئنہ کے اس مقام پر پہونچ کر انسان کے لئے دُنیا و آخرت دونوں میں بجز جنت و نعائم جنت اور روح و ریحان وجنات النعیم کے عیش و سرور کے غم کی ایک خلش اور اضطراب کی ایک چبھن بھی نہیں ہو سکتی۔ تتنزل علیهم الملائکة ان لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون۔ نحن اولیاؤکم فی الحیوة الدنیا وفی الاخرة ولکم فیها ما تشتهی انفسکم ولکم فیها ما تدعون۔ وہی دنیا کی زندگی جو ہزاروں لاکھوں دلوں کے لئے جہنمی شورشوں اور دوزخی بے چینیوں اور درد و کرب دائمی کے شعلوں سے بھری ہوئی ہے۔ صاحب نفس مطمئنہ کے لئے باغ و بہار بہشت اور نعمت و سرور دار المقام و سلام بن جاتی ہے۔ ولمن خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوی فان الجنة هی الماوی اور ولمن خاف مقام ربه جنتان جو اللہ سے ڈرا اور اپنے نفس کو بدراہیوں اور بدخیالوں سے روکا تو اس کا مقام دار الحیات جنت ہے اور جنت کا نعیم و سرور قرة العین، اور اس کے لئے ایک نہیں دو دو جنتیں ہیں اور سبحان اللہ امام ابن تیمیہ کی حقیقت فرمائی اور رمز شناسی کہ ہمیشہ کہا کرتے۔ کما نقل عنه الحافظ ابن قیمؒ ان فی الدنیا جنة، من لم یدخلها، لم یدخل الجنة الاخرة" دنیا میں بھی ایک جنت ہے۔ سو جو اس دنیا کی جنت میں داخل نہ ہوا۔ وہ آخرت کی جنت میں بھی کبھی داخل نہ ہوگا۔ فمن کان فی هذه اعمی فهو فی الاخرة اعمی۔ شک و ظلمت اور یقین و طمانیت کی محرومی ہی سب سے بڑی جہنمی زندگی ہے۔ اور حیات بہشتی یقین و بصیرت ہی کا دوسرا نام ہے۔ فالقرآن یدعوا الی الجنة ویدعوا الی دار السلام! غرضیکہ قرآن حکیم نے نفس انسانی کی اصولاً تین ہی قسمیں کی ہیں۔ نفس امارہ، لوامہ، مطمئنہ لوامہ کا آخر گو بوجہ قرب و اتصال مطمئنہ، صحت و تندرستی نفس کا مقام ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کا ابتدائی مقام بوجہ قرب اسفل، بیماری کی حالت میں داخل ہے۔ اگرچہ بہرحال ہلاکت سے محفوظ۔ یہ حال ہر درمیانی درجہ کا ہوا کرتا ہے۔ اس کا ایک سرا اگر مافوق سے متصل ہوتا ہے تو دوسرا ماتحت سے۔ اور اسی بنا پر

قرآن نے بلحاظ سعادت وشقاوت عمل بھی تین ہی قسمیں کی ہیں۔ ایمان۔کفر۔نفاق۔کیونکہ حالتیں بھی صرف تین ہی ہیں۔ چوتھی کوئی نہیں۔ زندگی ،بیماری ،موت۔ اور اسی لئے مقام بھی تین ہوئے۔ دارالمقام جنت۔ اعراف۔ سعیر وجہنم۔ اور یہ معلوم رہے کہ یہاں نفاق سے مراد صرف نفاق اعتقادی ہی نہیں ہے بلکہ عملی بھی، کیونکہ جس طرح ایمان واسلام اعتقاداً وعملاً دونو طرح ہے۔ الایمان بضع وستون شعبۃ الخ وکذالک الکفر، ولھذا قالوا کفر دون کفر۔ اسی طرح نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اعتقادی اور عملی۔ مدینہ کے منافق جو قریش ویہود سے سازباز رکھتے تھے فنا ہوگئے۔ مگر نفاق اور منافقین کا وجود بدستور باقی ہے جس طرح کفر اور ایمان کا۔ اور باقی رہے گا۔ " اربع من کن فیہ کان منافقا خالصاً ومن کانت فیہ خصلۃ منھن، کانت فیہ خصلۃ من النفاق" (بخاری) "ولو صلی وصام وزعم انہ مسلم" یہ ساری باتیں جو اس منہیہ میں لکھی گئیں محض از قبیل اشارات ہیں۔ ورنہ

گر نویسم شرح آں بیحد شود   مثنوی ہفتاد من کاغذ شود

تفسیر البیان ان تمام مباحث کا مجمع ہے اور حقیقت ایمان وکفر ونفاق پر ایک مستقل رسالہ اتمام کو پہنچ چکا ہے اور یہ جو کہا کہ قسمیں تین ہیں۔ تو تمام تقسیمات قرآنیہ اسی پر مبنی ہیں اور جس پہلو سے اور جس گوشے میں دیکھو گے، معلوم ہوگا کہ تین قسموں اور درجوں سے کوئی معاملہ اور سلسلہ خالی نہیں۔ اگر نظر دقت وتفکر سے کائناتِ ہستی کا مطالعہ کروگے تو معلوم ہوگا کہ قانونِ الٰہی عالم ہستی میں کچھ ایسا ہی واقع ہوا ہے۔ ہر نوع اور ہر حالت کے لئے تین کا عدد جامع افراد اور مکمل ومتمم کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کے اکثر اعمال بلا قصد خود بخود تین مرتبہ ضرور انجام پاتے تھے۔ " وکان اذا دعا دعا ثلاثا۔ وکان اذا سلم سلم ثلاثہ واذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثا" (بخاری) اور اسی لئے شریعت نے بھی اپنے تمام اعمال میں مرتبہ ثالث تک بلوغ عمل وارادہ کو ضروری اور بمعنی تکمیل قرار دیا ہے اور ہر طرح کی تقسیم وتکرار عمل وغیرہ میں تین تک ہوجانا کمال ٹھہرا اور اسی لئے تمام عقائد واعمال وافعال کی تکمیل وحصول کے تین ہی عنصر ہوئے۔ نیت۔ قول۔ عمل بالجوارح۔ ایمان بھی معلوم ہے کہ اعتقاد، قول، عمل کا نام ہے اور عبادت بھی انہی تین عناصر سے مرکب ہوئی۔ نیت وخشوع وخضوع۔ تلاوت وقرأت۔ قیام ورکوع وسجود۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو دنیا کی اکثر بت پرست اقوام قدیمہ میں تثلیث کے عقیدہ نے نشوونما پایا۔ مثلاً ہندوستان، یونان

بلحاظ علت وظہور ہر حال میں صرف یہی ہوا کہ شک وظلمت۔ اور اس عالم میں وحی الٰہی اور حکمت نبوت اور ان سے ماخوذ و مکتسب کے علاوہ جو کچھ ہے"یقین، برہان، بصیرت" اور" فرقان" نہیں ہے۔ شک وظن ہے۔ عدم علم و بصیرت ہے۔ یا تخمین و رائے اور تلعب و تخرص بالریب ہے۔ مالھم بذالک من علم انھم الا یظنون اور بل ھم فی شک یلعبون۔ اور ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر ثانی عطفہ لیضل عن سبیل اللہ (حج) اور ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا؟ اور افمن کان علی بینۃ من ربہ کمن زین لہ سوء عملہ واتبعوا اھوائھم؟ (محمد) اور ما لھم بہ من علم ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئا (النجم) اور قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ، علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی (آخر یوسف) اور بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتھم تاویلہ (یونس) ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا

بقیہ صفحہ نمبر ۱۸۵

اور مصر وغیرہ میں۔ اور افلاطون نے بھی ایک طرح اقانیم ثلاثہ کا اقرار کیا اور اسی سے عیسائیوں کے یہاں تثلیث کی ضلالت پھیلی تو غالباً اس کی بنیاد اول اول یوں پڑی ہوگی کہ کارخانۂ حیات میں ہر جگہ تین قسموں اور تین مرتبوں کے ظہور کو دیکھ کر تثلیث الٰہ کے دھوکے میں پڑ گئے اور اصل قانون خلقت وحیات وانواع اور جمیع کارو بار ہستی کے ایک اور یکساں ہونے کی حقیقت، اور اس سے قانون توحید خلقت وخالق تک پہنچنے، اور ساری کتاب قدرت کے ایک ہی خط میں مکتوب ہونے کی وجہ سے قلم وکاتب کے بھی ایک ہونے تک ان کی رسائی نہ ہوئی۔ اگر ہوتی تو پکار اٹھتے: ما تری فی خلق الرحمن من تفاوت، فارجع البصر، ھل تری من فطور؟ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر (ملک) قال ابن عباس (رض) "تفاوت" ای الاختلاف" (اخرجہ البخاری فی التفسیر)

انتم وآباؤکم ما انزل اللہ بہا من سلطان ان الحکم الا للہ (یوسف) وغیر
ذلک من الآیات والقواطع اور اسی لئے دعوت خاتم الادیان ومکمل الشرائع کی نسبت
اکثر خطبات نبویہ میں یہ اعلان عام پاتے ہو کہ اُس کا ظہور کرۂ ارضی کے کمال جہل و
فقدان علم کے وقتوں میں ہوا۔ یعنی اس لئے ہوا تاکہ علم و نور سے دُنیا کو بھرپور کر دے
اور علم و نور نہیں ہے مگر یقین اور زوال شک و ریب۔ علی الخصوص اولین خطبۂ جمعہ بالمدینہ
میں فرمایا۔ "ارسلہ بالھدی والنور والموعظۃ علی فترۃ من الرسل، و
قلۃ من العلم، وضلالۃ من الناس" الخ اخرجہ الحاکم علی شرط
الصحیحین والطبری فی تاریخہا۔ پس ظاہر ہے کہ جن نام نہاد علوم کا حاصل
خود ظلمت ظن و شک اور کوری وہم و رائے سے زیادہ نہیں، وہ مریضانِ یقین و اعتقاد
کے لئے کیونکر نسخۂ شفا ہو سکتے ہیں؟ اور جو خود سر گشتۂ راہ اور درماندۂ کار ہے۔ وُہ دوسرے
گم کردہ راہوں کی کیا رہنمائی کر سکتا ہے؟

جوہر طینت آدم ز خمیر دگر ست
تو توقع ز گل کوزہ گراں مے داری

بل ھم فی شک منہا، بل ھم منہا عمون (نمل) مرض کا ازالہ دوا
سے ہو سکتا ہے نہ کہ خود تولید مرض سے۔ اگر دنیا کا اصلی مرض "یقین" اور "بصیرت"
سے محرومی ہے اور شک و گمان کی ہلاکت، تو اس کا علاج وُہ کیونکر کر سکتے ہیں۔ جن کا
خود اعلان یہ ہے کہ ہمارا منتہاءِ فکر و ادراک اس سے زیادہ نہیں کہ "لا ادری ولا
اعلم" ہم نہیں جانتے اور نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے اور کس لئے ہے؟ یعنی بحکم وشھدوا علی
انفسھم وُہ خود اپنے منتہا معرفت کو جہل سے زیادہ نہیں تبلاتے۔ ان نظن الا ظنا وما
نحن بمستیقنین

معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شُد!

اس کا علاج اور نسخۂ شفاء لما فی الصدور تو صرف اُسی اعلم الخلائق و اعرف العباد کے

دار الشفاء وحی میں مل سکتا ہے جو شک کی جگہ یقین کا، ظلمت کی جگہ نور کا، عدم علم کی جگہ علم و بصیرت کا، ظن و قیاس و گمان کی جگہ بینۃ و حجت کا، برہان و فرقان کا اور تبیاناً لکل شئی اور عروۃ الوثقیٰ کا۔ غرضکہ "لا ادری" اور "لا اعلم" کی جگہ "انی اعلم" اور "انی علیٰ بینۃ من ربّی" اور "انی اشہد" بلکہ "رایت و سمعت" کا دعوے اور اعلان کر رہا ہو اور تمام نوع بشر کو یہ کہہ کر بلا رہا ہو: ھذا سبیلی ادعوا الی اللہ! علیٰ بصیرت انا، ومن اتبعنی! اور تمام منکرین و جاحدین سے بار بار مطالبہ کرتا ہو: ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا؟ یعنی یہ علم و یقین اور خروج من الظلمات الجہل الی نور المعرفت و الحقیقۃ کی راہ ہے جس پر میں تم کو دعوت دے رہا ہوں۔ پھر تمہارے پاس بھی کوئی "یقین" اور "علم و بصیرت" ہے، جس کو دُنیا کے آگے پیش کر سکتے ہو؟ فھل یستوی الاعمیٰ والبصیر؟ اور وھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون؟ ایک کہتا ہے۔ میرے پاس شک ہے۔ اگر تم میری طرف آؤ تو تم کو شک سے معمور کر دوں گا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے بجز یقین اور برہان کے اور کچھ نہیں۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ تنزیل من حکیم حمید (حم سجدہ) اور بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم (عنکبوت) میں بصیرت ہوں۔ دعوت علم ہوں۔ پیام حجت و برہان ہوں۔ حقیقت جو ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک ہی راہ ہوں۔ اقوم الطرق، ارضح السبل، صراط السوی، ان ھذہ صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔ پھر بتلاؤ! دنیا کو جو طمانیت و قرار قلب کی بھوکی پیاسی اور شک و اضطراب نفس کے زخموں سے جاں بلب ہے۔ کس کا ساتھ دینا چاہئے؟ اس کا جو خود شک و ریب کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے ایک تاریکی سے نکلنے کے لئے دوسری تاریکی میں ڈوبتا ہے اور تاریکیوں کا یہ حال ہے کہ خود اپنا ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ ایک گتھی سلجھانا چاہتا ہے تو دس نئے الجھاؤ شش و پنج اور اس میں پڑ جاتے ہیں: کظلمات فی بحر لجی یغشاہ موج من فوقہ موج، من فوقہ سحاب ظلمات بعضہا فوق بعض! اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً

فماله من نور ٭ (نور) اور جس کی اُن ساری کوششوں اور طلب و جستجو کا جو حقیقت تک پہنچنے اور عقدۂ ہستی کو حل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ یہ حال ہے کہ ہر نیا مرحلہ ایک نئی گمرہی کا پیام اور ہر منزل ایک نئے بعد و گم گشتگی کی مایوسی ہوتی ہے۔ جس نظریہ پر رکتا اور جس تھیوری کو فاتح کار سمجھ کر پوجتا ہے۔ جب اُس تک پہنچتا ہے تو یقین کی جگہ وُہ خود ایک نئے شک کی دعوت نکلتی ہے اور جواب کی جگہ وُہ خود ایک نیا سوال ہوتی ہے اور اس طرح اس کی ساری اُمیدیں اور ساری خوشیاں اُس پیاسے کی اُمید سے زیادہ نہیں ثابت ہوتیں جو ریگستان افریقہ کو دجلہ و فرات سمجھ کر بے تحاشا دوڑ رہا ہو: کسراب بقیعة یحسبه الظمان ماء حتی اذا جاءہ لم یجدہ شیئا (نور)۔ پس کیا کھوئے ہوؤں کو طلب دلیل و ہدایت میں اپنے ہی جیسے کھوئے ہوؤں کا دامن پکڑنا چاہیئے ٭ ضعف الطالب والمطلوب (حج)۔ اور لبئس المولی ولبئس العشیر (حج) یا پھر اس کا ساتھ دینا اور بلا چون و چرا سمع والطاعت کا سر جھکا دینا چاہیئے۔ جس کی ساری پکار اور سارے پیاموں کی بنیاد ہی یہ ہے کہ میں ظلمت نہیں بلکہ سرتاسر نور ہوں۔ میں تاریکی میں ادھر اُدھر بھٹکنے والا قدم اور خود اپنے ہاتھ کو بھی نہ دیکھ سکنے والی آنکھ نہیں ہوں، بلکہ معرفت و شہادت کا اُجالا ہوں۔ نورانیت میں بے خوف لغزش و بے خطرۂ گمرہی دوڑنے والا قدم ہوں اور دوپہر کی چمکیلی روشنی میں ایک ایک ذرہ تک کو دیکھ لینے اور پالینے والی بینائی ہوں "السمحة الحنیفیة والحجة البیضاء لیلھا کنھارھا" یہاں ظلمات بعضھا فوق بعض کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یمین و یسار، بالا و پست، اور بین یدیہ و خلفہ بجز نور اور "نورٌ علیٰ نور" کے اور کچھ نہیں ہے وکان من دعائہ صلعم باللیل: اللھم اجعل فی قلبی نوراً وجعل وفی لسانہ نوراً واجعل فی سمعی نوراً واجعل فی بصری نوراً من خلفی نوراً وامامی نوراً واجعلی لی من فوقی نوراً ومن تحتی نوراً۔ اللھم اعطنی نوراً "(مسلم) نہ میری حقیقت بیں آنکھ کے لئے زیغ ہے۔ و منزل شناس قدم کے لئے ٹھوکر۔ ما زاغ البصر وما طغیٰ۔ لقد رای من ایات ربہ الکبریٰ۔ اور حدیث انس کہ "وا لذی نفسی بیدہ، لقد عرضت علی الجنة

والنار انفاً فی عرض ھذا الحائط وانا اصلی" (بخاری) اور حدیث اسماء بنت ابی بکر اور خطبۂ صلوٰۃ کسوف کہ "مامن شئ لم اُرہ الاوقد رأیتہ فی مقامی ھذا حتی الجنۃ والنار، واوحی الی ربکم یفتنون فی القبور" الخ ورواہ البخاری اور "ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی" رواہ الاربعہ۔ اور ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ "اتانی ربی فی احسن صورۃ (وفی روایۃ اتانی اللیلۃ ربی) فقال فیم یختصم الملاء الاعلی فقلت لا ادری۔ فوضع کفہ بین کتفی حتی وجدت برد انامله بین ثدیی وتجلی لی علم کل شئ" اخرجہ جماعۃ منھم احمد والترمذی وصححہ۔ بلکہ جس حقیقت ہزار حجاب کا ایک سچا یا کم از کم سچائی سے قریب تصوّر بھی تم سے بن نہ آیا۔ میں نہ صرف اس کا سراغ ہی رکھتا ہوں بلکہ وُہ تو میری دیکھی بھالی اور میرے سامنے کی مشہود و منظور ہے: "حتی وجدت برد انامله بین ثدیی"! اُس کی اُنگلیوں سے چھونے کی ٹھنڈک اپنے سینہ پر محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بعد اور کیا باقی رہے گا؟ ثم دنی فتدلی، فکان قاب قوسین اوادنی!

جمالك فی عینی وحبك فی قلبی

وذکرك فی فمی، فاین تغیب؟

تم نے اپنی درماندگیوں سے عاجز آ کر اس کا نام ہی ما فوقِ ادراک اور غیب رکھ دیا ہے۔ حالانکہ یہاں تو اس کی مشہودیت کا یہ حال ہے کہ اس کا ذکر ہی "شہادت" کے لفظ سے کیا جاتا ہے جس کے معنی حضور و رویت کے ہیں۔ شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملائکۃ، واولوا العلم قائما بالقسط (عمران) تم اس کی طلب و جستجو کو گمان و خیال اور قیاس و ظن سے تعبیر کرتے ہو کہ اس سے آگے تمہارا قدم نہیں بڑھتا: ذلك ظن الذین کفروا حالانکہ یہاں ظن و گمان کا کیا ذکر۔ ظن کو تو یہاں زندگی (ہدایت) کے دائرے ہی سے خارج اور موت (کفر) کا ہم نشین سمجھا جاتا ہے

یہاں تو اُس کی نسبت جو کچھ کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اُس کا نام ہی "ایمان" اور "ایقان" ہے یعنی عدمِ شک اور یقین صرف و بحت: یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشاهدین وما لنا لا نؤمن باللّٰہ وما جاءنا من الحق و نطمع ان یدخلنا ربنا مع القوم الصالحین! (مائدہ) امن ھو قانت اناء اللیل ساجداً و قائماً یحذر الاخرۃ و یرجو رحمۃ ربہ، قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون؟ انما یتذکر اولوا الالباب (زمر) غرضکہ جس کا حال یہ ہو کہ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ اُن کا سا نہ ہو کہ یجادلون فی آیات اللّٰہ بغیر سلطان (مومن) اور بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر (حج) تو کیا صرف وہی اکیلا نہیں ہے جس کی راہ دنیا کے لیے امن و سلامتی کی راہ ہے اور جس کے ساتھیوں کے لیے نہ تو کبھی شک کی بے چینی ہے اور نہ جہل و ظلمت کا ہراس: لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب یہی معنی ہیں ان آیاتِ کریمہ کے کہ اومن کان میتا فاحییناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس، کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا؟ (انعام) اور افمن یمشی مکبا علی وجھہ اھدیٰ

ـــــــــــــ

[1] "امن ھو قانت اناء اللیل ساجداً و قائماً" کے بعد فرمایا: ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون؟ تو اس سے معلوم ہوا کہ معرفت و ایمان باری اور عبادۃ و تبتل الی اللّٰہ کی بنیاد علم اور دانستن ہے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر جاننا اور پہچاننا کیا ہوگا کہ جب ساری خلقت رات کے بستر عافیت پر سو رہی ہو، تو ایک عارفِ حق کو کسی جانے پہچانے ہوتے کا عشق بستر راحت سے اٹھاتا اور اپنے سامنے جھکاتا ہے؟ وہ اُس کی نظرِ رحمت کے لیے روتا ہے۔ اس کی ہیبت و جبروت سے کانپتا اور تھراتا ہے۔ اس کے بخشش کے بڑھے اور کھلے ہوئے ہاتھوں (بل یداہ مبسوطتان) کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بے اختیار طلب و سوال کا ہاتھ بڑھاتا اور بیقراریوں کی آوازوں میں پکارتا اور مانگتا ہے؟ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا: انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء کہ خوفِ الٰہی معرفتِ صفات کے بعد ہو سکتا ہے اور معرفت علم ہے۔ پس جو صاحبانِ علم ہیں۔ وہی اس سے ڈریں گے بھی۔ غرضکہ قرآن حکیم کے نزدیک عبادت، علم و التعقل و ادراک ہے اور عصیان و غفلت جہل و سفاہت و کوری۔ اور یہ موقع مزید تشریح کا نہیں۔

امن یمشی سویا علی صراط مستقیم؟ (ملک) اور افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علیٰ نور من ربه فویل للقاسیة قلوبھم من ذکر اللہ (زمر) و غیر ذلک من الایات فی ھذا الباب اور فی الحقیقت یہی وہ نورِ حقیقت اور مشکوٰت معرفت ہے جس کو ایک عجیب و غریب اور جامع و مانع تمثیل مرکب میں واضح فرمایا کہ مثل نورہ کمشکوٰة فیھا مصباح۔ المصباح فی زجاجة۔ الزجاجة کانھا کوکب دری یوقد من شجرة مبارکة زیتونة، لا شرقیة ولا غربیة۔ یکاد زیتھا یضیٔ ولو لم تمسسه نار۔ نور علی نور۔ یھدی اللہ بنورہ من یشاء و یضرب اللہ الامثال للناس۔ واللہ بکل شیٔ علیم (نور) اور یہ مقام منجملہ روح الروح معارف کتاب و سنت، و حقیقت الحقائق قرآن و شریعت کے ہے جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ مگر اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں تفسیر البیان میں ایک سے زیادہ مواقع پر اس کی تشریح و توضیح ملے گی اور اس سے بھی زیادہ مقدمۂ تفسیر موسوم بہ "البصائر" میں بہ عنوان حقیقت ایمان و کفر۔ باایں ہمہ اب تک طبیعت اس طرف سے سیر نہیں ہوئی ہے۔ روز بروز یہ مقام اپنی مزید وضاحت اور وسیع تر اطراف و مباحث کے ساتھ نمایاں ہو رہا ہے۔ شاید دامن بیان اس سے بھی کہیں زیادہ پھیلے، جس قدر البیان میں سمیٹا جا چکا ہے۔ معہذا اربابِ ذوق و صلاح کے لئے ایک اشارۂ حقیقت کافی ہے۔ واما الذین فی قلوبھم مرض، تو ان کے لئے حقائق و معارف کے قناطیر مقنطرہ بھی بیکار ہیں۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہیں گے۔ ماذا اراد اللہ بھذا مثلا؟

وما احسن واصدق ما قال العرفی الشیرازی:

ہزار معجزہ بنمود عشق و عقل جہول
ہنوز امت اندیشہ ہائے خویشتن است

فصل

غرضکہ امام ابن تیمیہ نے ایک ایسی حقیقت جو طبیعت کو جو ارباب ظن و رائے کی صحبتوں سے وادی شک و اضطراب میں حیران و سرگرداں ہو گئی تھی، اُن ساری باتوں میں سے ایک بات بھی نہیں کہی جو اور لوگ کہہ سکتے تھے، بلکہ صرف یہ وصیت کی کہ سیرت طیبہ نبویہ کا مطالعہ کرو۔ یہی نسخہ شفا شک و ریب کے سارے دکھوں کا ایک ہی علاج ہے، اور پھر قولاً بھی اپنی تمام مصنفات میں اسی چیز کو بنیاد و منبع ہر گونہ علم و ایقان بتلاتے ہیں؛ تو یہ بات بھی منجملہ انہی خصائص مقام وراثت نبوت کے ہے کہ:

علیم بادواء النفوس یسوسہا

بحکمتہ فعل الطبیب المجرب

اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اُس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے، صاحب قرآن کی سیرت و حیات مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض قلوب و علل ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے، اور در اصل قرآن اور حیات نبوۃ معناً ایک ہی ہیں۔ قرآن متن ہے اور سیرت اس کی شرح۔ قرآن علم ہے اور سیرۃ اس کا عمل، قرآن صفحات و قراطیس ما بین الدفتین اور فی صدور الذین اوتو العلم میں ہے، اور یہ ایک مجسم و متمثل قرآن تھا جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قالت الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ”وکان خلقہ القرآن“

مادو جانے آمدہ در یک بدن

من کیم؟ لیلیٰ، و لیلیٰ کیست؟ من!

انبیاء کرام کی زندگی سے بڑھ کر "یقین" اور "ایمان" کی پکار اور کیا ہو سکتی ہے؟ محال قطعی ہے کہ ایک صاحب استعداد سیرت نبویہ کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا ٹکڑہ بھی پیش نظر رکھتا ہو اور پھر شک و اضطراب نفس کا افسوں بلاکت اس پر کارگر ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا انبیاء کرام علیہم السلام کی نفس زندگی و وجود کو بطور ایک حجت و برہان کے پیش کیا ہے۔ نہ کہ محض بطور قصص، و اظہار علم ماسبق، و انبیاء بالغیب کے جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔

قرآن حکیم کا کھلا کھلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی کی زندگی جس طرح شروع ہوئی اور جس طرح ختم ہوئی اور جو کچھ اس پر گذرا، اور قولاً و فعلاً جو کچھ اس سے تعلق رکھتا ہے، ان میں سے ہر بات بجائے خود ایک دلیل اور برہان حق ہے۔ اس سے بڑھ کر اس حقیقت کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل یقینی و قطعی نہیں ہو سکتی کہ خدا ہے، اور ساری اچھی اور حسین صفتوں سے متصف ہے، اور اس نے جس طرح عالم ہستی اور ما فیہا کو بنایا، اسی طرح اس کے لئے قوانین و نوامیس عمل و نتائج بھی بنائے اور وہ ہر حال میں اٹل ہیں۔ دنیا میں انسان زیادہ سے زیادہ اور قطعی سے قطعی یقین جن چیزوں پر رکھتا ہے اور جن وسائل سے ان کے یقینی ہونے کو مانتا ہے، قرآن کی یہ دلیل ان سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ روشن و محکم ہے۔ اور اگر یقین کے لئے یہ دلیل کافی نہیں تو پھر اس دنیا میں یقینی کا وجود بھی نہیں۔ حتیٰ کہ دوپہر کے وقت چمکتے ہوئے سورج کا بھی نہیں! اور جسم کے ایک ایک مسام سے چھوتی اور رنگ کر چلنے والی ہوا کا بھی نہیں! اگر تم کہتے ہو کہ دنیا میں صرف انہیں باتوں کو ماننا چاہیئے جو "یقینی" ہوں اور "ثابت" شدہ۔ یعنی تم اعتقاد کے لئے صرف "امکان" کو کافی نہیں سمجھتے "اثبات" کے طلبگار ہو، تو جب بھی دنیا میں الکلم الطیب اور العمل الصالح سے بڑھ کر اور کون سی ثابت و واقع حقیقت ہو سکتی ہے؟ خود تمہارا وجود اور اثبات "انا" بھی اس سے زیادہ ثابت و مشہود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا دعوت الٰہی الوحی کو "قول الثابت" اور "دین القیم" اور "الواقع" اور "الثابت" وغیرہا سے تعبیر کیا ہے کہ لوگ دوسری طرف چلے گئے۔ بہرحال حضرت نوح کا وجود بجائے خود ایک دلیل و اثبات ہے حضرت ابرٰہیم اپنی ذات کے اندر خود ایک حجۃ قائمہ اور آیۃ کاملہ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی پوری زندگی صرف اس ایک لفظ میں تبلادی جاسکتی

ہے۔ برہانِ محکم و دلیل ثابت اور اسی طرح تمام انبیاء و مرسلین اور بوجہ ان کی تبعیت و معیت کے تمام نفوس صادقہ بشر من الصدیقین والشہداء والصالحین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگیاں اور زندگی کے تمام وقائع و اعمال بجائے خود ایک مستقل دلیل و برہان حق ہیں۔ اور اس طرح ہر نبی کا تنہا وجود سینکڑوں دلیلوں اور ہزاروں شہادتوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم ان کا استشہاداً و استدلالاً ذکر کرتا اور ان کو "آیت" اور "بینہ" سے تعبیر کرتا، اور اس طرح گویا ہر ایک تذکرۂ و حکایت حیات نبوت و ما جاء بالحق میں دنیا کے سامنے صدہا دلیلیں اور روشنیاں چمکا دیتا ہے۔ علی الخصوص یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا حضرت ختم المرسلین و صاحب اسوۂ حسنۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو بطور ایک مستقل دلیل و شاہد ثابت کے پیش کیا ہے اور نہایت کثرت کے ساتھ ان کی سیرت و سوانح اور وقائع و ایام پر مختلف پیرائیوں اور مختلف لواحق و سوابق اور روابط کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے اور بسا مقامات میں ایسا بھی ہے کہ:

گفتہ آید در حدیث دیگراں

کا معاملہ ایک کیفیت خاص اور لذت اشارات ارباب راز و نیاز کے ساتھ اصحاب نظر و ذوق کے لئے قرۃ عیون اور سرور انفس و قلوب کا حکم رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض عرفاء و اصحاب اشارات نے کہا۔ بائے بسم اللہ سے س والناس تک جو کچھ ہے، گو حکایتِ موسیٰ کلیم کی ہو اور یوسف صدیق کی (صلوٰۃ اللہ علیہما) لیکن اُن سب سے مقصود ایک ہی ہے، اور گو نام دوسروں کے ہوں مگر روئے سخن اُسی طرف ہے:

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوے تو بود!

اور اردو میں کسی نے خوب کہا ہے:

نام ان کا آسماں ٹھہرالیا تحریر میں!

والکنایۃ ابلغ والذ من التصریح:

خوش دلکش ست قصہ خوبان روزگار
تو یوسفی و قصۂ تو احسن القصص

اور اگر اس بات کو باب اشارات سے باہر بھی دیکھا جائے، جب بھی اس کی صداقت میں کلام نہیں جب تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا وجود اصلاً ایک ہی اصل و حقیقت پر مبنی اور اپنے تمام مقاصد و اعمال و وقائع میں جزءً و کلاً ایک ہی سلسلۂ بعثت کی مختلف کڑیاں اور ہم رنگ و ہم معنی اشکال و صور ہیں، اور اس لئے باہمدگر یک قلم اشباہ و نظائر کا حکم رکھتے ہیں بعد یکہ بوجہ کمال اشتراک صورت و معنی اگر ایک کڑی ہٹا دی جائے تو دوسری ٹھیک اُس کی جگہ جڑ جائے، اور معلوم ہے کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی یعنی وجودِ مقدس حضرت خاتم الادیان و مکمل الشرائع و متمم النعم ساری پچھلی کڑیوں کا جامع، اور اسی لئے بحکم "انا سید ولد آدم" اور "لو کان موسیٰ حیًّا ما وسعہ الا اتباعی" اور نص کرانی کہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس اور الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی الخ (۱) اور فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید و جئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شہیدا (نساء) منتہاء مرتبۂ سیادت و قیادت عالم و مرکزیۃ رسل و شرائع، و فضلیت کلی نوع سے فائز و ممتاز ہے:

بطراز ندگی قامت موزوں نازم
یک قبا نیست کہ شائستہ اندام تو نیست

---

(۱) ان آیاتِ کریمہ سے فضیلت و سیادت حضرت ختم المرسلین کا یوں اثبات ہوا کہ امت مسلمہ کو ساری امتوں سے بہتر فرمایا۔ اور شریعت محمدیہ کو تکمیل ادیان اور اتمام نعمت قرار دیا، اور ظاہر ہے کہ متبع کی فضلیت مستلزم افضلیت مطاع اور نعمت کا تمام نعم سابقہ سے اعلیٰ و اتم ہونا حامل و مبلغ نعمت کے اعلیٰ و افضل سمجھنے پر دال ہے۔ اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لئے ان سب سے افضل ہے، اگر آخری امت ساری پچھلی امتوں کے برکات و نعم سے مالامال اور اس لئے ان سب سے امثل و اصلح ہے، اور اگر اسی طرح شریعت آخری کے ظہور و زمان و مکان و قوم و اعمال کی ساری باتیں پچھلی امتوں کی ان ساری باتوں پر فوقیت و فضیلت رکھتی ہیں، تو یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ امت آخری کا رسول و مقوم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب و مقامات کا جامع اور اس لئے اُن سب سے افضل و ما فوق، اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہو۔ کتاب و سنت کی نصوص و تصریحات اس بارے میں بے شمار ہیں۔ تلک الرسل فضلنا بعضہم علیٰ بعض کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح و بسط اور شاید ایک طرز تازہ و استدلال جدید کے ساتھ لکھا جا چکا ہے، اور حقیقت جامعیۃ رسالۂ محمدی، و جامعیت شریعت اسلامیہ، و جامعیت امت مسلمہ، اور جامعیت جمیع ما یتعلق بہا پر ایک خاص اسلوب نظر سے بحث کی گئی ہے۔ باقی رہا لا نفرق بین احد منہم تو وہ معاملہ دوسرا ہے۔ تفریق بین الرسل کو مسئلۂ تفضیل سے کوئی

تو لامحالہ باب فضائل ومقامات اور قصص وحکایت مناقب وبرکات ہیں جو کچھ قرآنِ حکیم نے بیان کیا ہے" یا جو کچھ صدق لسان وتحقیق بیان کے ساتھ اس بارے میں کہا جائیگا، وہ گو بلا واسطہ دوسروں کی حکایت ہو، مگر بالواسطہ متعلق اسی وجود اجمع واکمل سے ہو گی۔ اور جب کبھی خاص اس وجود جامعیت کی نسبت کچھ کہا جائیگا، تو گو اس میں دوسروں کا ذکر لفظاً نہ آئے، لیکن حال یہ ہو گا کہ گویا تمام انبیاء ومرسلین بلکہ نوع انسانی کے تمام افرادِ فضیلت اور جماعت من انعم اللّٰہ علیہم کے تمام اشخاص مراتب وکمال میں سے ایک ایک فرد کا ذکر کر دیا گیا، اور وہ سب کچھ آ گیا اور سمیٹ لیا جو اُن کے بارے میں کہا جا سکتا تھا۔ جب باغ وچمن کا نام لیا تو گو تم نے نہ پھولوں کا نام لیا ہو، نہ ان کی رنگت وبو کا، نہ نہروں کا ذکر کیا ہو نہ ان کی نضادت وروانی کا، لیکن خود بخود اُن سب کا ذکر آ گیا، اور اس ایک نام کے ساتھ وہ سارے نام لے لئے گئے۔ اور جب تم نے کہا تختۂ گل، ہوائے عطر بیز، نظارۂ انہار واشجار، بنفشہ وسنبل ویاسمن، تو اب تم باغ وچمن کا نام لو یا نہ لو، مگر اُس کا نام تو تم نے اُن ناموں میں سے ہر نام کے ساتھ ہی لیا، اور گو بظاہر ذکر بنفشہ وسنبل اور اشجار وانہار کا تھا مگر فی الحقیقت ذکر اُن سب کا نہیں بلکہ صرف ایک ہی حقیقت جامعہ کا تھا۔ یعنے باغ وچمن کا۔ مولانا کے اشارات اس مقام کی نسبت ازبس لطیف وپر ذوق واقع ہوئے ہیں۔ ازاں جملہ کیا خوب فرمایا:

نام احمد نام جملہ انبیاست
چونکہ صد آمد نود ہم پیش ماست

جب "سو" کہہ دیا تو اب ایک سے ننانوے تک جو کچھ ہے سب آ گیا۔ اور جب کہا ایک، دو، دس، پچاس۔ تو فی الحقیقت ذکر "سو" ہی کا ہوا۔ قرآنِ حکیم میں یا احکام ہیں، یا مواعظ وحکم ہیں، یا شرح قوانین ہدایت وضلالت، اور یا پھر قصص الاولین۔ تو معلوم ہے کہ اگر احکام

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۹۶) تعلق نہیں اسی طرح لا تفضلونی علی یونس بن متی" وغیر ذٰلک، تو اس نہی کا مورد و محمل بھی دوسرا ہے۔ اور منہی عنہ معاملۂ تفضیل میں وہ تکلم بالرائے ہے جو منجر بہ تفریق بین الرسل ہو جس نے تمام امم سابقہ کو گمراہ کیا۔ نہ کہ نفس تفضیل۔ کیونکہ "انا سید ولد آدم ولا فخر" آدم ومن دونہ تحت لوائی" کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ اور پھر قطع نظر قرآن حکیم کے، خود نصوص سنت اس بارے میں بیشمار ومعلوم۔

ہیں تو اسی شریعت کے جس کا حامل سید المرسلین ہے۔ مواعظ و حکم ہیں تو وہی ہیں جن کی عملی تصویر و اسوۂ کاملہ وجود سید المرسلین ہے۔ قصص ہیں تو انہی فضائل و مراتب کے جو سب کے سب مرتبۂ جامعیت محمدیہ میں بوجہ اتم و اکمل جمع ہو گئے۔ پس اگر حضرات صوفیاء کہ ہم نے تمام قرآن کو اسی ایک حسن اکمل و جمال بے ہمتا کی حکایت شمائل و شرح سراپا کہا، تو قطع نظر فسحت میدان اشارات کے، ویسے بھی یہ کیوں موجب قدح و شک ہو؟ حق یہ ہے کہ "قرآن" اور "صاحب سنت" کی باہمی یگانگت و اتحاد کے باب میں جو کچھ بھی اور جس قدر بھی کہا جائے، اس سے بہت کم ہے جس قدر کہنا چاہیئے۔ (وللہ در ما قال)

ما شئت قل فیہ، فانت مصدق

فالحب یقضی والمحاسن تشھد!

بلکہ اس مقام پر حق تو وہ ہے جو شیخ ابن الفارض نے کہا۔ طلب اللہ مضجعہ:

وعلی تفنن واصفیہ بوصفہ   یفنی الزمان وفیہ مالم یوصف!

وقال ایضاً رحمہ اللہ:

اری کل مدح فی النبی مقصراً   وان بالغ المثنی علیہ واکثر

اذ اللہ اُثنی بالذی ھو اھلہ   علیہ، فما مقدار مایمدح الوری!

اور اگر خاص طور پر اس معاملہ کو دیکھا جائے تو فی الحقیقت یہ چیز بھی منجملہ خصائص قرآن و صاحب قرآن کے ہے۔ آج تمام ادیان حاضرۂ عالم میں کوئی دین بھی ایسا نہیں جس کی کتاب الٰہی اور صاحب و حامل کتاب کے باہمی علاقۂ وحدت کا یہ حال ہو اور دونوں میں سے ہر وجود ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ و ملحق اور باہمدگر شاہد و مشہود کا تعلق رکھتا ہو کہ کتاب، حامل کتاب کی صداقت پر دلیل و شاہد ہو، اور حامل کتاب، اصل کتاب کی صداقت پر:

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند!

حتیٰ کہ اگر تاریخ شریعت کے تمام وسائل معدوم ہو جائیں، اور روایت و حکایت کے تمام صحائف سے قطع نظر کر لیا جائے، جب بھی صاحب شریعت کے وجود و سیرت کی تاریخی

حقیقت اُسی طرح روشن و بین باقی رہا ہے، جس طرح تاریخ و روایت کے دفاتر میں ہے، اور اگر دنیا چاہے تو اس کی پوری سوانح عمری اور تاریخ حیات صرف ایک کتاب اللہ کی لوح محفوظ اور کتاب قیم ہی سے بلا ایک نقطہ کی فروگذاشت کے مرتب کر لے!

فصل

لوگوں نے حیات و سیرت طیبہ حضرت ختم المرسلین (صلعم) پر اس حیثیت سے بہت کم نظر ڈالی ہے کہ اگر روایات و دفاتر تاریخی سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف قرآنِ حکیم ہی کو سامنے رکھا جائے، تو آپ کی سیرت و حیات پر کیسی روشنی پڑتی ہے؛ اور جس طرح قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج نہیں، اسی طرح اپنے حامل و مبلغ کے وجود و حیات کے بیان میں بھی خارج کا محتاج ہے یا نہیں؛ اصحاب سیر و محدثین کرام کے فضائل و مدائح منصوصۂ قرآنیہ کے تو باب باندھے ہیں۔ مثلاً قاضی عیاض نے شفاء کے متعدد ابواب میں قرآن حکیم کی آیات متعلق فضائل و مدائح جمع کی ہیں، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، آج تک کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآن حکیم میں دائرہ استناد و اخذ محدود رکھ کر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے۔ جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں نے کہا آپ، سیرۃ میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجئے۔ "قرآن اور سیرت محمدیہ" اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلائیے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو، وہ اُس کی ابتدا ہمیشہ شک اور تردد سے کیا کرتے تھے، اور جب تک یقین کرنے کے لئے مجبور نہ ہو جائیں یقین نہیں

کرنا چاہتے تھے۔ اس چیز نے اُن کی علمی زندگی کو بھی (یعنی کاروبار و انتظامات کی زندگی کو) بہت نقصان پہنچایا، اور وہ کوئی عملی کام جم کر نہ سکے۔ ندوہ کے معاملہ میں جو الجھاؤ لوگوں نے ڈالے، وہ اُن کے اسی ضعفِ یقین و عدمِ جزم و صلابتِ ارادہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اُن سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اُن کو اُن کی جگہ سے ہٹا سکتا۔ بہرحال انہوں نے اس خیال پر بہت ہی پسندیدگی ظاہر کی مگر وہی اپنی عادت کے مطابق اظہارِ شک و ناامیدی کہ اتنا مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب ہو سکے؛ لیکن جب مَیں نے بہت اصرار کیا تو کہا اچھا تم اگر یہ ٹکڑہ مرتب کر دو تو سیرت کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ آخری یکجائی دہلی میں ہوئی تھی۔ اُس وقت انہوں نے کہا۔ اب مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور بہت ہی اہم چیز ہوگی۔ چنانچہ دہلی سے آ کر میں نے کچھ وقت اس میں صرف کیا اور ایک مستقل سیرتِ نبویہ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کر دی۔ جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا، نئے نئے دروازے کھلتے گئے، اور امید و توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ گو حقیقت پہلے سے پیشِ نظر تھی۔ حتیٰ کہ اس بارے میں بڑا ذخیرہ آیات کا ذہن میں مستحضر تھا، لیکن یہ بات تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں گذری تھی کہ جس کتاب کو بظاہر جابجا ذکرِ احکام و مسائل و قصصِ گزشتگان سے مملوء پاتے ہیں، اس میں اس قدر وافر ذخیرہ خاص شخصِ رسالت کے حالات و وقائع کا بھی موجود ہوگا؛ کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد جو دیکھا تو ایک عجیب عالم نظر آیا۔ حیات و سیرت کا کوئی ضروری ٹکڑہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ملوں۔ اور پھر نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت بلکہ صحابۂ کرام کے حالات و خصائص کا بھی کافی ذخیرہ موجود ملا۔ صحابہ کی جماعت درسگاہ تزکیۂ و تعلیم نبوۃ سے نکلی ہوئی موعنون الاولون کی اولین جماعت تھی۔ و یعلمھم الکتاب والحکمۃ و یزکیھم۔ اس لئے اُن کے سوانح و ایام بھی سیرتِ نبویہ ہی کے مختلف اجزا ہیں، بلکہ ہدایتِ قرآنی و حکمتِ نبوی کے عملی و مجسم ثمرات ہونے کے لحاظ سے دلائل و آیاتِ نبوت کے حکم میں داخل۔ پس یقیناً آپ کی سیرت مکمل نہ ہوتی۔ اگر اُن کے حالات بھی

قرآن میں پوری شرح و تفصیل سے نہ ملتے۔ اس ٹکڑے کو دیکھ کر مجھ کو آخری مرتبہ یقین اس بارے میں حاصل ہو گیا کہ اگر دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہو جائیں، اور دنیا نے جو کچھ چھٹی صدی عیسوی کے ایک ظہور دعوت کی نسبت سنا ہے وہ سب کچھ بھلا دے، اور صرف قرآن ہی دنیا میں باقی رہے، جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مقدسہ اور آپ کی سیرت حیات کے براہین و شواہد مٹ نہیں سکتے۔ صرف ایک قرآن ہی اس کے لئے بس کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا کو بتلا دے کہ اُس کا لانے والا کون تھا؟ کیسے زمانے میں آیا؟ کس ملک میں پیدا ہوا؟ اُس کے خویش و بیگانہ کیسے تھے؟ قوم و مرز بوم کا کیا حال تھا؟ اُس نے کیسی زندگی بسر کی؟ اُس نے دنیا کے ساتھ کیا کیا اور دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اُس کی باہر کی زندگی کیسی تھی اور گھر کی معاشرت کا کیا حال تھا؟ اُس کے دن کیسے بسر ہوتے تھے اور راتیں کن کاموں میں کٹتی تھیں؟ اُس نے کتنی عمر پائی؟ کون کون سے اہم واقعات و حوادث پیش آئے؟ اور پھر جب دنیا سے جانے کا وقت آیا تو دنیا اور دنیا والوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا؟ اس نے جب دنیا پر پہلی نظر ڈالی تھی تو دنیا کا کیا حال تھا؟ اور جب واپسیں نظر وداع ڈالی تو وہ کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی؟ غرضکہ ایک وجود و مقاصد وجود اور اعلام صداقت و عظمت کے لئے اُس کے وقائع و ما یتعلق بہا و ما ینا سب ذٰلک میں سے جن جن باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ سب کچھ صرف قرآن ہی کی زبانی دنیا معلوم کر لے سکتی ہے، اور اس بارے میں بھی قرآن اپنے سے باہر کا ابداً محتاج نہیں۔ اور پھر یہ سب کچھ از قبیل اشارات و مرموزات نہیں ہے جیسا کہ ارباب نکات و دقائق کا طریق استنباط ہے، بلکہ صاف صاف اور کھلا کھلا بیان جو فقہاء کے طریق استنباط اشارۃ النص سے کہیں زیادہ واضح و ظاہر ہے! اور اگر رموز و اشارات و تلمیحات کا طریق اختیار کیا جائے تو پھر خاص خاص آیتوں کو چھانٹنے کی کیا ضرورت؟ پورے قرآن میں بجز اس ایک ذکر کے اور کوئی ذکر ہی نہیں ہے!

وکل الی ذاک الجمال یشیر!

اگر غور کیا جائے تو فی الحقیقت یہ معاملہ بھی منجملہ مہمات خصائص و اعجاز قرآن کے ہے۔ کسی پیغام

کی صداقت جانچی نہیں جا سکتی، جب تک پیغام لانے والے کی صداقت و امانت نہ جانچی جا سکے اور وہ ممکن نہیں جب تک اُس کی پوری زندگی اور زندگی کے وقائع و اعمال دنیا کے سامنے نہ ہوں۔ پس اس اعتبار سے آج تمام عالم میں اگر کوئی صحیفۂ آسمانی ایسا ہے جو اپنے لانے والے کی زندگی کے وقائع و سوانح ہر زمانے اور ہر عہد میں خود اپنی زبانی سنا دے سکتا ہے، تو وہ بحکم ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق بجز قرآنِ حکیم و محفوظ کے اور کوئی نہیں۔ اُس کے علاوہ جس قدر کتب سماویہ (فی اعتقادنا او فی زعمھم) موجود ہیں، وہ یا تو اپنی صداقت کی اور ساری باتوں کی طرح اس بارے میں بھی بالکل خاموش و مظلم ہیں حتیٰ کہ اپنے لانے والوں کے لئے وجود کے اثبات سے بھی عاجز، اور اگر اس کی شخصیت کا ذکر کرتے بھی ہیں، تو ایسے مجہول و سراپا شکوک و ارتیاب کی شکل میں جس سے اثبات کی جگہ اور زیادہ سلب و نفی کا یقین پیدا ہو جاتا ہے اور پھر جب اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ آج دنیا میں شہرت و تواترِ نقل و حفظ و روایت، اور توارث اسناد و قرأۃ، و تعامل کروڑہا نفوسِ عالم نسلاً بعد نسلٍ و حین بعد حین، و تلاوتہ اوقات خمسہ لیل و نہار (فضلاً عن تلاوتہ و تدبرہ فی کل حین و آن) کے اعتبار سے صرف ایک ہی کتاب قطعی و یقینی اور محفوظ و غیر مبدل ہے۔ بحیث لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ و انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون و بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ و فی صدور الذین اوتوا العلم و غیر ذلک من قواطع الحفظ و الصیانۃ) اور اس لئے علی وجہ الارض اسم «علم» «الکتاب» کا مستحق اور کوئی نہیں، تو پھر ظاہر ہے کہ جس وجودِ شخصیت اور اس کی حیات و سیرت کا اثبات و اعلام اس کتاب کے اندر ہوگا، اُس کے وجود و سیرت سے بڑھ کر سماءِ دنیا کے نیچے اور کونسی انسانی ہستی قیامت تک کے لئے اثبت و اقوم ہو سکتی ہے؟ اور دنیا اپنی ہدایت کے لئے اگر کسی انسان کے آگے جھک سکتی ہے، تو اس انسانیت کبریٰ و عبدیت اعلیٰ و بشریت واحدہ کے سوا اور کون انسان ہے جس پر آنکھوں سے دیکھنے والوں کی طرح ہمیشہ یقین کیا جا سکتا ہے؟ اور جس پر ایمان لانے کے لئے پچھلی امتیں اور نسلیں بھی پہلوں کی طرح قطعی و یقینی روشنی رکھتی ہیں؟ اور پھر جس وجود کی سیرت و حیات قیامت تک کے لئے اس طرح محفوظ

وثبت کر دی گئی ہو، علاوہ اُن نقوش غیر فانی کے جو صفحۂ عالم پر ثبت ہیں، اور جس کی زندگی کے وقائع طیبہ کو اس طرح سورج کی دائمی روشنی اور ستاروں کی یکساں سیر و حرکت کے دامن سے باندھ دیا ہو، کیوں نہ اس خاکدان جسم و زماں میں اس کی موت و حیات یکساں ہو؟ اور کیوں اس کی دائمی حیات و قیام کے عقیدہ سے انسان کے تاریک دلوں کو انکار اور غافل روحوں کو گریز ہو؟

فی الحقیقت یہی معنی ہیں دیگر صدہا معانی و حقائق ثابتہ کے ساتھ اس رفع ذکر کے کہ ورفعنا لك ذكرك اور یہی وہ مقام ہے کہ جب اصحاب کشف و مشاہدات کے سامنے کھلا تو انہوں نے "حقیقت محمدیہ" کے احاطۂ و حیات اور عدم زوال و بقاء و استمرار کو تمام انبیاء کرام کے حقائق تعینات سے مافوق؛ اور بوجہ دائرۃ الدوائر اور مرکز ادوار تعینات مابعد اور نقطۃ الحیات فی الاصل والحقیقت ہونے کے تمام انوار تعینات و وجود کو اس کی نورانیت کے سامنے بے فروغ و ماند پایا، اور اسی لئے شیخ اکبر نے اس کو تعین اول اور مورد صحیح اصطلاح "عقل اول" کا قرار دیا۔ اور پھر "انسان کامل" اور "روح اعظم" اور "نفس واحدہ اور "قلم الاعلیٰ" اور "نور الانوار" اور "نفس الکائنۃ" سے بھی اس کو تعبیر کیا گیا کہ بلحاظ بقاء ذکر و دوام فیضان حیات وہی ایک انسان کامل، روح الاعظم، اور النفس الواحدت والکائنۃ ہے اور حیات معنویہ مستمرۂ نوع و ارض کی مرکزیت صرف اسی کو پہنچتی ہے۔ اور اسی لئے قرآن حکیم نے صرف اسی وجود کو "العبد" سے تعبیر کیا کہ ساری عبودیتیں آنی و وقتی ہیں مگر صرف یہی وہ عبودیت کاملہ و واحدہ ہے جو ہمیشہ عباد و معبود میں واسطۂ ہدایت اور ہمیشہ عبد کو معبود سے واصل کر دینے کے لئے حی و قائم ہے، وقال العارف البوصیری:

منزہ عن شریك فی محاسنه

فجوهر الحسن فیه غیر منقسم!

اور چونکہ نوع انسانی کی سعادت و تنویر کا مرکز و مبدء وجود انبیاء کرام ہے، اور حقیقت محمدیہ بحکم وجئنا بك علی ھٰؤلاء شھیدا ان سب سے مافوق اور شمس و کواکب اور صباح و مصباح کے معاملہ کا حکم رکھتی ہے، اس لئے حیات قائمہ و دائمہ کا نور الانوار اور اصباح المصابیح

صرف وہی دائرہ ٹھہرا، اور اسی لئے شیخ اکبر و جیلی نے اس کو "حقیقت الاسمائیہ" اور "لوح محفوظ" سے بھی تعبیر کیا۔ سبحان اللہ! یہ آخری تسمیہ، تعبیر کس درجہ ترجمان حقیقت و وافق بالشرع والعقل ہے! دنیا میں جس قدر بھی ہدایت و تعلیم کی لوحیں تھیں، سب کے لئے تغیر و تبدل ہوا۔ حتیٰ کہ آج کوئی بھی محفوظ نہیں۔ لیکن اللہ اکبر مقام محمدی کی محفوظیت و مصئونیت کہ اس کی سیرت طیبہ اور حیات جبہ و قائمہ کی لوح محفوظ کا ایک نقطہ بھی محو نہ ہو سکا، اور قرآن محفوظ و کتاب مسطور فی رق منشور اور فی صدور الذین اوتو العلم میں اس کا ایک ایک حرف ایک ایک لفظ اسی طرح نقش و ثبت ہے اور ہمیشہ رہے گا، جس طرح قلم ازل نے اول صبح تعین کی کرنوں سے لکھ دیا تھا۔ پس قرآن کے بعد اگر کوئی اور ہستی "لوح محفوظ" ہو سکتی ہے تو وہ صرف وہی روح اعظم و خالد ہے جس کے ذکر کو خود قرآن نے اپنی آغوش حفظ و صیانت میں ہمیشہ کے لئے لے لیا ہے۔ حضرت سید العارفین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی مقام کی طرف اشارہ کیا ہے، اگرچہ بعض کم فہموں نے اس کی ضمیر متکلم کو نہ سمجھا اور ایک دوسری ہی وادی میں لے گئے، اور یہ آفت عام و اعم ہے:

افلت شموس الاولین و شمسنا

ابداً علی افق البقا لا تغرب

حضرت والد مرحوم نے اس ملفوظ مبارک پر ایک دوسرا پیش مصرعہ لگا کر مطلب واضح کر دیا ہے۔ یہ ان کے ایک طول طویل قصیدہ بائیہ میں سے ہے:

شمس تقادم قبل آدم طلعہا

ابداً علی افق البقاء لا تغرب!

اور یہ جو بعض اکابر نقشبندیہ علی الخصوص حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے علوم کشفیہ میں ظاہر کیا کہ دائرہ حقیقت محمدیہ سیر قدمی کی آخری حد ہے۔ اس کے بعد صرف سیر نظری کی گنجائش ہے۔ وھو من خصائصہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور نیز تمام اصحاب احوال و کشوف اس پر متفق ہوئے، تو حقیقت اس کی بھی یہی ہے کہ چونکہ حقیقت محمدیہ روح و حیات

کا آخری نقطہ اور سرچشمہ قرار پائی، تو لاجرم سیر و اقدام کی آخری منزل بھی وہی ٹھہری۔ اس کے بعد جو کچھ ہے ما فوق اور وراء الوراء تعینات ہے۔ اس لئے نہ سیر کی وہاں گنجائش، نہ قافلۂ طلب اور محمل شوق کا وہاں گذر، بلکہ طائرِ فکر و مرغ خیال بھی اس کی فضاءِ لاتعین میں درماندہ و پر و بال سوختہ:

اے برون از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرقِ من و تمثیل من!

والکلام فی ھذا یطول ولہ موضع غیر ھذا الموضع الذی نحن فیہ۔ اور یہ جملۂ معترضہ بھی جو بوجہ فصل و خلل ربط مطالب پہنچ گیا، تو اس لئے کہ مذکور کی جاذبیت و محبوبیت سے ذکر و ذاکر کی بیخودی و محویت ناگزیر ہے، اور اشارات کا طول و قصر مشار الیہ کے جذب و کشش پر موقوف پھر جس مذکور و مقصود کا یہ حال ہو کہ بقول صاحب فتوحات مکیہ:

یا من ھو للقلوب مقناطیس!

اور اس دنیا میں ذکر صرف اُسی کا ذکر اور بات صرف اُسی کی بات ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہو، یا اُسی کے طرف مصروف و محمول ہو، اور یہ نہ ہو تو پھر بے خودی و بے حاصلی۔ اتلاف صرف و ضیاع بحث:

اوقاتِ ہماں بود کہ با دوست بسر رفت
باقی ہمہ بے حاصلی و بے خبری بود

تو کیونکر ممکن ہے کہ عنانِ قلم از دست رفتہ نہ ہو اور سررشتۂ فکر و شغل دامن صبر و شکیب کی طرح ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے؛

وید رکنی فی ذکرہ قشعریر لہا بین جلدی والعظام دبیب!

ذکر سیرت نبویہ ماخوذ و مستنبط از قرآن کی نسبت تھا۔ سو الحمدللہ وہ امید و گماں سے بھی وہ چند اوسع و اکمل مرتب ہو گئی۔ ورأیت فیہ مالا عین رأت ومالا اذن سمعت۔ انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ساری سیرتیں اور تاریخیں ایک طرف، اور خود لسان الٰہی کا ایک کلمۂ منطوقہ و محفوظہ ایک طرف، تعجب ہے کہ اصحاب سیرت نے باوجود کمال سعی و نظر اور مشغولیت بہ جمیع طرق و ترتیبات سیرت اس طرف کبھی توجہ نہ کی۔ جب تک یہ چیز مرتب نہیں ہوئی تھی،

خود اپنا حال بھی دوسرا تھا۔ اور اب جو دیکھا تو کارخانہ ہی دوسرا نظر آیا:

تمام بود بہ یک حرف گرم و ما غافل
حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند!

(معهذا)

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی!

فصل

ا اور یہ معاملہ صرف شیخ عماد الدین واسطی ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ امام ابن تیمیہ کے برکات امامت و وراثت کاملہ نبوت کے اس فیضانِ جاری و ساری کا اُن کے تمام معاصرین محققین نے خصوصیت کے ساتھ اعتراف کیا ہے، اور آج بھی ان کے علوم و معارف سنت کے اس خاصۂ عظیمہ کا ہر وہ شخص اور جماعت تجربہ کر سکتی ہے جو شک کی بیماریوں سے مایوس اور یقین کی محرومیوں سے لب مرگ ہو، اور جس کو حدیث نفس (۱) اور وہم خاطر فاترہ کے زخموں

(۱) تمام نام نہاد علوم و فنون جدل و خلاف، و تعمقات وہمیۂ و خیالیہ، و صناعات تشکیکیہ در مطالب شرعیہ از قبیل مقولات کم و کیف والاین والمتیٰ و لماذا، و مباحث و مبانی تراشیدہ و خراشیدۂ متکلمین مجادلین، و اصول مصنوعہ و قواعد مزعومۂ ارباب قیل و قال و پرستاران آراء و اقوال رجل من الرجال و اشغال و تشددات بدعیۂ و محدثۂ اصحاب خوانق و جوامع: احوال، و اوہام و ظنون فاسدۂ دخلاء اعجام و مولدین در ملت عربیہ باسم و زعم واردات و مکشوفات و بوارق و احوال، بلکہ وہ تمام وساتیر و اساطیر ضالہ و مضلہ جو "انتحال المبطلین و تاویل الجاہلین و تحریف الغالین" کے اقسام ثلاثۂ ضلالت میں داخل ہیں، یا فتنۂ شبہات و فتنۂ شہوات کے شجرۃ الزقوم کے برگ و بار، یا ایک تیسری تقسیم ضلالت کی بنا پر ان کو "فتنۂ جدل" و "فتنۂ رائے" کے کنوز فساد و دفائن بطلان میں سے یقین کرنا چاہیے کہ "ما ضل قوم بعد ھدی کانوا علیہ الا اوتوا الجدل" رواہ الترمذی و احمد و ابن ماجہ اور بیہقی

فیفتون برایھم فیضلون و یضلون" رواہ ابن عمرو اخرجہ البخاری، وغیر ذلک من احادیث الباب، تو یہ سب کچھ بھی فی الحقیقت "حدیث نفس" کے مظاہر و ثمرات ہیں سے ہیں۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہ، "واگر نیک نظر کنی در دو متاخرین جمیع لم ولا نسلم معقولیان ورائے وقیاس اصولیان وجدل وتعمق متکلمان ہم از جملہ حدیث نفس ست کہ نفوس سقیمۂ ایشاں راالقصد در ترتیبات وتخیلات انگندہ، واز نور قرآن وماثور در احادیث نفسیہ انداختہ۔ فضلوا واضلوا" قالہ فی التفہیمات وھمعات۔ اس اُمت میں آج تک کوئی اعتقادی وعملی وقلبی وذہنی ضلالت نہیں پھیلی ہے مگر اسی دروازہ سے۔ فھا اولاء جمعوا بین الفتنتین۔ فتنۃ الرائے وفتنۃ الجدل۔ او فتنۃ التشکیک والشبہات، وفتنۃ الشہوات والاھواء۔ وکل فساد فی الدین بل والدنیا فمنشؤہ من ھاتین الفتنتین۔

اور سباب اس کے متعدد ہیں۔ ازاں جملہ ایک سب سے بڑا سبب وہ ہے جس کی طرف خود حدیث ابن العاص میں اشارہ کیا، اور کونسی آنے والی مصیبت تھی جس کی طرف پہلے سے اشارہ نہ کر دیا گیا ہو؟ لم یزل امر بنی اسرائیل معتدلاً (اے علیٰ وجہ العدل والصراط السوی) حتیٰ نشاء فیھم المولدون" رواہ ابن ماجہ۔ تو یہاں بھی بحکم "لتتبعن سنن من کان قبلکم" (صحیحین) ٹھیک ٹھیک طابقتہ النعل بالنعل ایک عالم مصائب و دنیائے قلاقل اسی جماعت مولدین و عجمیین کے دخول وخلط وتلبیس سے رُونما ہوا، اور اسی لئے مدتوں تک غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ اُمت اسلامیہ کے تمام مفاسد ومصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو "یونانیت" اور "عجمیت" سے تعبیر کرنا چاہیے۔ سارے برگ و بار و ثمرات فساد کو انہی سے ظہور و نمو ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسم اصل واساس علوم شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحب حکمت کی نظر کیمیاوی ان کی تحلیل وتفریق کرے، تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعت الٰہیہ و دین الخالص سے مرکب ہے، اور کس قدر اسی فتنۂ عالم آشوب یونانیت و عجمیت سے؟ کوئی شے اس سے نہ بچی۔ حتیٰ کہ علماً علوم آلیہ وعربیت وبلاغت وبیان۔ اور عملاً جزئیات اعمال ورسوم وہیئات معاشرت وغیر ذلک۔ عجب یہ حال: علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر اُن اساطیر اوہام ودساتیر خزعبلات وھفوات کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقب شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے؟ وان من العلم جھلا:

بر عکس نہند نام زنگی کافور!

اور ایک جم غفیر دماغ سوختگان مدارس ومعاہد و مدعیان دراست۔ نظر و رسوخ فی العلم کا غالب سرمایۂ تفاخر، ومتاع غرور، وحاصل عمر، وثمرہ مطلب، ومقصد حیات، جو کچھ ہے وہی ہے اور اسی کیں ہے۔ الا من عصمہ اللہ، ولیکن لا یجاوز عدد ھم حرکات العوامل وتعداد الانامل۔ وذلک مبلغھم من العلم۔ اگرچہ اصحاب بینش و دانش و روشن دلان حقائق وعلوم حقہ کتاب وسنت کے نزدیک وہ سب کچھ داخل اضاعت عمر وحبط اعمال ولا یقیم لھم وزنا ہے، اور ان کے سارے گڑھے ہوئے ظلمات اوہام وکارخانہ جات اہواء کو اوھن البیوت کبیت العنکبوت سے زیادہ نہیں

سمجھتے۔ سبحان اللہ! عقل و بینش کے معجزوں کی طرح جہل و کوری اور حدیث نفس کی شعبدہ طرازیاں اور چشم بندیاں بھی کیسی عجیب و غریب ہیں! قرآن الٰہی کے براہین و الیقینیات اور محمد ابن عبد اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علوم صادقہ و حکمیات تو مہجور و متروک ٹھہرائے جائیں، اور مشرکین یونان کے خرافات و اوہام اور ارسطا طالیس کی منسوجات وہمیہ و ظنیہ اصل مطلوب و مقصود اور مایۂ صد سعادت و وسیلۂ ہزار برکات یقین کی جائیں؛ دعویٰ شریعت محمد عربی کے علم و تعلم کا، اور پرستش شریعت ارسطوئے یونانی کی! فیا للہ و للمسلمین من ھذہ المفاقرۃ التی ھی اعظم فواقر الدین، والرزیۃ التی ما رزی بمثلہا سبیل المومنین!

وسوف تری اذا انکشف الغبار
افرس تحت رجلک ام حمار؟

ائمۂ متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ و اصحابہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کی تنقیبات و تعقبات اس باب میں نہایت محققانہ و انفع واقع ہوئی ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں گو اشارات و اجمال (و للحن ابلغ من التصریح) سے کام لیتے ہیں لیکن تفہیمات الالٰہیہ اور خیر کثیر اور بدور البازغہ میں بالکل پردہ اٹھا دیا ہے۔ صرف یہی نہیں کرتے کہ ان علوم مخلوطہ کو "فن دانشمندی" کے حوالہ کر کے باقی معاملات ذوق سلیم پر چھوڑ دیں، یا "تشکیکات خام معقولیان" کہہ کر خاموش ہو جائیں۔ بلکہ صاف صاف اور بے پردہ لکھتے ہیں۔ ایک تفہیم میں اس پر مفصل بحث کی ہے "در علوم شرعیہ پسینیان چیزہا آوردند کہ مقصود و معلوم پیشینیان نہ بود۔ بلکہ در سلف امت از اں اثرے یافتہ نمی شود۔ مجموع کثیرہ فلسفۂ و حکمت یونانیان را با علم شریعت آمیختند و اصل اصول کتاب و ماثور را از دست دادہ، تا آنکہ ظاہر شریعت بنا بر کثرت ایراد و انصراف و تحریف و تخلیط چیزے دیگر گردیدہ۔ علوم اصول دین را کہ افضل علوم اسلام است، ببیں کہ متکلمین دراں چہ صنائع و بدائع آفریدند، و در وادی جدل و تعمق تا بکجا رسیدند؛ حالانکہ سلف امت نکیر عظیم داشتند بریں جنس کلام، و آنرا خارج از شریعت پنداشتند۔ و در کتب فقہ و فتاوی تامل کن کہ دامن رائے و تفریع را تا کجا کشیدند، و از اصل اصول شرع کہ قرآن و اثر سنت چہ قدر دوری جستہ؛ و ہم چنیں حال دیگر علوم دین است کہ بسبب خلط با فنون و صنائع رنگ و صورت دیگر پیدا نمودہ" اور سبحان اللہ حضرت موصوف کی نظر تجدید اور صدق فہم اور نقد ذہن کہ ایک دوسرے موقع پر اس فتنہ کو من جملہ ثمرات ردیۂ نفاق کے قرار دیتے ہیں۔ کما قالہ فی الفوز الکبیر: "نفاق اول (یعنی بباطن کفر و انکار و بظاہر شکل اسلام) بعد از آں حضرت متواں دانست۔ اما نفاق ثانی (یعنی حدیث نفس و تشکیک و عدم یقین و ایمان حقیقی) کثیر الوقوع ست۔ لاسیما در زمان ما۔ و از اں جملہ جماعت معقولیان کہ شکوک و شبہات لب بارمی آرند نمونہ آں گروہ اند" داد کما قال) یہ جو حضرت موصوف نے فرمایا "پسینیان چیزہا آوردند کہ معلوم پیشینیان نہ بود" تو یہ وہی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۸)

حقیقت ہے جس پر تمام آئمہ سلف متفق ہوئے ہیں۔ ہمارے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اعراض و اجسام میں تکلم کی نسبت پوچھا گیا تو فرمایا "لعن اللّٰہ عمر و ابن عبید ھو فتح علی الناس الکلام فی ھذا" نقلہ الرازی فی التفسیر۔ کیا خوب قاطع و فاصل قول اس باب میں امام ابن عقیل کا ہے جس کے بعد کسی چیز کی احتیاج باقی نہیں رہتی کہ "انا اقطع ان الصحابۃ ماتوا وما عرفوا الجوھر والعرض فان رضیت ان تکون منھم، فکن، وان رایت ان طریقۃ المتکلمین اولی من طریقۃ ابی بکر و عمر، فبئس ما رأیت" حکاہ القرطبی فی شرح مسلم۔ اس باب میں حضرت امام غزالی رح کا کلام بھی احیاء و بعض دیگر مختصرات میں نہایت واشگاف و محققانہ واقع ہوا ہے، اگرچہ خود امام موصوف بھی مدتوں اسی وادی میں سرگرداں رہے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آخری عہد تک کی مصنفات اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ معھذا الاعتبار بالخواتم وقال ملا علی القاری "مات الغزالی والبخاری علی صدرہٖ" رضی اللّٰہ عنہ۔ اسی لئے زبیدی نے کہا۔ علماء سوء اور ارباب جدل و خلاف پر کوئی چیز اس قدر شاق و اشد نہیں ہے جس قدر احیاء اور اس کے ابواب متعلق علم و علماء۔ اور اسی لئے ایک جم غفیر علماء سوء نے مصر کے بازاروں میں احیاء کے نسخے جلا ڈالے۔ قل موتوا بغیظکم۔ پھر جب کچھ زمانہ گذر چکا تو کہا "ھو حجۃ الاسلام وکتابہ یستحق ان یکتب بماء الذھب" فھذا یکون الحال من لا برھان لہ بہ۔ اور اکثر اکابر طریقت نے اپنے سلوک کی بنیاد صرف احیاء العلوم ہی پر رکھی جیسا کہ سلسلۂ عیدروسیہ کی نسبت شاہ ولی اللہ نے انتباہ وغیرہ میں تصریح کی ہے۔ غرضکہ اس فتنۂ عظیمہ کی داستان مصائب و حکایت نوازل بہت طولانی ہے۔ اسی "حدیث نفس" کے بروز و احاطہ نے الہام ہدایت ربانیہ اور لمعات و انوار سعادت ابدیہ کی راہیں صدیوں سے اخلاف ملت پر مسدود کر دیں، اور حقیقت دین الخالص ظلمات قیل و قال، و اھواء رجال، و صناعات مخترعہ، و مصطلحات محدثہ، و تشتت طرق، و طرائق قدد میں مستور و محجوب ہو گئی۔ معھذا طالب صادق و جویائے حق کے لئے باب ہدایت والہام سعادت مثل ہمیشہ کے باز ہے، اور با ایں ہمہ غبار محیط و تیرگی غلیظ شمس بازغہ کتاب اللّٰہ و قمر منیر سنت رسول اللّٰہ ہموارہ و پیوستہ درخشندہ و جہانتاب و ظلمت ربائے ہر گونہ شکوک و ارتیاب ہے۔ و فی الجملہ دریں دور فتن و آوان فساد سعید آں کسے ست کہ دست بدامن سلف و روش آنہا زند، و بسبیل مومنون الاولون من المھاجرین والانصار۔ الذین اتبعوھم باحسان، و طریق قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر معتصم و ثابت باشد، و آنچہ خلف امت از تغییر و تحریف و تخلیط در ہر باب از ابواب شرع ورزیدہ اند، بہ تعمیل وصیت نبوی کہ "فاعتزل تلک الفرق کلھا ولو تعض باصل شجرۃ وانت علی ذالک حتی یدرکک الموت" چشم بپوشد، و گوش حق نیوش را از غوغائے یمین و شمال کر ساختہ، علم و عمل خود را بر مدار شرع حکیم و علوم مطہرہ کتاب و سنت مقصور دارد، و قربت خدا جوید در دوری آنہا:

نے چھوڑ کر دیا ہو۔ البتہ ہر حال میں طلب صادق شرط ہے، اور جاحد و الد الخصام مریض نہیں ہے۔ جس کے لئے کوئی نسخہ مفید ہو سکے۔ وہ اموات و قبور میں داخل ہے۔ جن کا معاملہ علاج سے باہر ہو چکا۔ اور انك لتهدى الى صراط مستقيم کے ساتھ ' وما انت بمسمع من فى القبور' اور سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم بھی موجود و معلوم ہے۔ دوا بیمار کو کھلائی جاتی ہے اگرچہ جان کنی میں مبتلا ہو۔ لیکن ایک ٹھنڈی لاش کے لئے بقراط و جالینوس کی ساری مسیحائیاں بھی بیکار ہیں۔ یہی وہ حقیقت مقام امامت فی الدین اور وراثت نبوت کی ہے جو طبابت و تداوی جمیع امراض یقین و اعتقاد کی نظری و عملی قوت کی راہ کھول دیتی ہے، اور اسی کی طرف امام اہل السنت حضرت احمد بن حنبل نے اپنے نامۂ وصیت بنام مسدد بن مسرہد کے خطبہ میں اشارہ کیا تھا کہ " الحمد لله الذى جعل فى كل زمان بقايا من اهل العلم، يدعون من ضل الى الهدى، ويبصرون بنور الله اهل العمى، ويحيون بكتابه الموتى، وبسنة رسوله اهل الجهالة والردى، ويصبرون منهم على الاذى، فكم من قتيل لابليس قد أحيوه؟ وكم من ضال لا يعلم طريق رشده قد هدوه؟ وكم من مبتدع فى دين الله بشهب الحق قد رموه؟ فما احسن أثرهم على الناس! ينفون عن دين الله تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين، الذين عقدوا الوية البدعة، واطلقوا أعنة الفتنه، مختلفين فى الكتاب، ويقولون على الله وفى الله۔ تعالى الله عما يقول الظالمون علواً كبيرا" انتهى ما نقله الحافظ ابن الجوزى فى سيرته۔ یعنی اُمت محمدیہ کا کوئی

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۹

ملا رامے کہ داری دل درو بند !
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند !

اور شرح حقیقت تحریف شریعت علی الخصوص فتنتین عظیمتین یونانیت و عجمیت کے لئے مقدمۂ تفسیر باب بست و یکم از تفسیر فاتحۃ الکتاب کو دیکھنا چاہئے۔ وافردت فی مجلد مستقلاً و سمیتہ بتحصیل السعادتین۔

زمانہ نہیں جو اہل العلم کے بقایا سے خالی ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ بھٹکے ہوؤں کو راہ ہدایت کی طرف بلاتے، اور کور چشمانِ ظلمت کی آنکھوں کو نورِ الٰہی سے روشن کر دیتے، اور کتاب و سنت کی روح حیات سے جہل کے مردوں اور غفلت کی نعشوں کو جلا دیتے ہیں اور اس کام میں اہل جہل و ضلالت کے ہاتھوں جس قدر بھی اذیتیں پہنچتی ہیں، ان پر صبر کرتے ہیں۔ پھر کتنے ہی ابلیس جہل کے مارے ہوئے ہیں۔ جو اُن کی مسیحائی سے جی اُٹھے! اور شیطان شک و ریب کے تیروں کے تڑپتے ہوئے زخمی ہیں جن کو ان کے دستِ شفاء سے یقین کامرہم اور ایمان کی اکسیر ملی! بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لگا دیا۔ بدعت کے لشکروں اور احداث و تحریف کی بلٹنوں کو قرآن و سنت کے تیروں کی بوچھاڑ سے تتر بتر کر دیا۔ گمراہی کے جھنڈے اُن کے آگے سرنگوں ہو گئے اور فتنوں کی صفیں ان کے قشون دلائل و جنود براہین کے فاتحانہ حملوں سے اُلٹ گئیں۔ انتہٰی ملخصاً (۱)

---

(۱) یہ نامۂ وصیت منجملہ آثار منیرکہ جلیلہ سلف کے ہے۔ باب عقائد و فقہ اکبر میں آج سلف کی کوئی تحریر اس سے اقدم و اصح اور تمام اختلافات و نزاعات متاخرین کے لئے قاضی و قول فیصل موجود نہیں۔ آئمہ اصحاب سنت ہمیشہ اس اثر مبارک کو حرز جان و مونس روح و ایمان سمجھتے رہے۔ شیخ الاسلام ہروی کو جب ارباب بدع و تعطیل نے جلا وطن کیا تو تمام کتابیں گھر میں چھوڑ دیں۔ صرف اس مکتوب مبارک کو توشۂ سعادت سمجھ کر اپنے ساتھ لے لیا۔ حافظ ابن مندہ کا قول ہے کہ جس شخص نے اس وصیت کو پڑھا اور عمل کیا، وہ ان عبادی لیس لک علیھم سلطان کا ٹھیک ٹھیک مصداق ہے یعنی اس پر شیاطین شک و ضلالت کا کوئی داؤ چل نہیں سکتا۔ سبب تحریر اس کا حسب بیان قاضی ابویعلیٰ و ابن الجوزی بالاسناد یہ ہے کہ جب اہل بدع و فتن کی شورشیں ہر چہار طرف پھیلیں علی الخصوص معتزلہ و مرجیہ کے عقائد اور تنازع فی الدین اور شیوع مذاہب فلاسفہ و اتباع فلاسفہ سے باب عقائد و علوم میں ایک عام اضطراب پیدا ہو گیا، تو امام مسدد بن مسرہد نے کہا۔ اختلافات کی اس تاریکی میں راہ سنت تک پہنچنا ہم پر مشکل ہو گیا ہے۔ ہمارے بعد آنے والوں کے لئے اس سے بھی زیادہ مشکلات ہونگی پھر حضرت امام احمد کو لکھا ”اکتب لی سنۃ النبی صلعم“ امام موصوف نے جب خط پڑھا تو بہت روئے فرمایا ”انا للہ و انا الیہ راجعون! یزعم ھذا البصری انہ انفق فی العلم مالاً عظیماً و ھو لا یھتدی الی سنۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم!“ اس کے بعد یہ نامۂ وصیت لکھ کر بھیج دیا۔ اور لکھا کہ طالبان طریق سنت کے لئے اس قدر بس کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہماری محرومی اور کیا ہو سکتی ہے کہ متاخرین ارباب کلام بالرائے کی مصنوعات و مخترعات اور متون و شروح ممزوجہ مصطلحات و یونانیات تو عقائد میں دستور العمل بنائی جائیں، اور سلف صالح سے اس درجہ تغافل و اعراض ہو کہ امام اہل السنت بل امام الدنیا والدین کے اس ترجمان دین الخالص اور عصارۂ خالصہ و محضۂ کتاب و سنت کی لوگوں کو خبر تک نہ ہو؟

حضرت امام اہل السنت کا یہ خطبۂ و فاتحہ باوجود ایجاز کچھ ایسا جامع و ترجمان کامل مقصد واقع ہوا ہے کہ بڑے بڑے اکابر و اعلام کی زبانوں پر خود بخود چڑھ گیا۔ اور انہوں نے سارے خطبات و فواتح اور عبارۂ مطالع کو چھوڑ کر انہی چند متبرک جملوں پر اقتصار کر لیا۔ بظاہر یہ مقبولیت خطبات ماثورۂ و مطالع شہیرۂ خلفاء راشدین کے بعد اور کسی امام و مصنف کے کلام کو نہیں ملی۔ وھذا من خصائصہ رضی اللہ عنہ۔ حافظ ابن مندہ اپنے اکثر خطبات اسی سے شروع کرتے۔ حافظ ابن جوزی کا ذکر اُن لوگوں میں ہے جنہوں نے خطبات وعظ و مجامع کو ایک فن بنا دیا، قاعدہ تھا کہ اپنے اکثر وہ وعظ جن میں خلیفہ بغداد حاضر ہوتا، اسی خطبہ سے شروع فرماتے حجۃ الاسلام حافظ ابن قیم تو اس کے ایسے شیفتہ ہوے کہ اپنی اکثر کتابوں کو اسی سے شروع کرتے ہیں۔ مثلاً مفتاح دار السعادہ، و دیباچۂ نونیہ، والصواعق المرسلہ، والصراط المستقیم وغیر ذٰلک۔ تو یہ مقبولیت بلا وجہ نہیں ہے۔ اسی لئے ہے کہ اس خطبہ کے ہر جملہ میں ایک دفتر معارف پوشیدہ ہے۔ ازاں جملہ یہ کہ فرمایا "لیبتھب الحق قد دھوہ" تو یہ وہی بات ہے

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱۱

حالانکہ یہ اس فنا فی الکتاب والسنت کی توقیع وصیت ہے جس کا قول تھا "ما کتب حدیثاً عن النبی صلعم الا وقد عملت بہ"! میں نے کوئی حدیث نہیں لکھی۔ مگر یہ کہ اس پر عمل بھی کیا ہو! یعنی میں سنت کا علم مجرد نہیں ہوں۔ عمل بھی ہوں۔ وھذا معنی الوراثۃ الکاملۃ والامامۃ فی الدین۔ گذشتہ مارچ میں حضرت امام احمد کی ایک مختصر سیرت لکھنی شروع کی تھی تاکہ البلاغ میں شائع ہو۔ اسی سلسلے میں اس نامۂ وصیت پر نظر پڑی اور اس کی جامعیت مع الایجاز کچھ ایسی دلنشین و دلپسند واقع ہوئی کہ بے اختیار شرح لکھنے پر خیال مائل ہوا۔ اثبات حقیقت طریق سلف، وظواہر نصوص کتاب وسنت، و فیصلۂ محنۂ و متممۂ مسئلۂ تعارض عقل و نقل وانکشاف حقائق منثورۂ عقائد اسلامیہ کے لئے اس سے بہتر محل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک ثلث سے زیادہ حصہ لکھا جا چکا اور کمپوز ہو چکا تھا کہ حکومت بنگال نے نفی و اجلاء کا حکم جاری کیا اور مجھے رانچی چلا آنا پڑا۔ یہ شرح اور سیرت امام موصوف اگر مکمل ہو گئی تو شاید اپنے موضوع میں ایک مخصوص چیز ہو۔ علی الخصوص موجودہ عہد فتن و فساد میں کہ "لعن آخر ھذہ الامۃ اولھا" کا معاملہ اپنے آخری حد تک پہنچ چکا ہے اور غرور بالعلم والعقل (کہ فی الاصل بدترین جہل و بے عقلی ذریعہ نظر ہے) اور اہانت و تحقیر و تحمیق و استہزاء بالسلف کے جنون سے ہر تنگ ظرف سفیہ اور تہی دست بادفروش سرگراں و خیرہ دماغ ہے۔ بجد یکہ احداث و غلمان وقت صحابۂ رسول و آئمۂ و تابعین کے عقائد کو (کہ اعلم الناس واعقلھم علی وجہ الارض تھے۔ ابرھم قلوباً واعمقھم علماً) ایک طرح کی ابلہانہ نیکی و بیوقوفانہ و نافہمانہ اطاعت کیشی کہہ دینے تک میں باک نہیں رکھتے: کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا

جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی: "ردوهم بالسنة" (رواہ الدارمی) ارباب بدع و ہواء پر سنت کے تیر چلاؤ۔ اس کی روک کے لئے اُن کے پاس کوئی ڈھال نہیں۔ اور اسی لئے اہلِ بدعت کی ایک پہچان یہ ہوئی کہ ہمیشہ قرآن کے نام کی آڑ پکڑینگے (کلمة حق ارید بها الباطل) اور سنت و ماثور سے اعراض کرینگے "عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فاحلوه" الخ تو سنت و اسوۂ حسنہ کے تیروں کی بارش سے اُن کے مُنہ پھیر دو، اور ما آتاكم الرسول فخذوه اور حتى يحكموك فيما شجر بينهم اور "من اطاعني فقد اطاع الله" کے بے خطا ہتھیاروں سے اُن کا مقابلہ کرو۔ اور یہ جو فرمایا "وكم من قتيل لابليس قد احيوه" تو یہ وہی حقیقت ہے کہ کمال اتباع و تفانی فی السنت کی وجہ سے اُن پر معالجۂ نفوس و تداوی امم کی راہیں کھول دی جاتی ہیں، اور وہ صرف ایک ہی نسخۂ شفا کتاب و سنت ہاتھ میں لے کر تمام بیماران قلب و ناخوشاں روح کو دعوت شفا دیتے ہیں۔ یہی سر ہے کہ منجملہ اسماء و صفات قرآنیہ کے ایک اسم وصفی "الشفاء" بھی قرار پایا کہ دل اور یقین کے سارے دکھوں کے لئے بجز اس کے اور کسی میں شفا طمانیت نہیں۔ سب خود مبتلاء مرض ہیں: قل هو للذين آمنوا هدى وشفاء، والذين لا يؤمنون في آذانهم وقر وهو عليهم عمى، اولئك ينادون من مكان بعيد (حم سجدہ) وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين ولا يزيد الظالمين الا خسارا (اسرى) يا ايها الناس قد جاءتكم موعظة من ربكم وشفاء لما في الصدور (لعلها في التوبة او يونس) اور قلب و روح کی "طمانیت" یعنی عدم اضطراب و شک صرف اُسی کے پاس ہے: (الذين آمنوا وتطمئن قلوبهم بذكر الله - الا بذكر الله تطمئن القلوب) (رعد) اور یہی وہ کمال مرتبہ ایقانی ہے جو معبر بہ لفظ "سکینة" بھی ہوا: (هو الذي انزل السكينة في قلوب المؤمنين ليزدادوا ايمانا

مع ایمانہم (فتح) پس جب شفاء و وسیلۂ اطمینان و سکون قلب قرآن ہوا، اور قرآن کی عملی تفسیر وجود صاحب قرآن، تو اب شفاء بھی صرف اُنہی ہاتھوں سے مل سکتی ہے جن کے پاس اس نسخہ کا کامل علم و عمل ہو، اور وہ نہیں ہے مگر کتاب و سنت۔ یہی مقام امام ابن تیمیہ کا تھا، اور سلسلۃ الذہب تجدید و احیاء امت کے ہر حلقۂ دعوت کا ہوا، اور رہوگا:

بحكمة فعل الطبيب المجرب

شیخ سراج الدین ابو حفص البزار بغدادی اُس عہد کے مشاہیر اعلام و جامعین فقہ و حدیث میں سے ہیں۔ انہوں نے امام ابن تیمیہ کے حالات و مناقب میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے "الاعلام العلیہ فی مناقب الامام بن تیمیہ" رسالۂ مذکور میں لکھتے ہیں "حدثنی غیر واحد من العلماء الفضلاء، الذین خاضوا فی اقاویل المتکلمین لیسترجعوا منها الصواب، ان کلا منهم لم یزل حائرا فی تجاذب اقوال الاصولیین و معقولاتهم، وانه لم یستقر فی قلبه منها قول ولم یبین له من مضمونها حق، بل رآها کلها موقعة فی الحیرت والتضلیل، وانه کان خائفا علی نفسه من الوقوع بسببها فی التشکیک، حتیٰ من الله علیه بمطالعة مولفات هذا الامام، وما اورده من النقلیات والعقلیات فی هذ النظائر فما هو الا ان وقف علیها فراها موافقة للعقل السلیم، فانجلا عنه ماکان قد غشیته من اقوال المتکلمین" قریب قریب ایسی ہی شہادت حافظ جمال الدین عقیلی السرمری نے "الحمیة الاسلامیه فی الانتصار لمذهب بن تیمیه" میں دی ہے کہ اُس عہد کے ائمۂ کبار میں معدود اور مسند العصر و شیخ الزمان تھے، اور اتنا اور زیادہ کیا ہے: "ومن اراد اختبار صحة ما قلته فلیقف بعین الانصاف، العریة عن الحسد والانحراف، ان شاء علی مختصراته

(ای مختصرات ابن تیمیہ) فی ھذا الشان - کشرح الاصفہانیہ و نحوھا، وان شاء علی مطولاتہ - کتخلیص التلبیس من تاسیس التقدیس وکتاب العقل والنقل ومنہاج الاستقامۃ والاعتدال فانہ واللہ یظفر بالحق والبیان، ویستمسک باوضح برھان" الخ حاصل دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ ہم سے متعدد علماء و افاضل نے ذکر کیا کہ انہوں نے متکلمین کے اقوال و مقالات میں غور و خوض کیا تھا، تاکہ حق و صواب معلوم کریں۔ لیکن ان میں سے ہر شخص کا یہ حال ہوا کہ جس قدر اس میدان میں بڑھتا گیا، اتنی ہی زیادہ حیرانی و گمراہی سے اپنے تئیں نزدیک پایا۔ اور ارباب کلام و اصول کے اقوال و عقلیات میں سے کوئی بات بھی ایسی نظر نہ آئی جو بنیاد حق کو استوار کرتی اور دل کو اس پر اطمینان و قرار ملتا۔ حتیٰ کہ ان کی حالت سخت مخدوش ہوگئی۔ اور اپنے ایمان و یقین کی طرف سے خوف پیدا ہوگیا کہ کہیں تشکیک و انکار کی گمراہی میں ڈوب نہ جائیں۔ لیکن جب اللہ نے ان پر احسان کیا اور امام ابن تیمیہ کے مولفات کے مطالعہ کی توفیق بخشی تو ان کی ہر بات عقل سلیم کے مطابق پائی اور وہ تمام پردے شک و ریب کے ہٹ گئے۔ جو متکلمین کی قیل و قال نے ان کی بصیرت پر ڈال دیئے تھے۔ اگر کسی شخص کو اس بات کی صحت میں شک ہو تو امام موصوف کی مؤلفات آج بھی موجود ہیں۔ حسد و تعصب سے خالی ہو کر ان کا مطالعہ کرے۔ ہم کہتے ہیں کہ واللہ، وہ حق و یقین اور طمانیت قلب کو پالے گا، اور دلائل واضحہ و براہین قاطعہ کا عروۃ الوثقیٰ اس کے ہاتھوں میں ہوگا۔ انتہیٰ۔ خود امام موصوف کی زندگی ہی میں ان کی مصنفات کے اس خاصہ کی شہرت یہاں تک عالمگیر ہو چکی تھی۔ کہ مصر و شام و عراق کے کتب فروش آئمہ سلف کی کتابوں سے زیادہ ان کی مصنفات کے نسخے رکھتے تھے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کی مصنفات سیاح و نو آباد عربوں کے ذریعہ چین تک پہنچ چکی تھیں (۱) اُن کی

---

(۱) حافظ ابن رجب طبقات میں لکھتے ہیں "صلی علیہ الصلوٰۃ الغائب فی الذاہب

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱۵۔ بلاد الاسلام القریبۃ والبعیدہ۔ حتی فی الیمن والصین
واخبر المسافرون انہ نودی باقصی الصین للصلاۃ علیہ یوم جمعۃ
الصلاۃ علی ترجمان القرآن!" یعنی امام ابن تیمیہ نے جب وفات پائی تو اکثر بلاد اسلام
میں ان کے لئے نماز جنازہ غائب پڑھی گئی۔ حتیٰ کہ یمن اور چین میں۔ اور سیاحوں کی زبانی معلوم ہوا کہ
چین کے نہایت بعید گوشوں میں جمعہ کے دن منادی کرنے والے نے پکارا "ترجمان القرآن کے لئے نماز
جنازہ پڑھی جائے گی!" امام موصوف کی وفات سے ساٹھ ستر برس بعد ابن بطوطہ نے چین کا سفر کیا تھا۔
اس کو موجودہ شہر پیکن کے قریب قبائل عرب و تجار اہلِ اسلام کی ایک بہت بڑی نو آبادی ملی تھی جس
میں فقہاء و محدثین و اصحاب درس و تدریس موجود تھے۔ شیخ بدرالدین محدث نے ان کی دعوت کی
اس کے علاوہ عام دیار چین میں بھی ہر جگہ عرب اور نومسلم بتعداد کثیر موجود تھے، اور بلاد عربیہ
سے آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری تھا پس انہی لوگوں نے امام موصوف کی خبر وفات سن کر
نماز جنازہ پڑھی ہو گی۔ اور یہ جو لکھا ہے کہ "نودی باقصی الصین" تو اس سے مقصود اندرون
چین کی وہی نو آبادی ہو گی جو موجودہ شہر پیکن کے قریب ابن بطوطہ کو ملی تھی۔ اور پھر غور کرو کہ یہی وہ
خصائص مقام عزیمت دعوت اور وراثت مقام ورثنا الملک ذکر کئے ہیں جن میں اوروں کا
کوئی حصہ نہیں ہوتا اگرچہ بظاہر کتنا ہی پایہ بلند رکھتے ہوں۔ خود امام موصوف تو قید خانے کی کوٹھڑی
میں محبوس و مظلوم انتقال کرتے ہیں، لیکن ان کے لئے نماز جنازہ چین میں پڑھی جاتی ہے! اور ان
کی زندگی ہی میں ترجمان القرآن والسنت ہونے کی شہرت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ چین کی دیواروں سے جا ٹکراتی
ہے اور پکارنے والا پکارتا ہے "الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن!" حافظ برزالی لکھتے ہیں
کہ امام احمد بن حنبل کے بعد اور کسی کے جنازہ پر خلق اللہ کا اس قدر اجتماع نہیں ہوا اور نہ اتنی نمازیں
پڑھی گئیں جس قدر امام ابن تیمیہ کے جنازہ پر۔ حالانکہ ان کا جنازہ قید خانے سے نکلا۔ اور خلیفہ متوکل
امام احمد کا معتقد تھا، مگر سلطان عہد ابن تیمیہ کا مخالف۔ وکان یوما مشہودا۔ جب
جنازہ اٹھا اور انبوہ کا یہ حال ہوا کہ صرف عورتوں کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ اندازہ کی گئی
تو ایک شخص نے منارہ مسجد سے ندا دی: ھٰکذا یکون جنائز اھل السنۃ! سبحان اللہ!

وفات سے تقریباً پچاس ساٹھ برس بعد حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ میں نے شمار کیا تو مشہور مؤلفات ابن تیمیہ علاوہ تفسیر القرآن کے چار ہزار صفحوں سے زیادہ ہیں، اور باوجود علماء دولت اور سلاطین و حکام عہد کی شدید مخالفتوں کے آج کتب فروشوں کے چبوتروں پر سب سے زیادہ مانگ انہیں کی ہے۔ الشیخ ابن یوسف مرعی لکھتے ہیں کہ بلاد مصر و شام کے سیاح جب یمن و نجد کی طرف جاتے ہیں تو بہترین تحفہ جو اُن سے اہل علم طلب کرتے ہیں، امام موصوف کی مؤلفات ہیں! اُن کی زندگی ہی میں یہ حال تھا کہ بڑے بڑے اکابر و اعاظم علماء ائمہ سلف کی کتابیں فروخت کر ڈالتے تاکہ مؤلفات ابن تیمیہ خرید سکیں۔ قاضی القضات شام شیخ شہاب الدین ملکاوی الشافعی (جو فقیہ الشام کے لقب سے مشہور ہوئے اور امام ابو العباس ابن حجی کے شیوخ روایت میں سے ہیں، کما ذکرہ فی المعجم) انہوں نے امام نوادی کی شرح مسلم فروخت کر دی اور اس کی قیمت سے امام موصوف کی الرد علی النصاری (جواب چار جلدوں میں چھپ گئی ہے۔) خرید کی۔ ایک شخص نے اس پر اعتراض کیا کہ شرح مسلم دے کر ابن تیمیہ کی کتاب خریدتے ہو؟ تو کہا۔ میرے پاس شرح مذکور کے دو نسخے تھے۔ ایک فروخت کر دیا۔ لیکن اگر ایک ہی نسخہ ہوتا جب بھی مصنفات ابن تیمیہ کے لئے

بقیہ فوٹ صفحہ ۲۱۶۔ یہ ہے مقام وراثت تامہ نبوت کا! دمشق میں صدا اٹھی: هكذا يكون جنائز اهل السنة! اور جس میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے بے اختیار نکلوا دیا: الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن! یعنی ان کی تمام حیات علم و عمل کا خلاصہ قرآن و سنت تھا، تو بحکم حدیث صحاح "انتم شهداء الله في الارض" اللہ نے انسانوں کی زبانی جو کچھ کہلوایا، اسمیں بھی اور کوئی وصف نہ تھا۔ صرف اسی بات کی شہادت تھی کہ سنت کا اہل اور قرآن کا ترجمان و سفیر ہے! یہی چیز ہے کہ ان کے بڑے بڑے معاصرین کو سب کچھ ملا تھا مگر یہ نہیں ملی تھی، اور ہمیشہ صرف مجدد العصر ہی کے حصے میں آتی ہے۔ اگرچہ قید خانے میں اس نے زندگی بسر کی ہو یا سولی کے تختے پر ختم کی ہو، اور اگرچہ تمام دنیا والوں نے اس کی تحقیر و مخالفت کے لئے ایکا کر لیا ہو اور تمام روئے زمین کے بادشاہوں نے اس کی عظمت کو شکست دینے کے لئے اپنی کمریں باندھ لی ہوں، (ولقد احسن القائل:

در سفالین کاسۂ رنداں بخواری منگرید

کیں حریفاں خدمت جام جہاں بین کردہ اند

قدسیاں بے بہرہ اند از جرعۂ کاس الکرام

ایں تطاول بیں کہ باعشاق مسکیں کردہ اند!

بلا تامل فروخت کر دیتا۔ کیونکہ "ما فی شرح مسلم اعرفه، وما فی مولفاته انا محتاج الیه" (کذا نقل عنه فی الود الوافر)

میں کہتا ہوں یہ بات آج بھی ویسی ہی سچی اور کھری ہے جیسی اُس وقت تھی، اور سچائی کی پرکھ یہی ہے کہ نہ تو کسوٹیوں کا بدلا جانا اس کے لئے مضر ہے اور نہ زمانے کا بدلا جانا اس کے کھرے پن میں شک ڈال سکتا ہے۔ زمانے کی لمبائی خواہ کتنی ہی آگے کو بڑھ جائے مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سونا پیتل ہو جائے اور کوئی چمکیلا ٹکڑہ سونا کہلانے لگے، فالحق ثابت والزمان یدور و یتغیر۔ آج بھی جب کہ دانش فروشی کے نشۂ باطل سے ہر نو خیز قلم و کتابت سرگراں، اور بضاعت مزجات عقل و رائے کی نمود و نمائش سے ہر نو دولت تنگ ظرف مخمور بالاخوانی ہائے لاف و گزاف ہے، اور فتنۂ ادعاء مع الجہل و افتاء بغیر علم حتی ضلوا فاضلوا اور ظہور و بلوغ راس الشر ور و آخر الفتن "اذا وسد الامر الی غیر اہلہ فانتظر الساعة" سے عالم آشوبی ہائے وقت ہم عنان رستخیز قیامت کبریٰ و ہم دوش اشراط ساعت عظمیٰ ہے، اور ضلالة و بطالة لدو لا نسلم و اعجاب کل ذی رای برایہ ٹھیک ٹھیک اپنی اُس آخری حد تک پہنچ چکی ہے جس کی خبر اول روز ہی ایک حدیث قدسی میں دے دی گئی تھی: "ان امتک لایزالون یقولون ما کذا؟ ما کذا؟ حتیٰ یقولون ھذا اللہ خلق الخلق فمن خلق اللہ؟"(۱)

---

(۱) رواہ مسلم عن انس (رض) کیسی صاف صاف اور کھلی کھلی خبر تھی جو حضرت صادق مصدوق ارواحنا فداہ و صلوات اللہ علیہ نے پہلے ہی دن دے دی تھی؟ اگر اس لحاظ سے اعلام و انباء نبویہ پر نظر ڈالی جائے تو حق یہ ہے کہ اس تیرہ سو برس میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے اس کی کوئی بات بھی ایسی نہیں جو پہلے سے نہ بتلا دی گئی ہو، اور علماء صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا علم نہ ہو۔ حضرت حذیفہ یمانی کہ اعلم الصحابة بالفتن تھے، فرمایا کرتے "کان الناس یسئلون عن الخیر و کنت اسالہ عن الشر مخافة أن یدرکنی" رواہ البخاری عن ابی ادریس الخولانی۔ وھذا من کمال فقھه و دقة نظرہ رضی اللہ عنه فی اسرار الشریعة، لان الجہل بالشر لیس بر، بل تو کمع علمه و معرفة انما العلم والمعرفة۔ ولکن ھذا مقام دقیق العلم

غرضکہ آج بھی جبکہ بحکم بل قالوا مثل ما قال الاولون دورہ فتن وکرۂ فساد پھر اسی نقطہ پر واپس آگیا ہے جہاں سے ہمیشہ چل کر واپس آتا رہا ہے اور اس لئے تشکیکات و تدسیسات اور تلبیسات و تحریفات کے سارے فتنے بہ یک زمان وظرف جاگ اُٹھے ہیں، جس طالب حق و یقین کو ہر طرف سے یاس و قنوط کا جواب مل چکا ہو، اور جس کسی نے قطع طریق میں اپنے ہر رہنما کو خود گم کردۂ راہ و عقل باختۂ تکصص تشکیکات و توسوس شبہات پایا ہو، آئے اور آئمۂ حدیث و اثر کے معارف و براہین خالصۂ کتاب و سنت کا مطالعہ کرے۔ اور دیکھ لے کہ اقوال و حالات مندرجۂ صدر کی سچائی اب بھی کیسی کھری اور غیر مبدل ہے؟ اور سرچشمۂ یقین و حکمت حاملین علوم نبویہ ہیں، یا مقلدین و عبدۃ الطواغیت یونان و فرنگ؟ وما یستوی الاعمی والبصیر، ولا الظلمات ولا النور، ولا الظل ولا الحرور، وما یستوی الاحیاء ولا الاموات۔ ان اللہ یسمع من یشاء۔ وما انت بمسمع من فی القبور!

(فاطر اد الروم)

ستعلم لیلیٰ ای دین تداینت

وای غریم فی التقاضی غریمہا؟

باقی رہا معاملہ یورپ کے فلسفۂ حدیثہ، اور مذاہب حاضرۂ مادیئین لا ادریئین، اور عموم نتائج علوم تجربیۂ حالیہ برخلاف علوم سماویہ علی الظاہر، اور وہ سب کچھ جو اُن کی بنا پر سمجھا اور کہا جا رہا ہے، سو اول تو لوگوں کو معلوم نہیں کہ معلومات و ثمرات علوم مادیہ اور طرق و مذاہب فلسفیہ اور تقسیم و تحدید معقولات میں گو بے شمار چیزیں نئی بہم ہو گئی ہوں، مگر علوم

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱۸ - سوٰہ الا الراسخون فی العلم و عارفون باسرار الشریعۃ و حکمہ۔ اس حدیث میں فتنہ شبہات کی خبر دی گئی ہے جو نوعِ انسانی کے لیے ہمیشہ ہلاکت و خسران کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے شیطان کے پاس اس سے زیادہ کارگر اور بے خطا کوئی ہتھیار نہیں جیسا کہ حضرت عائشہ والی روایت میں ہے۔ فرمایا اس امت کے لوگ بھی برابر شکوک و شبہات نکالتے رہیں گے! اور لا حاصل چوں و چرا اور کیوں اور کیا سے باز نہ آئینگے یہانتک کہ خود اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں بھی رد و کد شروع کر دینگے، اور معاملہ جدال فی اللہ بغیر علم سے الحاد و انکار تک پہنچکر رہے گا۔ فصلی اللہ علی الصادق المصدوق الذی لا یخبر عن شئ الا و یاتی مثل فلق الصبح +

سماویہ و معلومات انسانیہ کی باہمی آویزش کا مقام اب بھی ٹھیک ٹھیک ویسا ہی (یعنی باعتبار کیفیت) اور اُتنا ہی (یعنی باعتبار کمیت) ہے؛ جیسا کہ ہمیشہ تھا۔ اُس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ آج قرآن و علوم انبیاء کرام کے خلاف کوئی ایک چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایسی نہیں کہی جاتی اور نہیں کہی جا سکتی، جو اصولاً پہلے نہیں کہی جا چکی ہو، بلکہ عین قرآن حکیم کے نزول اور اس کے ۲۳ سالہ زمانے میں نہ کہی گئی ہو۔ اور خود قرآن و سنت نے اس کا جواب نہ دے دیا ہو۔ اور اگر اس کے بعد کے عہد شیوع علوم دخیلۂ و عجمیہ و تراجم کتب مذاہب مندرسۂ یونانیہ و ایرانیہ و ملاحدۂ و مادیۂ عہد عباسیہ اور اُن کے اتباع اور ریزہ چینیوں کے اعتراضات و شبہات کے ذخائر و مقالات بھی ملا لیے جائیں، تو بلا خوف رد کہا جا سکتا ہے کہ نہ محض اصولاً، بلکہ فرعاً و انفراداً بھی آج تک کوئی نیا علمی شبہہ وحی و تنزیل اور قرآن و شریعت کے خلاف پیدا نہیں ہو سکا، اور کوئی بات ایسی نہیں کہی گئی جو آج کل کے مشککین و محجوبین لا ادریئین کے شجرۂ ضلالت و بطالت کے مورث اعلیٰ قرون ماضیہ میں نہ کہہ چکے ہوں۔ ولقد صدق اللہ فیما قال:

بل قالوا مثل ما قال الاولون۔ قالوا ءاذا متنا وکنا ترابا وعظاما، ءانا لمبعوثون؛ لقد وعدنا نحن وآباؤنا ھذا من قبل، ان ھذا الا اساطیر الاولین (مؤمنون) ایعدکم انکم اذا متم وکنتم ترابا وعظاما انکم مخرجون؟ ھیھات! ھیھات! لما توعدون! ان ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین (ایضاً) اور خود قرآن حکیم و حکمت نبوت نے اپنے ادلۂ نیرہ و حجج بالغہ سے ان کے تمام زخرف القول اور متاع غرور کا بالکل قلع و قمع نہ کر دیا ہو۔ بحدیکہ فاصبحوا فی دیارھم جاثمین کان لم یغنوا فیھا (ھود) اور جعلناھم احادیث (مومنون) اسی بنا پر تمام علماء تابعین، و ائمۂ اہل بیت طاہرین، و عموم اعلام سلف، و ائمۂ اہل سنت نے ہمیشہ ملاحدۂ و مشککین کے ہر طرح کے اعتراضات ایرادات کا محض ادلۂ کتاب و سنت کی حکمت قاھرہ سے

فاتحانہ مقابلہ کیا۔ اور ان کے تمام طلسمات وہم وظنون اور کارخانجات عقل وقیاس کی سحر نمائیوں اور شعبدہ سازیوں کو بحکم لا یفلح الساحر حیث اتی (طہ) صرف ایک ہی عصائے ثعبان آسائے کتاب وسنت سے فاذا ھی تلقف ما یأفکون (اعراف) کی طرح باطل اور درہم و برہم کر دیا۔ مع انھم لم یکونوا یعلمون شیئاً من المنطق والفلسفہ، ولا یعرفون الکلام وطرق الجدل، ومقدمات المصنوعۃ ومصطلحات القوم:

اذا جاء موسیٰ والقی العصا

فقد بطل السحر والساحر!

علی الخصوص جن ارباب نظر نے صرف حضرات آئمۂ اربعہ ہی کے مناظرات مسکت اور آئمۂ اہل بیت کرام علی الخصوص حضرت امام باقر وامام جعفر الصادق علیہما وعلیٰ اباھما واجدادھما الصلوٰۃ والسّلام کی احادیث مفصلۂ حکمیہ بمقابلۂ مشککین ملاحدہ و زنادقہ مطالعہ کی ہیں، جن کا گھر وحی ونبوت کا گھر، اور جن کا دروازہ باب مدینۂ علم، اور جن کے اطفال واحداث تک علم نبوت وفیضان عترۂ رسالت کی گودوں میں پرورش پانے والے تھے، وہ بھلا آج کل کے غلغلۂ الحاد کو کب خاطر میں لا سکتے ہیں، اور محض خیالات وظنون کا تخرص وتلعب اور پرستاران اوہام زید وعمر کی زبان کج مج وبیان لجلج کب ان کی جلالت علوم کی خسروی اور سلطان یقین کی قہرمانیت کو مرعوب ومسخر کر سکتا ہے؟ ان کے سامنے یہ تمام طلسمات عقلیہ خواب پریشان اور سراب اژدرنمایاں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے:

برو این دام بر مرغ دگر نہ

کہ عنقا را بلندست آشیانہ

غرضکہ موجودہ عہد کی مادیت ومعقولات کے مقابلے میں بھی صرف اصحاب حدیث و سنت وحاملین علوم خالصۂ وماثورۂ سلف ہی کی جماعت وہ طائفہ منصورہ ہے جس کے لئے کسی طرح کا بیم وہراس نہیں۔ ہر حال میں اور ہر مقابل وہر اسلحہ کے سامنے وہ مظفر ومنصور ہے، اور ہر معرکہ و میدان میں یہی جماعت مصداق اصلی " لا یضرھم من خالفھم حتی ا

یاتی امر اللہ وھو غالبون" کی ہے۔ کما قال ابن المدا ینی ھم اھل الحدیث۔ اور بحکم وان جندنا لھم الغالبون (صافات) اسی کا پرچم فتح واقبال ولواء عز وجلال جند الٰہی میں محسوب اور حزب اللہ المفلحون میں محشور و معدود ہے۔ یہاں بھی تم ہرگز ہرگز نہ پاؤگے کہ اصحاب علوم جدل وخلاف ورائے وقیاس، ومشغولین یونانیات، ومقلدین فلاسفہ و متکلمین، معرکۂ عقل ونقل وملحمۂ مادیہ وسماویہ میں کامیابی کا ایک قدم بھی آگے بڑھا سکیں، یا ایک دل کے شک اور ایک دماغ کے الحاد کو بھی دور کرسکیں۔ صرف اصحاب حدیث وسنت ہی کے ہاتھ آج تک ہر میدان رہا ہے، اور سبحان اللہ سعادت فیضان نبوت وبرکات انتساب کتاب و سنت کہ آج بھی فتح ونصرت اترے گی تو انہی کے عساکر حق وقشون ہدایت پر۔ اگرچہ حسب فرمان نبوی "قوم صالحون، قلیل فی ناس سوء کثیر" رواہ احمد والطبرانی مرفوعاً ان کی تعداد سب سے کم، اور بوجہ ظہور معنیٰ غربت ثانیہ ان کی جماعت نہ صرف مغلوب بلکہ بظاہر مفقود و کالمعدوم نظر آتی ہو۔ فھم اقلون عدداً واعظمون عند اللہ قدراً۔ پھر کہتا ہوں کہ یہ بات اگرچہ تمہارے کانوں کے لئے بالکل نئی اور بہت ہی تعجب انگیز ہوگی مگر یاد رکھو کہ تمام طوائف متکلمین فلسفۂ قدیمہ کے مقابلے میں بھی ناکام رہے تھے، اور آج نام نہاد فلسفۂ جدیدہ کے مقابلے میں بھی اسی طرح ناکام رہینگے۔ اُس وقت بھی صرف اصحاب حدیث وطریق سلف ہی کامیاب ومنصور ہوتے تھے۔ اور آج بھی اس میدان میں بازی انہی کے ہاتھ ہے۔ فقہاء ومتکلمین میں سے آج تک کوئی اس میدان کا مرد نہیں اٹھا:

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوے تو یہی رندان قدح خوار رہے

البتہ اس حقیقت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جن کو چند کتب درسیہ معقولات وکلام وروایت کشی صحائف قیل وقال کے حجرۂ خمول سے باہر نکل کر فضاء حکمت قرآن وسنت کی سیر کرنے اور دواوین وصحف عرفاء طریق وحقیقت شناسان کار کے تدبر وتفکر کی توفیق ملی ہے اور بحکم والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (عنکبوت) حق تعالےٰ نے ان کے قلوب کو

انوارِ کتاب وسنت کے اکتساب واستنارت کے لئے مجلیٰ ومزکیٰ کر دیا ہے، اور اُن کا آئینۂ استعداد زنگ وکثافت جہل وحجاب: وظلمت محبت زخارف دنیوی ورذائل نفسانیہ مانعۂ وصول الی الحق سے بکلی پاک وصاف ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس مقام پر کیا موقوف ؛ علم وحقیقت کے کسی گوشے میں بھی امید فہم وتوقع قبول نہیں:

خلق اللہ للحروب رجالاً

ورجالاً لقصعۃ وثرید!

بلکہ حق یہ ہے کہ اس بارے میں ان سے خطاب یکسر ضیاع وقت ویک قلم اتلافِ نفائس وجواہر ہے:

مئے مغانہ کہ از درد وشور وشر صافست

بہ محتسب نہ دہی قطرۂ کہ اسراف ست

۱۹۱۱ء میں مولانا شبلی مرحوم وقف علی الاولاد کے لئے علماء کا ایک وفد لے جا رہے تھے، اور اسی غرض سے کلکتہ میں مقیم تھے۔ علماء وفد میں سے ایک بزرگ کہ درس ونظر معقولات کے لحاظ سے آج کل مخصوص امتیازی درجہ رکھتے ہیں، ایک دن اُسی لب ولہجہ میں جو ان بزرگوں کے لئے مخصوص ہے، آج کل کے انگریزی خواں تعلیم یافتہ اشخاص کی مذہب سے بے خبری اور الحاد وبے قیدی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا یہ شکایت کم از کم آپ لوگوں کی زبانی تو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ میرے خیال میں تو آپ اور وہ، دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ اور ایک ہی مشرب ومسلک کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی قدامت واولیت کی رعایت کرتے ہوئے اُن کو آپ کا چھوٹا بھائی کہا جائے۔ آپ یونانیوں کے حلقہ بگوش، وہ یورپ کے پرستار۔ قرآن وسنت سے آپ بھی دور ومہجور، وہ بھی بے خبر ونفور:

محتسب داند کہ حافظ می خورد

واصف ملک سلیماں نیز ہم!

بلکہ سچ پوچھئے تو ایک لحاظ سے آپ پر من وجہ وہ فضیلت رکھتے ہیں۔ آپ کے آئمۂ

پیشوا فلاسفۂ یونان ہیں جن کا قدم وہمیات ضالہ سے آگے نہ بڑھا۔ اُن کے معبود ان علم فلاسفۂ یورپ ہیں جنھوں نے بہر حال دنیا کے آگے تجربۂ و استقراء اور کشفیات عملیہ کا دروازہ کھولا۔ اُن میں کا ایک لڑکا جو اسکول کی پانچویں کلاس میں سائنس اور طبعیات کی ریڈر پڑھتا ہے، شاید آپ کے مدارس کے اُن منتہیوں سے زیادہ صحیح راہ پر ہے جو صدرا اور شمس بازغہ سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ صاحبوں میں مترجمین و ناقلین عرب تھے جنھوں نے یونانیات کو عربی کا جامہ پہنا کر مقدس بنا دیا۔ اور معتزلہ و اخوان الصفا وغیرھم پیدا ہوگئے جنھوں نے مصطلحات و عبائر یونانیات کو علوم دینیہ میں امتزاج و خلط کیمیائی کے ساتھ ملا دیا۔ لیکن ان بیچاروں کو یہ التفاتات اب تک نصیب نہیں ہوئے۔ معاملہ سرسید مرحوم اور ان کے خوشہ چینان غیر معترف و مقلدین غیر مقر یا مجتہدین فی المذہب سے آگے نہیں بڑھا ہے اگر اُن میں بھی کوئی اس ڈھب کا آدمی نکل آتا تو آپ دیکھتے کہ اُن کے مباحث خاصہ آپ کے امور عامہ سے تو ضرور بازی لے جاتے:

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز باز خواست

نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما!

کم سے کم آپ حضرات کو تو اس معاملہ میں خاموش ہی رہنا چاہئے:

محتسب چوں می خورد معذور دارد مست را!

اور یہ جو کچھ کہا تو معلوم رہے کہ میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جنھوں نے معقولات قدیمہ کے یک قلم بیکار ہونے کا ایک شور مچا رکھا ہے، اور اصلاح نصاب تعلیم کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ اس تمام دفتر کو بالکل "غرق مئے ناب" کر دیا جائے، کیونکہ اس عہد کے ہر کلمۂ اصلاح کی طرح اس کلمہ میں بھی سچ کے ساتھ جھوٹ مل گیا ہے اور اس بارے میں میرا خیال دوسرا ہے پس یہ جو کچھ کہا گیا وہ کچھ تو اس بنا پر تھا کہ ہر گروہ کے سامنے اسی کے نقائص کا پیش کرنا ضروری ہے، اور پھر اُس غلوء و اغراق اور انہماک و استغراق کی بنا پر کہ معقولات قدیمہ جو کبھی آلات کا حکم رکھتے تھے، اب مقصود بالذات ہو گئے ہیں۔

فصل

ساٹھ ستر برس سے لوگوں نے شور مچا رکھا ہے کہ علوم جدیدہ! علوم جدیدہ! اور اس لئے علم کلام جدیدہ! علم کلام جدیدہ! یعنی جس طرح الحاد جلی کی صورت بدلی ہے، اسی طرح الحاد خفی کا چولا بھی بدلا جائے، اور جب ایک فتنہ واپس آگیا ہے تو دوسرے فتنوں کو بھی کیوں نہ جگا دیا جائے، حالانکہ اس بارے میں قدیم و جدید کی تفریق کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اور ایسی غلطی جو صدہا غلطیوں کو اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ سائنس مذہب سے برسر پیکار ہے یا فلسفہ؟ اور قطع نظر اس کے کہ موجودہ عہد کے مذاہب فلسفہ پر جدید و حدیث کا اطلاق اصلاً کہاں تک درست ہے؛ اگر "علوم جدیدہ" کی ترکیب کو علی الاطلاق صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے، جب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شریعتِ الٰہی کے حفظ و دفاع کے پچھلے ہتھیار بیکار ہو گئے۔ سب سے پہلی غلطی اس بارے میں یہ ہوئی کہ علوم سماویہ کے برخلاف شکوک و شبہات کا اصل مبدأ لوگوں نے معلوم نہیں کیا۔ اور نہ کبھی اس کی کوشش کی کہ علوم و دعوۃ انبیاء کے خلاف انسانی شکوک و شبہات و اعتراضات کو جو مختلف زمانوں میں ظاہر ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں، اصولاً یکجا کریں۔ اور بہ طریق قواعد و جوامع منضبط کر کے دیکھیں کہ اس وادی میں کوئی نیا قدم بھی اٹھتا نظر آتا ہے، یا وہی انا علی آثارھم مقتدون کا سا معاملہ ہے۔ لیکن ایسا کرتا تو کون کرتا؟ ذریعہ اس کا صرف ایک ہی ہے یعنی قرآن و حدیث پر تدبر و تفکر، اور وہی صدیوں سے مہجور ع!

ہمیں ورق کہ سیاہ گشتہ مدعا اینجاست

اصل یہ ہے کہ انسان کے عارضۂ شک و شبہات اور موت انکار وجود کا اصلی سرچشمہ خود اس کی ضلالت فکر و نظر کی ایک طبیعت ثانیہ ہے جو بحکم وما کان الناس الا امۃ واحدۃ، فاختلفوا (یونس) اور کان الناس امۃ واحدۃ، فبعث

(بقرہ)

اللہ النبیین مبشرین ومنذرین۔الخ (بقرہ) اور وعلم آدم الاسماء کلہا

انسان کی ہدایت اصلی واولی کے بعد ہی اسباب مذکورۂ قرآن وسنت کی بنا پر پیدا ہوگئی تھی، اور جس طرح بحکم ان الدین عند اللہ الاسلام، وما اختلف الذین اوتو الکتٰب الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم (عمران) اور شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ الخ ظہور ہدایت ودعوۃ الی الیقین میں حقیقت کا ظہور یکساں رہا ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس طبیعت ثانیہ وعارضہ کا ظہور بھی ایک ہی صورت، ایک ہی رنگ روپ ایک ہی لب ولہجہ بلکہ ایک ہی طرح کی آوازوں اور بولیوں میں ہمیشہ ہوتا رہا۔ اسی لئے قرآن حکیم نے جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے بل قالوا مثل ما قال الاولون (مومنون) اور تشابہت قلوبھم، الذین من قبلھم (حشر) اور جا بجا سلسلہ ہدایت اور سلسلۂ انکار وضلالت دونوں کو ایک ساتھ بیان کرکے واضح کیا کہ جس طرح پہلے سلسلے کی ہر کڑی ہمیشہ ویسی ہی رہی جیسی باقی کڑیاں تھیں، اسی طرح دوسرے سلسلے کی کڑیاں بھی ہمیشہ یکساں و ہم آہنگ رہیں۔ اگر ہمیشہ ملائکہ حقیقت ویقین کا پیام ایک ہی تھا تو ابلیس شک وانکار کا جواب بھی ایک ہی رہا: کلما جاء امۃ رسولھا کذبوہ (مومنون) کل کذب الرسل فحق وعید (ق) ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون (یٰسین) اسی لئے منکرین حق ہمیشہ یہی کہتے رہے ان ھذا الا اساطیر الاولین (انفال) اور داعیان حق کی صدا بھی برابر یہی رہی ء سمیتموھا انتم وآباؤکم (یوسف) اور (صٰفٰت) انھم الفوا آباءھم ضالین۔ فھم علیٰ آثارھم یھرعون۔ ولقد ضل قبلھم اکثر الاولین یعنی شبہات وانکار کی گمراہی کا ظہور خارج سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک عارضۂ طبیعت ہے منجملہ عوارض اُخریٰ ونسی کے، اور چونکہ طبیعت کی استعداد اکتساب عوارض میں یکساں اور غیر مبدل ہے اس لئے نفس عارضہ بھی اپنی کیفیت میں یکساں وغیر مبدل، اگرچہ کمیت میں بڑھتا گھٹتا جاری رہتا ہے۔

جسمانی بیماریوں کی مثال سامنے لاؤ تو مطلب زیادہ صاف ہوجائے گا۔ کیونکہ

سنت اللہ کارخانۂ ہستی کی ہر شاخ کے لئے ایک ہی ہے۔ جس وقت سے انسان اور انسان کی اصلی و فطری تندرستی موجود ہے، اس کے بعد ہی سے عارضی بیماری کا بھی وجود شروع ہوگیا ہے۔ اور معلوم ہے کہ بیماریوں کے اقسام و جزئیات میں برابر ترقی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ بعض بیماریوں کی نسبت انسان نے فیصلہ کیا کہ پہلے نہ تھیں۔ لیکن چونکہ یہ عارضۂ طبیعت ہے، اور سبب اس کا اکتساب و انفعال طبیعت، و زوال اعتدال اخلاط، و ضعف قوت دافعۂ داخلیہ وغیر ذالک، اس لئے ایسا تو کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے کہ زمانے کے بدلنے سے بیماری بھی بدل گئی ہو۔ اور مثلاً حمیٰ دموی یا صفراوی بقراط کے عہد میں جس طرح کا ہوا کرتا تھا، بعد کے زمانے میں اس طرح کا نہ ہوتا ہو؛ بخار جب کبھی آئے گا، ویسا ہی ہوگا جیسا ہمیشہ بیماران بخار کو ہوا کرتا ہے۔ خواہ بقراط کا زمانہ ہو، خواہ شیخ کا اور خواہ ہمارے عہد کے حاذق الملک کا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر علم طب کی ساری تحقیقات بے کار ہو جائے اور ہر نئے برس کے لئے نئے طب کی ضرورت ہو۔ تمام اطبأ مشرق نے اتفاق کیا کہ مرض سفلس پہلے یہاں نہ تھا۔ یورپ سے آیا۔ اسی لئے عربی میں اس کا نام "داءالفرنج" اور فارسی و ترکی میں "فرنگی" مشہور ہوا۔ اور خود یورپ بھی کہتا ہے کہ ہمارے یہاں نہ تھا۔ بعض جزائر سے آیا۔ معہذا اس کے اسباب و طرق تولید اور علاج میں کوئی بھی نئی بات پیش نہ آئی۔ وہی بات ہوئی جو پہلے سے قانون و اسباب میں پڑھی پڑھائی جا رہی ہے۔ سوداء احتراقی اور اس کی سمیت محرقہ، اور اسی لئے تعدیہ اور التہاب اس کا خاصہ۔ علاج بھی وہی جو پہلے سے اس طرح کے مواد کا کیا جا رہا ہے۔ یعنی تنقیۂ داخل اور قواطع سمیات و تصفیۂ خون، اور بس۔ جراثیم خوردبینی **Microscopic Examination of Germs.** کا نظریہ (جواب فی الحقیقت مشاہدۂ و استقراء تک پہنچ چکا ہے)، اطبأ مشرق کے لئے گو نیا سمجھا جائے لیکن عرفاء مشرق کے لئے نیا نہیں ہے۔ اور پھر جو کچھ بھی ہو، اس سے نفس مرض و علاج پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ طرق و وسائل پر پڑے تو پڑے۔ اسی طرح

اگر چیچک کی طرح تمام امراض خبیثہ وسمیہ کے لئے بھی ٹیکہ کی ایجاد میں کامیابی ہو جائے (جس کا تجربہ شاید امریکہ میں قریب تکمیل ہے) جب بھی اصول وقواعد فن پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

اور یہاں یہ نقطہ بھی پیش نظر رہے کہ انسانی معلومات کے عدم سے حقیقت معدوم نہیں ہو جا سکتی۔ اگر کسی دوا کا خاصہ ابو بکر رازی وابن بیطار سے پہلے لوگوں کو معلوم نہ تھا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیا میں اس سے پہلے وہ دوا موجود بھی نہ تھی۔ کونین ہمیشہ سے موجود، اور جب سے موجود، اسی وقت سے دافع تپ۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا خاصہ تمہیں کل معلوم ہوا۔

بہر حال یہی مثال بعینہ امراض معنویہ از قبیل شکوک وشبہات وانکار وجحود اور ان کے علاج کی بھی ہے۔ شک وشبہ وانکار کا مرض ایک ہی ہے اور اس کا علاج بھی ایک ہی ہے، ہمیشہ سے یکساں مرض اور ہمیشہ سے یکساں علاج۔ یہ بات نہیں ہے کہ معلومات ومکشوفات کے بدلنے سے وہ بھی بدل جائے۔ علوم قدیمہ وجدیدہ کی تقسیم ہی اس بارے میں یکسر غیر موثر ہے بلا شبہ انسان کی سمجھ کی بے راہی اور نظر کی کجی اور عقل کی خاصی معلومات ومکشوفات عقلیہ سے بھی فی زعمہ بدلیتی ہے، اور اسی کے مطابق شک وشبہ کا رنگ ونقشہ درست کرتی ہے، لیکن نفس شبہات کی بنیاد علوم وفلسفہ نہیں ہیں کہ ان کی مزید توسیع وانشعاب سے شبہات کے اصول ومبانی بھی بدل جائیں۔ علوم سماویہ کے خلاف آج کوئی اعتراض ایسا نہیں کیا جاتا جو پہلے نہ کیا گیا ہو، اور قرآن وسنت وحاملین علوم نبویہ نے ان کی ضلالت فہم ونظر کا پردہ چاک نہ کر دیا ہو پس اگر آج نام نہاد علوم جدیدہ کی بنا پر شبہات وایرادات کا ہجوم ہے تو علم کلام جدید! علم کلام جدید! کا شور وغوغا نہیں مچانا چاہیئے بلکہ قرآن وسنت اور صرف قرآن وسنت کے علوم مہجورہ ومتروکہ کی بازگشت اور تجدید واحیائ کے لئے ماتم کرنا چاہیئے۔ پھر جو لوگ آج علم کلام جدید کی جستجو وسراغ میں جاں بلب ہو رہے ہیں، ان کو سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیئے کہ علوم قدیمہ اور شکوک وشبہات

ماضیہ ہی کے مقابلے میں علم کلام و متکلمین نے کون سی فتح پالی ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر آج جدید علم کلام دنیا کے تمام حصوں وجنود مادیہ کو فتح کر لے گا؟ علم کلام قدیم کے سب سے بڑے علم بردار معتزلہ تھے اور ان کے بعد متاخرین اشاعرہ، لیکن خود ان دونوں جماعتوں نے بجز اس کے اور کیا کیا کہ دفع شبہات کی سعی میں خود اپنے وجود ہی کو دعوت تشکیک وشبہات بنا دیا، اور آخر میں دنیا سے گئے تو یہ کہتے ہوئے گئے "لقد خضت البحر الخضم، وخليت اهل الاسلام وعلومهم، ودخلت فی الذی نهونی عنه، والان فان لم يتدارکنی ربی برحمته فالويل لابن الجوينی۔ وها انا ذا اموت علی عقيدة امی" یعنی ساری کاوشیں کر کے آخر میں یہ حال ہوا کہ اپنی ماں کے عقیدہ پر دنیا کو چھوڑ رہا ہوں! کسی نے کہا "انا اموت علی عقيدة عجائز نيشا بور!" یعنی تمام زندگی کیوں اور کیا میں بسر ہوئی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر نیشاپور کی بڑھیا عورتوں کے عقیدہ پر دنیا سے جا رہا ہوں! کسی نے ساری عمر بادیۂ کلام میں بسر کر کے آخر کہا تو یہ کہا: "ما عرفت مما حصلت شيئاً سوى ان الممكن مفتقر الى المرجح" اور کسی نے علم کلام میں پچاس کتابیں تصنیف کر کے مرتے وقت کہا: "اموت وما عرفت شيئاً"

سب سے زیادہ اور فیصلہ کن عبرت حضرت امام غزالی کے حالات میں ہے۔ مذہب کلام و تاویل میں ان کی آسمان پیمائیوں کا جو حال رہا ہے معلوم ہے۔ لیکن بالآخر نتیجہ کیا نکلا؟ احیا ہی کو دیکھ لو۔ ان کے دل نشیں الفاظ میری زبان پر چڑھ گئے ہیں: "وهذا اذا سمعته من محدث او حشوی ربما خطر ببالك ان الناس اعداء ما جهلوا، فاسمع هذا ممن خبر الكلام ثم قلاه بعد حقيقة الخبرة والتغلغل فيه الى منتهى درجة المتكلمين وجاوز ذلك الى التعمق فی علوم اخرى، وتحقق ان الطريق الى حقائق المعرفة من هذا الوجه مسدود" یعنی اگر یہ بات کوئی محدث تم سے کہتا تو تم کہہ دیتے کہ اس ظاہر پرست اور حدثنا واخبرنا میں گم رہنے والے کو علم کلام و فلسفہ کے دقائق کیا معلوم؟ پس یہ بات تم سے وہ شخص کہتا ہے جس نے علم کلام اور نیز تمام علوم عقلیہ میں علم و نظر کا وہ

درجہ حاصل کیا جو متکلمین کا منتہا درجہ ہو سکتا ہے، تاہم آخر میں یہی معلوم ہوا کہ حقیقت تک پہنچنے کے لئے یہ راہ بالکل بند ہے۔ حضرت امام رازی کی تفسیر اور اساس التقدیس اور مطالب عالیہ پڑھ چکے ہو۔ مگر معلوم ہے کہ ان کی آخری تصنیف میں جو اقسام ذات کی نسبت ہے ان کے اعماق قلب سے کیا صدا نکلی؟ لقد تاملت الطرق الکلامیۃ والمناہج الفلسفیۃ فما رأیتہا تشفی علیلاً ولا تروی غلیلاً، ورایت اقرب الطرق طریق القرآن۔ اقرأ فی الاثبات الرحمٰن علی العرش استویٰ وفی النفی لیس کمثلہ شیٔ ومن جرب مثل تجربتی عرف مثل معرفتی" کذا نقلہ ملا علی القاری فی شرح الفقہ الاکبر۔ یعنی میں نے علم کلام وفلسفہ کے تمام طریقوں کو خوب دیکھا بھالا لیکن آخر میں یہی ثابت ہوا کہ نہ تو یقین کے دکھ کا بیمار علاج ہے۔ اور نہ شک کے اضطراب کے لئے چین۔ بہتر واقرب طریقہ وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ اور جس شخص نے میری طرح اس معاملہ کا تجربہ کیا ہوگا وہ میری طرح سمجھ لے گا۔ یا سبحان اللہ! یہ اُنہی امام رازی کا آخری اعتراف ہے جن کی کتاب اساس التقدیس ہم پڑھ چکے ہیں! بالآخر یہی کہنا پڑا کہ اقرأ فی الاثبات الرحمٰن علی العرش استویٰ والیہ یصعد الکلم الطیب":

فی المحبۃ ما ادق بیانہ
متحیر فیہ امام الرازیٔ

فصل

حقیقت یہ ہے کہ شک و شبہ کا فتنہ خود اس تیزی سے نہیں آتا جس قدر جلد شک و شبہ کے دور کرنے والے اسے بلا لیتے ہیں۔ ہمیشہ مدعیان تطبیق نقل و عقل و دفع تشبہات و شکوک نے ایسا ہی کیا ہے۔ علوم قدیمہ کی اشاعت کے زمانے میں ایک نہایت ہی محدود جماعت نے یونانی فلسفہ وغیرہ کو پڑھا تھا اور متوسلین دربار خلفاء و مشغولین تراجم و نظر کے علاوہ عام امت اس کے اثرات سے محفوظ تھی۔ سب سے پہلے خود معتزلہ اس کے تیروں سے زخمی ہوئے۔ پھر خود بخود یہ ظاہر کر کے کہ تمام امت زخمی ہو گئی ہے اور اس کا علاج علما قرآن و سنت نہیں کر سکتے۔ اپنے آپ کو خود ساختہ مصلح و معالج قرار دیا، اور جس بیماری کا ابھی وجود ہی نہ تھا، خود کوشش کر کے اور بلاوے بھیج کر بالآخر اُسے بلا ہی لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے رد و کد اور بحث و نظر نے خواہ مخواہ ہزاروں انسانوں کے عقائد متزلزل کر دیئے۔ عامہ متکلمین و حکما کا بھی یہی حال رہا۔ ہمارے زمانے میں بھی بعینہٖ یہی صورت پیش آئی ہے جس پر آج تک کسی نے غور نہیں کیا۔ ابھی نہ تو مسلمانوں میں نئے علوم کی بنا پر کوئی نیا چرچا پھیلا تھا، نہ شک و شبہات پیدا ہوئے تھے۔ محض چند لوگ تھے جنہوں نے نہ تو یورپ کی کوئی زبان پڑھی تھی نہ علوم مادیہ سے واقفیت حاصل کی تھی۔ صرف سنی سنائی باتوں اور مقلدانہ جوش عقیدت و حسن ظن بہ یورپ (و جمیع ماینسب الیہ) سے اپنے جی میں شکوک و شبہات پیدا کیئے، اور پھر خود ہی پکارنا شروع کر دیا کہ علوم جدیدہ نے اسلام کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے سیلاب نے مسلمانوں کے سیزدہ صد سالہ عقاید زیر و زبر کر دیئے۔ اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ اسلامی عقائد میں از سرِ نو ترمیم و تنسیخ کی جائے۔ پچھلے کیل پرزے نکال کر ایک نیا کارخانہ ڈھالا جائے

خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را

نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک وشبہات خود تو ابھی نہیں آئے تھے، مگران لوگوں نے بلائے بھیج کر بلا ہی لیا۔ اور یہ کہہ کہہ کر کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ سچ مچ پوری نئی نسل کو شکوک وشبہات میں غرق کر دیا کیا کوئی شخص آج ثابت کر سکتا ہے کہ جس زمانے میں سر سید احمد خاں مرحوم نے پہلے پہل یہ صدائیں بلند کی ہیں اور اول اول تہذیب الاخلاق نکالا ہے تو اس وقت واقعی کتنے مسلمان تھے جو انگریزی پڑھ کر دہریئے ہو گئے تھے اور ان کی گمراہی نے مرحوم کو مجبور کیا تھا کہ جدید اجتہاد شروع کر دیں؟ یا انہوں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر منتیں کی تھیں کہ ہماری خاطر تاویل الجاھلین وتحریف الغالین و انتحال المبطلین" کا فتنہ تازہ کر دیجئے؟ مولانا حالی مرحوم نے حیات جاوید میں بڑی سعی وکوشش سے صرف ایک مثال مولوی سید ممتاز علی صاحب کی پیش کی ہے کہ انہوں نے سید صاحب کو اپنے شکوک وشبہات لکھے تھے اور پھر مطمئن ہو گئے۔ لیکن اول تو یہ واقعہ بہت بعد کا ہے۔ یعنی جب کالج قائم ہو چکا ہے اور تہذیب الاخلاق بار اول بند ہو چکا ہے۔ اور پھر جو کچھ بھی ہو، اس معاملہ کا تعلق نفسِ مذہب والحاد سے نہیں تھا بلکہ (جیسا خود مولوی صاحب موصوف نے مجھ سے کہا) اسلام اور مسیحیت سے تھا۔ یعنی مولوی صاحب کو اوائل طالب العلمی میں مشنریوں کی تحریرات پڑھتے پڑھتے عیسائیہ کی طرف میلان اور اسلام کی طرف سے بے رغبتی ہو گئی تھی۔ فاین ھذا من ذالک؟

غرضیکہ یہی نتائج اس راہ کے ہیں جن کی بنا پر شارع نے بار بار کثرت سوال و استفسار کو روکا تھا، اور اس کو منجملہ ضلالات یہود کے قرار دیا تھا۔ اور یہی معنی ہیں "ھلک المتنطعون" ای المتعمقون" کے۔ اور یہی بھید ہے اس قول حضرت عمرؓ میں کہ کونوا علی دین الاعراب اور اسی لئے جدال فی الدین کو روکا گیا۔ اور تمام سلف وائمہ اہل سنت نے اتفاق کیا۔ نزاع وتعمق فی الدین کی مضرت ومنع پر۔ حتیٰ کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی نسبت منقول ہے "یکرہ الجدال علی سبیل الحق" وہ اس بات کو بھی مکروہ رکھتے

تھے کہ حق کے لئے طریق جدل و نزاع اختیار کیا جائے۔ اور جس شخص نے القران غیر مخلوق کہا اس کی نسبت بھی مثل قائل خلق قرآن کے فرمایا لاتصلوا خلفه لانه ينازع والمنازعة بدعة" اس کے پیچھے نماز نہ پڑھو کیونکہ وہ دین میں نزاع کرتا ہے اور منازعت بدعت ہے کذا فی شرح الفقه الاکبر نقلا عن تلخیص الزاهدی وایضاً ذکرہ صاحب مفتاح السعادہ اور اسی شرح فقہ اکبر کے دیباچہ میں حضرت قاضی ابو یوسف (رض) کا قول نقل کیا ہے "لا يجوز الصلوة خلف المتكلم وان تكلم بحق لانه مبتدع" متکلم کے پیچھے نماز جائز نہیں اگرچہ وہ حق کے اثبات میں رد و کد کرتا ہو۔ اور اسی لئے تمام ائمہ سلف و اہل سنت نے اتفاق کیا علم کلام کے پڑھنے پڑھانے کی کراہیت پر اور علی الخصوص ائمہ اربعہ کے اقوال تو اس بارے میں معلوم و مشہور ہیں۔ اور یہی علت ہے کہ تمام صحابہ و تابعین و ائمہ سلف نے اس پر اتفاق کیا کہ وقوع حوادث سے پہلے فرضی و تخمینی صورتیں مسائل و شبہات کی گھڑ کر سوال و جواب کرنا، اور اس کو ذہانت و فقاہت کا ذریعہ سمجھنا بدعت ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ فرضی صورتیں کل کو واقعی ہو کر رہیں گی۔ یا اقلاً ہزاروں دلوں کو جو ایمان راسخ اور قلب مطمئن رکھتے ہیں، تشویش و اضطراب میں ڈال دیں گی۔ یہی معنی ہیں دارمی کی حدیث وہب بن عمر و جمحی کے، کہ فرمایا۔ بلا نازل ہونے سے پہلے جلدی نہ کرو۔ امام دارمی کی کمال فقاہت فی الدین و دقت نظر کا ثبوت ان ابواب سے ملتا ہے جو مسند میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے بعد ہی ترتیب دئے ہیں اور ابواب صلوٰۃ و احکام سے پہلے ان کو لائے ہیں۔ یعنی ان حقائق کا علم اہل علم و افتا کے لئے سب سے مقدم ہے۔ ان ابواب میں سلف صالح کا طریقہ واضح کیا ہے کہ کس طرح قبل از وقوع شبہات و سوالات کو مکروہ جانتے تھے اور اسی لئے فتویٰ دینے سے پرہیز کرتے اور رائے و جدل کی ساری راہوں سے بچتے رہتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قاعدہ تھا۔ جب کبھی کسی مسئلہ کی نسبت سوال کیا جاتا تو دریافت فرماتے۔ کیا یہ صورت پیش آئی ہے؟ اگر سائل کہتا ہاں تو جواب دیتے۔ نہیں تو خاموش رہتے۔ حضرت شیخ اکبر نے فتوحات میں

کیا خوب فرمایا ہے "فان فیہ تلمیح الی ان من افتی فی الحوادث القضیہ قبل وقوعها

فلا دین لہ ولا علم" اور یہی وجہ ہے کہ بصورت صحت واقعہ مناظرہ درمیان حضرت امام ابو حنیفہ و

قتادہ مصری رضی اللہ عنہما منقولہ عقود الجمان وخطیب) جب حضرت امام نے زوج

مفقود الخبر کے متعلق سوال کیا تو قتادہ نے پوچھا۔ کیا یہ صورت پیش آئی ہے ؟ اگر نہیں آئی

ہے تو فرضی صورتوں میں سوال وجواب بدعت ہے۔ اسی طرح مباحثہ حضرت قاضی

ابو یوسف و قاضی یحیٰی بن سعید انصاری نسبت غلام مشترک میں قاضی یحیٰی نے فرضی

صورتوں میں بحث و تعمق سے انکار کر دیا۔ ان بزرگوں کا انکار ان کے کمال علم وحکمت

و فہم اسرار شریعت، و غوامض ہدایت امم و اجتماع کا نتیجہ تھا۔ ظاہر پرستانہ بے خبری و

بے عقلی یا بالفاظ صریح بے وقوفی نہ تھی جیسا کہ بہت سے لوگوں نے سمجھا، اور جیسا کہ

مولانا شبلی نعمانی رحمتہ اللہ علیہ نے سیرۃ النعمان میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ

وہ لوگ تھے جنہوں نے "ابرھا قلوبا واعمقہا علما" والی جماعت سے فیضان علم وعمل حاصل کیا

تھا۔ اگر یہ لوگ بے وقوف تھے تو تاریخ اسلام میں کبھی علماء نہیں ہوئے۔

بہت سے لوگوں نے اپنی ذہنی بلند پروازیاں اور نکتہ آفرینیاں دکھلانے کے لیے بیشمار

ایسی فرضی صورتیں مسائل حلت وحرمت اور وجوب وعدم وجوب کی گڑھ لیں۔ جو صدیوں

میں بھی کبھی نوع بشر کو پیش نہیں آئیں، اور جن میں سے بعض طبعاً ایسی مکروہ صورتیں ہیں

کہ طبیعت ان کے تصور سے ابا کرتی ہے اور اخلاق کا سر شرم وحیا سے جھک جاتا

ہے۔ اس بدعت کا نتیجہ صرف یہی نکلا کہ ایک طرف تو ان غیر وقوعی صورتوں کے ذکر و بحث

سے واقعی طور پر ان صورتوں کے وقوع کا دھیان لوگوں میں پیدا ہو گیا اور نہ کرتے بھی کرنے

لگے۔ دوسری طرف حیل و احتیال کا باب وسیع تر ہوا اور قانون شریعت محض ارائوا ھوا،

و ذہنیہ و خیالیہ کا مجموعہ بن کر رہ گیا! اگر کہو کہ پھر واقعی پیش آمدہ مسائل و شبہات کے دفع

وجواب کی کیا صورت ہوگی ؟ تو اس کا جواب وہی ہے جو خود شارع نے بتلا دیا تھا۔ دارمی

میں بروایت ابو مسلمہ ہے۔ آپ سے ان باتوں کی نسبت پوچھا گیا جو نئی پیش آئیں گی۔

فرمایا۔ علمائے وقت ان میں غور کریں گے۔ یعنی جب کبھی کسی انسان کو دین کے بارے میں شک و شبہ پیدا ہو تو ہر زمانے میں علمائے حق و حاملین علوم کتاب و سنت و صاحبان نظر و اجتہاد فی الدین کی ایک جماعت ہونی چاہیئے جن کے سامنے وہ اپنا شبہ پیش کرے اور جواب حاصل کر لے۔ یا اگر صاحب استعداد ہے تو قرآن و سنت پر تدبر کرے۔ یہ کون سا طریقہ دفع شبہات کا ہے کہ پہلے سے اور خود ہی اپنے جی سے خواہ مخواہ گھڑ گھڑ کر اور بلند پروازیاں کر کے شبہات و ایرادات کے دفتر مدون کئے جائیں، اور خدا کے جن صالح و راسخ بندوں کو کسی طرح کا شبہ نہیں ہے (قلبهم مطمئن بالایمان) ان کو بھی مبتلائے شبہات کیا جائے؟ اور اس طرح ضلالت انسانی کے سوئے ہوئے فتنوں کو سب سے پہلے جگانے والے بنیں؟ اگر کہا جائے کہ علاج کیونکر ہو گا اگر تمام بیماریوں کے حالات منضبط نہ کئے جائیں گے؟ تو جواب یہ ہے کہ تمثیل میں غلطی ہے۔ شبہات بیماری نہیں ہیں۔ بدپرہیزی و بے اعتدالی ہیں۔ بیماری عدم ایمان و یقین ہے اور وہ ان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ پس بیماریوں کو تو یقیناً معلوم کرنا چاہیئے۔ بیماریوں کا کامل علم ہی طبیب کامل کی پہچان ہے۔ لیکن جن بدپرہیزیوں کا ابھی ضعفائے صحت کو وہم و گمان بھی نہیں گزرا، خود ہی ان کی راہیں پیدا کر کے لوگوں کو بدپرہیزیوں کے نئے نئے دروازے کیوں دکھائے جاتے ہیں؟

یہاں جو کچھ لکھا گیا، متفرق اشارات تھے۔ اس مطلب کو متعدد مقامات میں مفصل لکھا جا چکا ہے۔ سب سے زیادہ مقدمۂ تفسیر میں۔ اس کے ایک ایک باب کا موضوع یہ ہے کہ علوم سماویہ کے خلاف انسان کے تمام شکوک و شبہات کے لئے ایسے اصول و مقالید معلوم کئے جائیں جن سے تمام جزئیات کا استقصا ہو جائے اور کوئی قسم شبہ و اعتراض کی اس سے باہر نہ ہو۔ پھر ایک دوسرے باب میں ان تمام شبہات و اعتراضات کو جمع کیا ہے جن کا قرآن حکیم نے ذکر کیا ہے، اور نیز ان کے جوابات مندرجہ قرآن۔ پھر دکھلایا ہے کہ جس وقت سے انسانی علوم اور علوم سماویہ کی آویزش کا حال

معلوم ہے، اس وقت سے لے کر آج تک کوئی شبہ اور اعتراض ایسا نہیں کیا گیا ہے جس کا اصولاً جواب قرآن میں نہ دے دیا گیا ہو اور اس کے لئے رائے و کلام کی ضرورت ہو۔ مقدمہ کے علاوہ رسالہ اتحاف الخلف اور الکلم الطیب و القول الثابت اور سیرۃ حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہا میں بھی یہ مبحث مفصل ملے گا۔ اور چونکہ تحریر تفسیر کا سلسلہ جاری ہے، اس لئے اثنا تفسیر آیات میں روز بروز یہ حقیقت ایک جمال تازہ اور رعنائی بوقلموں کے ساتھ نظرافروز ہوتی، اور ہر جلوۂ امروزہ نمود د نظارۂ دی و بارحہ کو فراموش کرا دیتا ہے۔ بحدیکہ تمام پچھلی تسویدات و ترتیبات کی رونق اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار

چیزے فزوں کند کہ تماشا بمارسد

لیکن کیا کیا جائے کہ اس معاملہ میں میرے شکیب طلب اور قناعت تالیف کے لئے بڑی ہی سخت آزمائش ہے۔ معلوم نہیں جمال حقیقت کی ان بوقلمونیوں اور رنگا رنگ جلوہ طرازیوں سے میری ہمت درماندہ اور نگہ واماندۂ نظارہ کیونکر عہدہ برآ ہو سکے گی!

فرصت دیدن گل آہ کہ بسیار کم است

وآرزوئے دلِ مرغانِ چمن بسیار است

فصل

اور امام ابن تیمیہ کی امامت و علوِّ مقام کی نسبت ائمہ معاصرین کی جو شہادتیں نقل کی گئیں، تو یہ صرف ان کے موافقین ہی کا اعتراف نہیں ہے، بلکہ معاصرین میں جو بعض اہل علم ان کے اشد شدید مخالف تھے، اور جن کی مخالفتوں سے اس وقت کے علمائے سوء و فقہائے دنیا و حکام جور کی فتنہ پردازیوں کو بڑی ہی تقویت پہنچی، خود ان کے سروں کو بھی میدان خلاف و مخالفت سے باہر دیکھو گے تو امام موصوف کے سلطان علم و عمل کے آگے ویسا ہی عقیدت مندانہ جھکا ہوا پاؤ گے جس طرح سب کے جھکے ہوئے ہیں۔ یہی مقام ہے مجدد العصر کا، اور یہی معنی ہیں کمال مرتبۂ حسن و خوبروئی کے۔ صرف دوستوں ہی کی نظریں نہ اٹھتی ہوں۔ ایک عیب چین دشمن بھی دیکھے تو بے اختیار ہو کر پکار اٹھے کہ دل ستاں صورتیں اور صبر آزما چتونیں ایسی ہوتی ہیں۔ وہ دنیا جہان کے عیب لگا دے۔ لیکن اس کی بے داغ خوبصورتی پر نام نہ دھر سکے۔ عربی میں کہتے ہیں حسن وہ ہے جس کا سوکنوں کو بھی اقرار ہو:

ومليحة شهدت لها ضراتها　　　والفضل ما شهدت به الاعداء

امام ابن تیمیہ کے معاصرین میں سب سے زیادہ نام آور مخالف قاضی تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے مسئلہ زیارۃ و طلاق پر دو رسالے لکھے اور منہاج السنہ کے متعلق ان کا قصیدہ مشہور ہے:

ان الروافض قوم لاخلاق لهم۔ الخ (۱)

---

(۱) قاضی سبکی اور ابن السبکیؒ کے رسائل کا رد متعدد ائمہ و محققین عصر نے لکھا۔ از انجملہ ابن عبدالہادی کی الصارم المنکی ہے جو چھپ چکی ہے۔ اس قصیدہ کے رد میں حافظ عقیلی سرری نے الحمیت الاسلامیہ

لیکن علمائے سلف کی مخالفتوں کو اگر تم اپنی نفس پرستانہ و متعصبانہ مخالفتوں پر قیاس کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ ان کا بھی وہی حال تھا جو آج تمہارا ہے۔ یعنی جس اہل علم سے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوا، سب سے پہلے اس کے ایمان و کفر کا فیصلہ کیا، پھر اس کی ساری خوبیوں سے آنکھیں بند کر لیں، تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ جہل و تعصب اگرچہ ہمیشہ دلوں پر حاکم رہے مگر علم والوں کا اخلاق ہمیشہ ایسا ہی نہیں تھا جیسا اپنا دیکھ رہے ہو:

گفتی کہ چہ شد قاعدۂ مہر و محبت؟

رسم کہنے بود بعہد تو بر افتاد!

جب قاضی موصوف امام ابن تیمیہ کی مخالفت میں غلو و تشدد کرنے لگے تو حافظ ذہبی نے ایک خط لکھ کر ان کو ملامت کی۔ اس خط کے جواب میں معذرت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "واما قول سیدی فی الشیخ تقی الدین، فالمملوك يتحقق كبير قدره وزخارة بحره، وتوسعه فی العلوم النقلیة والعقلیة، وفرط ذكائه واجتهاده، وبلوغه فی کل من ذالك المبلغ الذی یتجاوز الوصف، والمملوك یقول ذالك دائماً، وقدره فی نفسی اکثر من ذالك، واجل مع ماجمعه الله له من الزهادة والورع والدیانة ونصرة الحق والقیام فیه لا لغرض سواه، وجریه علی سنن السلف واخذه من ذالك بالماخذ الاوفی، وغرابة مثله فی هذا الزمان بل من ازمان" حكاه ابن حجر فی درر الكامنة۔ یعنی جو کچھ جناب کے شیخ تقی الدین (ابن تیمیہ) کی نسبت لکھا ہے تو یقین کیجئے کہ یہ خادم ان کی قدر و منزلت کی بزرگی، علم کی بے پایانی، علوم نقلیہ و عقلیہ میں وسعت نظر، کمال ذکاوت و اجتہاد، اور ان سارے اوصاف کمال میں وہاں تک پہنچ جانے کا معترف ہے،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۷

لکھی جو میرے پاس موجود ہے۔ اور حافظ ابن جمال الدین شافعی یمنی نے اسی وزن و قافیہ میں ایک مطول قصیدہ کمال بلاغت و لطافت لفظ و معنی کے ساتھ لکھا۔

الحمد لله حمداً استزید به ۔ الخ

جو منہاج السنہ جلد اول کے ساتھ چھپ گیا ہے۔

جو حد توصیف سے باہر ہے۔ علی الخصوص ان اوصاف کے ساتھ ان کا زہد و ورع اور دیانت و حق پرستی اور صرف اللہ کے لئے نصرت حق میں قیام و ثبات، اور طریق سلف پر سلوک، اور موارد سلفیہ سے بحد کمال اخذ و نظر اور بحیثیت مجموعی ان کا وہ مرتبہ کمال کہ موجودہ عہد میں اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ بلکہ کتنے ہی عہد دل سے ایسے باکمال پیدا نہیں ہوئے۔ انتہی۔[1] یہ ہے قاضی القضاۃ تقی الدین سبکی کی شہادت امام ابن تیمیہ

---

(۱) قاضی تقی الدین السبکیؒ کے اس خط کی نسبت پچھلے دنوں ایک سخت ردوکد ہو چکی ہے۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف وغیرہ میں اس خط کو شرح الفیہ ابن ناصر الدین کے حوالہ سے نقل کیا تھا جس کی نقل القول الجلی کے ساتھ وہ مکہ معظمہ سے لائے تھے۔ مولانا عبد الحی مرحوم فرنگی محلی نے دیگر تاریخی تعقبات کے ساتھ اس پر بھی اعتراض کیا اور ابراز الغی اور تعلیقات السنیہ میں لکھا کہ اس خط کو قاضی تقی الدین سبکی کی طرف منسوب کرنا غلط ہے بلکہ عجائب خبط میں سے ہے۔ یہ خط انکے لڑکے عبد الوہاب تاج الدین سبکی صاحب طبقات کا ہے۔ جو امام ذہبی کے مشہور شاگرد ہیں۔ دونوں بزرگ چونکہ "سبکی" کے لقب سے مشہور ہیں اس لئے لوگوں کو دھوکا ہوا۔ صاحب تبصرۃ الناقد نے اس کے جواب میں حافظ ابن مفلح کا قول جلاء العینین کے حوالہ سے نقل کیا لیکن چونکہ نواب صاحب مرحوم کے پیش نظر رد وافر نہ تھی، اور بعض دیگر کتابیں بھی اس وقت تک چھپی نہ تھیں۔ اس لئے بات بالکل صاف نہ ہو سکی۔ لیکن اب الرد الوافر چھپ گئی ہے۔ اس میں قاضی ابو البقا بہاء الدین سبکی کا (کہ قاضی تقی الدین سبکی کے عم زاد بھائی تھے) امام ابن تیمیہ کی نسبت یہ قول نقل کیا ہے "ما یبغض ابن تیمیہ الا جاھل او صاحب ھوی فالجاھل لا یدری و صاحب الھوی یصدہ ھواہ عن الحق" یعنی جس شخص کے دل میں ابن تیمیہ سے بغض ہوگا وہ یا تو جاہل ہوگا یا صاحب ہویٰ۔ جاہل بوجہ جہل کے۔ صاحب ہوا ہوا پرستی سے! اس کے بعد صاحب الرد الوافر لکھتے ہیں فکیف لو سمع ما صحت بہ الروایۃ عن الشیخ تقی الدین السبکی فی مدحتہ لطار فرحاً من السرور۔ کتب الحافظ الذھبی فی ما اشتھر الی تقی الدین السبکی یعاتبہ علیٰ ما صدر منہ فکتب الجواب یعتذر

اب اس سے زیادہ صاف تصریح اور کیا ہوگی؟ علاوہ اس کے طبقات الحنابلہ ابن رجب میرے مطالعہ میں رہ چکی ہے۔ اس میں بھی صرف "سبکی" نہیں ہے۔ قاضی القضاۃ ابو الحسن السبکی ہے۔ "ابو الحسن" قاضی تقی الدین کی کنیت ہے۔ تاج سبکی کی نہیں۔ تعجب ہے کہ مولانا عبد الحی مرحوم کو اپنے خیال پر اتنا وثوق کیوں ہوا کہ بالکل یقین اور انقطاع کے ساتھ انکار کر گئے؟ بلاشبہ الرد الوافر ہندوستان میں نہیں آئی تھی، لیکن حافظ عسقلانی کی درر کامنہ کا نسخہ مولوی حامد حسین مرحوم کے کتب خانہ لکھنؤ میں موجود ہے۔ وہ مولانا عبد الحی کے مطالعہ میں

رہ چکا ہے جیسا کہ تعلیقات میں خود تصریح کی ہے۔ پچھلے دنوں رسالہ المقتبس دمشق میں شیخ جمال الدین محدث شام نے دور کا منہ سے امام ابن تیمیہ کا پورا ترجمہ نقل کر دیا تھا۔ اس میں یہ خط نقل کیا ہے اور "ابوالحسن السبکی" موجود ہے۔ باقی رہا یہ شبہ کہ امام ذہبی تو قاضی تقی السبکی کے شاگرد ہیں، استاد شاگرد کو اس عجز و تذلل کے ساتھ کیونکر مخاطب کر سکتا ہے؟ تو یہ بھی صحیح نہیں۔ اول تو ذہبی کا سبکی کا شاگرد ہونا ویسی شاگردی نہ تھی جو استاذ علوم و متعلم میں ہوتی ہے۔ بلکہ محدثین کے طریق سماع و اجازت کے مطابق ایک طرح کا معاصرانہ یا ہمدگر افادہ و استفادہ تھا۔ اگر ذہبی اس معنی میں سبکی کے شاگرد تھے تو سبکی بھی ذہبی کے شاگرد تھے۔ خود ذہبی نے معجم مختص میں تصریح کی ہے "سمعت منه وسمع منی"۔ اور ویسے بھی امام ذہبی کا درجۂ علم و نظر قاضی موصوف سے کہیں ارفع ہے۔ پھر یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ سلف کا اس بارے میں وہ حال نہ تھا جو ہم بے مایگان علم و عمل کا ہے۔ وہ جس قدر زیادہ بلند ہوتے تھے اتنا ہی زیادہ جھکتے بھی تھے۔ بلکہ ان کی بلندی تمام تر پستی و پست نمائی ہی سے پیدا ہوتی تھی۔ من تواضع اللہ رفعه اللہ۔

ہند شاخِ پر میوہ سر بر زمین!

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان ہی کی تاریخ شاہد ہے۔ یہاں تو فی الحقیقت استادی شاگردی نہ تھی۔ معاصرۃ تھی۔ لیکن حضرت خواجہ باقی باللہؒ تو حضرت مجدد کے پیر تھے۔ رضی اللہ عنہما اور معلوم ہے کہ عالمِ طریقت کی استادی شاگردی کا معاملہ مدرسوں کی استادی شاگردی سے کہیں زیادہ سخت ہوتا ہے۔ لیکن حضرت خواجہ اپنے خطوط میں حضرت مجدد کو لکھا کرتے تھے "مدتیست کہ عرض نیاز مندی بہ درگاہ ولایت نہ کردہ ام"۔ "سخن درویشان بحضرت شما نوشتن بغایت بے شرمی ست"۔ "ہمیشہ طلبگار و نیاز مند نظر توجہ سامی و بذل لطف کامل می باشم"۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

اصل یہ ہے کہ مولانا عبدالحی مرحوم کو زیادہ تر استعجاب اس بات پر ہوا کہ قاضی سبکی جیسا شدید مخالف ایسے لفظوں میں اپنے حریف کے فضل و کمال کا کیونکر اعتراف کر سکتا ہے حالانکہ اگر ابن تیمیہ کے حالات و مقامات پر نظر ہوتی تو اس معاملہ میں ذرا بھی تعجب نہ ہوتا۔ قاضی سبکی کا درجہ اس عہد کے اکابر میں حافظ برزالی امام مزی امام ابن دقیق العید سے تو زیادہ نہیں ہے؟ حافظ برزالی و مزی کے اقوال پڑھ چکے ہو۔ مصر میں جب ابن دقیق العید ابن تیمیہ سے ملے تو پہلی ہی ملاقات میں کہا "ما كنت أظن ان الله تعالىٰ بقى يخلق مثلك"! یعنی کب امید تھی کہ اللہ تعالیٰ اب بھی آپ جیسے آدمی پیدا کرے گا؟ بعد کو لوگوں سے کہا: "رأيت رجلا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲)

العلوم کلھا بین عینیہ۔ یاخذ مایرید ویدع مایرید" میں نے ایک ایسا آدمی دیکھا کہ سارے علم اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ جس کو چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔ باقی رہی مسائل میں مخالفت، تو یہ اس کے لئے کب مستلزم تھی کہ مخالف کے فضل و کمال کا اعتراف بھی نہ کیا جائے؟ یہ مصیبت تو اب ہم نے پیدا کر لی ہے۔ بلا شبہ علمائے سلف جوشِ اختلاف میں تشدد و غلو بھی کر جاتے تھے کہ معصوم نہ تھے، مگر ان کا تشدد بھی صرف میدان اختلاف میں محدود رہتا۔ اس سے باہر تعصب و انکار نہیں ہوتا تھا۔ قاضی سبکی پر کیا موقوف ہے؟ حافظ ذہبی، ابن الزملکانی، ابن البلقینی، ابن حجر عسقلانی، ابن ناصر الدین، صاحب القول الجلی، حافظ ابن کثیر وغیرہم، سب نے کتنے ہی مسائل میں ابن تیمیہ کے اختیارات سے اختلاف کیا، علی الخصوص مسئلہ طلاق میں۔ جا بجا اس کو سخت غلطی قرار دیتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان کے فضل و کمال اور امامت و اجتہاد کی توصیف میں رطب اللسان بھی ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ المجتھد یخطی ویصیب اصل یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کی نسبت پچھلی صدیوں میں ہر جگہ اور ہندوستان میں خصوصاً سخت ناواقفیت اور غلط فہمیاں رہ چکی ہیں۔ بڑا سبب اس کا شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی مصنفات کی اشاعت ہے جو عہد اکبری ہی میں ہندوستان پہنچ چکی تھیں اور اکثر علمائے ہند مکہ معظمہ جا کر انہی سے سند و اجازت حدیث حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے خود تو ابن تیمیہ کی مصنفات دیکھی نہ تھیں۔ اس عہد کے بعض متعصب علماء و مشائخ کی باتیں پڑھ کر اور زیادہ تر شاہی اعلانات دیکھ کر غلط فہمی میں پڑ گئے اور دوسروں کو بھی مبتلا کیا۔ مولانا عبد الحی مرحوم کے زمانے میں تو پھر بھی ابن تیمیہ کے اصلی حالات کھل چکے تھے۔ خود انہوں نے بھی منہاج اور حمویہ دیکھی تھیں جیسا کہ تعلیقات میں لکھا ہے۔ اس لئے حسن ظن رکھتے تھے۔ لیکن عام علمائے ہند کی بے خبریوں کا اس بارے میں جو حال رہ چکا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ مولوی فضل رسول بدایونی مرحوم سوط الرحمٰن میں لکھتے ہیں۔ داؤد ظاہری شیطان کا متبع تھا۔ اس کے بعد ابن حزم ظاہری پیدا ہوا جو "خبیث" تھا۔ پھر ابن حزم کا شاگرد ابن قیم ہوا، اور ابن قیم کا شاگرد "شقی" ابن تیمیہ۔ ابن تیمیہ نے ایک نیا دین نکالا۔ بعض "اشرار بداطوار جہلاء فسقہ در حلقۂ انقیادش آمدہ در بلاد اسلامیہ طرفہ ہنگامہ برپا نمودند" اور ان تمام مورخانہ تحقیقات کے لئے آخر میں طبقات سبکی کا حوالہ بھی دیتے ہیں ایسی ہی تاریخی تحقیقات اکبر کے زمانے میں بھی بعض محققین نے کی تھیں "چوں سکندر ذو القرنین بامانت رستم شاہ بابل در میدان پانی پت با محمود غزنوی پیکار نمودہ چنانکہ فردوسی در سکندر نامہ تفصیل حالش پرداختہ" کجا ابن حزم اور کجا ابن قیم؟ بینھما مفاوز تنقطع

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۱۳)

فیھا اعناق المطی پھر لطف یہ کہ ابن تیمیہ ابن قیم کے شاگرد تھے، اور ابن تیمیہ کے ساتھی صرف اشرار وجہلا تھے! اللہ تعالے ہم سب کی کوتاہیاں معاف فرمائے اور جو گذر چکے ہیں ان کی مغفرت۔ ایک اور صاحب اسی زمانے میں لکھتے ہیں۔ ابن تیمیہ نے دین جدید کی بنیاد رکھی تھی لیکن اس عہد کے علما مثلاً ابن حجر مکی اور قسطلانی وغیرہم نے اچھی طرح رد کیا! گویا یہ دونوں بزرگ ابن تیمیہ کے زمانے میں تھے! ایک اور بزرگ جو علماءِ حق وسنت کی مخالفت میں سربرآوردہ رہ چکے ہیں، اپنی تاریخ دانی کا ثبوت یوں دیتے ہیں۔ ابن تیمیہ نے جب بنیاد دین نکالا تو پادشاہِ اسلام نے حکم دیا کہ قلعہ دمشق کے منارہ سے ہاتھ پاؤں باندھ کر یکے بعد دیگرے گراتے رہو یہاں تک کہ مرجائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ خیر! ان صاحبوں کا حال تو دوسرا تھا۔ تعجب ہے کہ بعض اصحاب درس وتصنیف کو بھی عجیب عجیب لغزشیں ہوئیں۔ مولانا عبدالحکیم مرحوم فرنگی محلی حاشیۂ شرح عقائد جلالی میں اجزأ عالم کے قدم شخصی وجنسی اور موجودیت بعض افراد علی سبیل التعاقب کی شرح کرتے ہوئے عقیدہ جہت وتجسم کو ابن تیمیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور آخر میں حوالہ دیتے ہیں کہ ابن حجر نے دُرر کامنہ اور ذہبی نے تاریخ میں انکے "ہفوات" کا خوب رد کیا ہے۔ پہلی بات تو چنداں تعجب انگیز نہیں۔ عقائد وعلوم ابن تیمیہ کی نسبت ابتدا سے غلط فہمی چلی آتی ہے۔ اس لئے جو کچھ لکھا، جوہر المنظم اور مرآۃ الجنان وغیرہ کے اعتماد پر لیکن ابن حجر وذہبی کا حوالہ کس قدر تعجب انگیز ہے؟ ان دونوں کے بیانات اوپر گذر چکے۔ ان میں ابن تیمیہ کے ہفوات کا ذکر ہے یا اعلیٰ ترین مرتبۂ حق وامامت کا؟ مقصود اس ذکر سے نکتہ چینی نہیں ہے۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ دکھلانا یہ ہے کہ ہندوستان میں ابتدا سے مطالعہ ونظر کا میدان بہت محدود رہا ہے۔ اسی لئے عجیب عجیب لغزشیں ہوتی رہیں۔ صاحب انتصار الحق عسقلانی کی بلوغ المرام کو شاہ ولی اللہؒ کی تصنیف بتلاتے ہیں۔ ایک رسالہ دافع الفساد نظر سے گذرا۔ اس میں مجمع البحار کا مصنف سیوطی کو بتلایا ہے۔ صاحب ابراز الغی عبدالحق حقی کی روح البیان کو روح المعانی سمجھتے ہیں اور پھر اس کو "الوسی زادہ" کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ حالانکہ روح المعانی "آلوسی زادہ" کی نہیں، خود "آلوسی" کی ہے۔ جمعہ فی القریٰ کی بحث میں ایک فتوئ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ قاضی شوکانی کا حوالہ فقہ وحدیث میں بے کار ہے، البتہ شوکانی ایک اچھے ادیب تھے۔ حالانکہ نیل الاوطار اس وقت تک چھپ کر شائع ہو چکی تھی اور کتاب الموضوعات تو عرصہ سے ہندوستان میں مشہور ہے۔ یہ کتابیں فن ادب میں ہیں یا فقہ وحدیث میں؟ کس قدر افسوس ناک بے خبری ہے! ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ صاحب

بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۴۲)

صیانت الایمان" "خیرات الحسان" کو حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف سمجھ کر جا بجا اس پر زور دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ابن حجر مکی کی تصنیف ہے! یہ معلوم ہے کہ ابن تیمیہ کی مصنفات اس عہد سے پہلے شائع نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہؒ تفہیمات الالٰہیہ میں تمام غلط فہمیاں دور کر چکے تھے کیونکہ ابن تیمیہ اور ابن قیم، دونوں کی کتابیں حضرت شیخ ابراہیم کورانی کی وسعت نظر و بلندی مشرب کی وجہ سے ان کے مطالعہ میں رہ چکی تھیں۔ اور خود شیخ موصوف کی کتاب افاضت العلام بھی اس بارے میں قاطع و قاضی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ملا علی قاری کی مصنفات ان کی زندگی ہی میں ہندوستان پہنچ چکی تھیں۔ شرح شمائل کا تو یہ تمام لوگ حوالہ بھی دیتے ہیں۔ کاش اسی کو دیکھ لیتے کہ ابن تیمیہ و ابن قیم کی نسبت ان کی شہادت کیا ہے۔ اور کس طرح ابن حجر مکیؒ کے تمام اقوال کو رد کر رہے ہیں؟ ممدوح کے الفاظ قریب یہ ہیں "ومن طالع شرح منازل السائرین تبین له انهما (ابن تیمیه وتلمیذه) کانا من اکابر اهل السنة والجماعة، ومن اولیاء هذه الامة، وهما بریان مما رماهما اعداؤهما من التشبیه والتمثیل" اور صاحب سوط الرحمٰن نے امام داؤد ظاہری کی نسبت جو لعن و طعن کیا ہے، تو یہ دوسری مصیبت ہے۔ اور عامۂ علمائے ہند کی بےخبریوں کی ایک واضح مثال۔ ان حضرات کا عام خیال یہ رہا ہے کہ امام داؤد ظاہری کوئی مبتدع اور خارج از اہل السنت شخص تھے، اور ان کا گروہ بھی اہل ہوا و بدعت میں سے تھا۔ حالانکہ حضرت امام داؤد منجملہ ائمہ متبوعین اہل السنت والجماعت کے ہیں، اور تمام محققین اہل سنت نے ان کے بلوغ مرتبۂ اجتہاد مطلق کا اعتراف کیا ہے۔ قاضی ابن خلکان لکھتے ہیں "کان زاهداً متقللاً کثیر الورع صاحب مذهب مستقل تبعه جمع کثیر" ان کے حلقۂ درس میں چار سو ثقات حاضر رہتے تھے "یحضر درسه کل یوم اربع مائة صاحب طیلسان"۔ یہی علامہ تاج سبکی جن کی مخالفت امام ابن تیمیہ کی تضلیل کے لئے حجت سمجھی جاتی ہے، لکھتے ہیں۔ "کان داؤد جبلاً من جبال العلم والدین۔ له من سداد النظر وسعة العلم ونور البصیرة والاحاطة باثار الصحابة والقدرة علی الاستنباط ما یعظم وقعه" کذا نقله عنه الجلال المحلی فی شرح جمع الجوامع۔ یعنی امام داؤد علم و دین کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ تھے۔ نظر کی مضبوطی، علم کے پھیلاؤ، بصیرت کی روشنی، احادیث و آثار کے احاطہ، اور استنباط کی قدرت کے لحاظ سے وہ ایک عظیم الشان وجود تھا۔ غور کرنا چاہئے کہ علمائے ہند نے ایک ایسے بزرگ علم و عمل کی نسبت کیسی کیسی باتیں لکھی ہیں؟ حالانکہ اصحاب حق و اقتصاد کا طریقہ یہ ہے کہ تمام ائمہ سلف کو حق و راستی پر یقین کرتے ہیں، اور تمام مجتہدین اہل سنت کو اپنے اپنے

کی نسبت جن کی مخالفت پر شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم مشربوں کو نازہے اور بار بار حوالہ دیتے ہیں کہ شیخ الاسلام سبکی نے ان کا رد کیا، تو یہ ہیں شیخ الاسلام سبکی! اور وہ تھے امام ابن تیمیہ!

متفق گردید رائے بو علی بارائے من!

یہ ہے "کمال" اور "حسن" ہی ہیں یہ اعجاز ہے کہ اگر تم پہاڑ کا جماؤ اور سمندروں کا طوفان بھی اپنے اندر پیدا کر لو، جب بھی اس کے سامنے ایک اڑتے ہوئے تنکے

بقیہ حاشیہ صفحہ

مجتہدات میں بر سر حق و بصیرت سمجھتے ہیں، اور سب کی محبت و تعظیم اور عموم حسن ظن کو اہل سنت کے لئے ایک علامت بتلاتے ہیں۔ سب کا علم و عمل کتاب و سنت پر تھا۔ کوئی نہیں جس نے بلا کسی دلیل و بصیرت کے اجتہاد کیا ہو۔ البتہ عصمت صرف انبیاؑ کے لئے ہے۔ وما عداهم يخطى ويصيب یہی علامہ تاج سبکی جمع الجوامع کے خاتمہ میں لکھتے ہیں: ونعتقد ان الشافعي ومالكا وابا حنيفة والسفيانين واحمد والاوزاعي واسحاق وداؤد وسائر ائمة المسلمين على هدى من ربهم الخ یعنی ہمارا عقیدہ ہے کہ امام شافعی، مالک، ابو حنیفہ، دونوں سفیان (یعنی سفیان ثوری اور سفیان ابن عیینہ) احمد، اوزاعی، ...، داؤد اور نیز تمام ائمہ اہل اسلام حق و راستی پر تھے۔ سب کا شمار على الهدى من ربهم واولائك هم المفلحون میں ہے۔ یعنی ان میں سے کسی پر زبان طعن نہیں کھولنی چاہئے۔ نہ کسی کو حق کا مخالف سمجھنا چاہئے۔ اصلاً سب کا طریقہ ایک ہی تھا۔ اور اصول میں تو ابداً کوئی بھی مختلف نہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ امام داؤد کی طرف بعض مسائل منسوب کئے گئے ہیں، جو اصلیت کے خلاف ہیں۔ یا بعض کی تعبیر غلط کی گئی ہے، اور یہ سب کے ساتھ ہوا ہے۔ اختلاف کے سوء فہم و زیغ نظر کی آلودگی سے ائمہ سلف میں سے کسی کا دامن نہ بچ سکا۔ ان سب کا دامن پاک تھا۔ آلودگی سب ہماری ہی اڑائی ہوئی گرد و خاک ہے۔ خوب فرمایا شاہ صاحب نے تفہیمات میں بہ تذکرہ امام ابن تیمیہ۔ جس طرح صحابہ کے مشاجرات میں ہم نے کف لسان اپنا شیوہ بنایا چاہئے کہ علماء سلف کے اختلافات میں بھی یہی طریق ملحوظ رکھیں۔ ان کے احسانات عظیمہ سے تمام امت کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ عمارت شریعت کی ہر پہلی اینٹ پچھلی اینٹوں کے لئے بنیاد ہے۔ اگر اس کو نقصان پہنچ گیا تو پوری عمارت بیٹھ جائے گی۔ اور یاد رہے کہ سلف کی محبت اور تعظیم ہی اہل سنت ہونے کی سب سے بڑی اور پہلی پہچان ہے۔ اللهم لا تجعل لاحد منهم في قلوبنا غلا ونجنا بحبهم من اهوال يوم القيامة!

کی طرح گر جانے سے اپنے تئیں نہیں روک سکتے۔ اگر تم اپنے سر کو جھکنے سے اور زبان کو بولنے سے روکو گے، تو سچائی کا فرشتہ اپنے آہنی پنجوں سے تم کو گرا دے گا اور حقیقت کا ہاتف تمہارے حلق کے اندر بیٹھ کر تمہاری زبان کو ایک مدہوش و بے اختیار آدمی کی طرح کھول دے گا۔ سچائی جب اپنی گواہی پتھروں کو چلا کر لے سکتی اور درختوں کو بلوا کر دلا سکتی ہے تو انسان کی روح و زبان کب اس کے فرمانِ قضا سے باہر رہ سکتے ہیں؟ دنیا میں کامل طاقت اور بے باک حکم صرف سچائی کا ہے۔ یا اس کے دوسرے عرف میں کہہ سکتے ہیں کہ حسن کا اس کے سوا کون ہے؟

اے سنگ بر تو دعوئے طاقت مسلم است
خود را نہ دیدۂ بہ کف شیشہ گر ہنوز!

شیخ ابن حجر مکی اور دیگر مخالفین ابن تیمیہ قاضی سبکی کے بعد قاضی جمال الدین زملکانی کی مخالفت سے استدلال کرتے ہیں، سو بلاشبہ انہوں نے بھی نہایت سخت مخالفت کی۔ دونوں مرتبہ وہی رئیس المناظرین تھے۔ حافظ ابن البلقینی لکھتے ہیں کہ جب ابن تیمیہ سے مناظرہ قرار پایا تو زملکانی کے سوا کوئی زبان نہ کھول سکا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں "حتیٰ کان اشد المتعصبین علیہ والعاملین فی ایصال الشر الیہ وھو الشیخ الزملکانی" یعنی شیخ زملکانی نے سب سے زیادہ ان کے خلاف اظہار تعصب کیا اور ان کو مضرت پہنچانے میں ساعی ہوئے۔ لیکن معلوم ہے کہ بایں ہمہ امام موصوف کے علم و عمل کی نسبت ان کی رائے کیا تھی؟ حافظ ابن رجب طبقات میں ان کا قول نقل کرتے ہیں: فیما احفظ عنہ "لم یر من خمس مائۃ سنۃ" پانچسو برس سے ایسا باکمال دیکھا نہیں گیا! امام ابن تیمیہ کی ایک کتاب الدلیل علی بطلان التحلیل ہے۔ قاضی موصوف نے اس کو اپنے قلم سے نقل کیا اور لوح پر لکھا من مصنفات سیدنا، وشیخنا وقدوتنا الامام العالم العلامۃ الاوحد البارع الزاھد الورع القدوۃ الکامل العارف سید العلماء قدوۃ الائمۃ حجۃ اللہ علی العباد اوحد العلماء العاملین آخر المجتہدین شیخ الاسلام، الحافظ

سیوطی کی اشباہ والنظائر النحویہ اب چھپ گئی ہے۔ حرف "لو" کی بحث میں ابن تیمیہ کی ایک تحریر نقل کی ہے جو شیخ زملکانی کے خط سے منقول ہے۔ شیخ موصوف ابن تیمیہ کی مدح میں کہتے ہیں:

ماذا یقول الواصفون لہ ؟ وصفاتہ جلت عن الحصر!
ہو حجۃ للہ قاہرۃ ہو بیننا اعجوبۃ الدہر!
ہو آیۃ فی الخلق ظاہرۃ انوارہ اربت علی الفجر!

صاحب الرد الوافر نے ان کا قول نقل کیا ہے "اجتمعت فیہ شروط الاجتہاد علی وجہہا" اور "کان اذا سئل عن العلم ظن السامع انہ لا یعرف غیر ذلک۔ وکان الفقہاء من سائر الطوائف اذا جلسوا معہ استفادوا فی مذاہبہم" الخ یعنی اجتہاد کی ساری شرطیں پوری طرح ابن تیمیہ میں جمع ہوئیں۔ ان کی ہمہ دانی کا یہ حال تھا کہ جس علم میں زبان کھلتی معلوم ہوتا اسی علم کے ماہر و امام ہیں۔ تمام مذاہب کے فقہاء ان کے گرد جمع ہوتے اور اپنے اپنے مذہبوں کے علوم و مسائل میں استفادہ کرتے۔ انتہٰی۔

یہ ہے شہادت ان کے مشہور مخالف و حریف کی اور اسی سے اندازہ کر لو کہ جب مخالفوں کا یہ حال تھا تو دوستوں اور منزلت شناسوں کی وارفتگی کا کیا حال ہوگا؟ کیا خوب فرمایا قاضی عینی نے رد الوافر کی تقریظ میں کہ اگر اور کسی اہل علم کا اعتراف منقول نہ ہوتا، تو صرف یہی ایک شہادت ابن تیمیہ کے کمال مرتبۂ علم و عمل کے لئے کفایت کرتی تھی:

اے گل! نہ ہمیں معرکۂ من بتو گرم است
ہنگامۂ صد سوختہ خرمن بتو گرم است

فصل

اور یہ جو کچھ لکھا گیا تو مقام تجدید و عزیمت و دعوت کے صرف ایک ہی پہلو کی نسبت یعنی مراتب علم و نظر۔ لیکن یہاں کی سب سے بڑی آزمائش گاہ میدان عمل ہے۔ حقیقت بہت زیادہ واضح ہو جاتی اگر ان کی حیات دعوت و اصلاح کے اعمال و اقدامات عظیمہ کے مناظر سامنے آتے۔ تم دیکھتے کہ اس عہد کے تمام اصحاب فضل و کمال میدانِ عمل و دعوت میں کہاں تھے؛ اور یہ مجدد العصر کہاں تھا؟

تقدم راکباً فیھم اماماً ولولاہ لما رکبوا وراءہ

ساتویں صدی کے اختتام اور آٹھویں صدی کے اوائل کا زمانہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی نازک اور انقلابی زمانہ تھا۔ مشرق میں عربی خلافت کا بالکل خاتمہ ہو چکا تھا ٹمٹماتے ہوئے چراغ بھی بجھ چکے تھے۔ تاتاریوں کا سیلاب اپنی اصلی بلندیوں تک پہنچ چکا تھا، اور اب تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل رہا اور بہر کنے اور ٹھیرنے کی جگہ ٹھیر رہا تھا۔ یہ وحشی درندے صرف تاخت و تاراج کے لیے آئے تھے۔ لیکن اب پچاس لاکھ مسلمانوں کے خون اور چھ صدیوں کے اسلامی تمدن کی ویرانی پر اپنی سلطنت کی عمارت تعمیر کر رہے تھے۔ ہلاکو کا پڑپوتا غازان خاں اگرچہ مسلمان ہو گیا تھا، لیکن ابھی یہ تبدیلی محض برائے نام تھی۔ وحشت و خونخواری میں تمام تاتاری خصائل بدستور کام کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا کوئی مرکز باقی نہ رہا تھا۔ برسوں تک جمعہ کے خطبے کسی سلطان اسلام کے ذکر سے خالی رہے۔ اس عام بربادی نے مسلمانوں کی تمام اخلاقی قوتیں بھی فنا کر دیں۔ تاتاریوں کی ہیبت نے زندوں کو مردہ بنا دیا تھا۔ وہ صرف خون بہاتے اور نعشوں کے پل اور سروں کے منارے کھڑے کرتے۔ ایک چھوٹی سی ٹکڑی تباہ دیولا کی آبادیاں ذبح کر ڈالتی اور

بادشاہوں اور فوجوں کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ جب کوئی مرکز نہ رہا، تو شریعت کا بھی کوئی محافظ نہ رہا، نہ امت کا کوئی رہبر۔ وہ سارے علمی و عملی مفاسد جو آج نظر آرہے ہیں یا تو اسی عہد میں پیدا ہوئے، یا ہو چکے تھے تو اسی عالم آشوبی میں کمال و بلوغ کو پہنچے۔ علوم اصلیہ قرآن و حدیث کے ترک کی بنیادیں اسی عہد میں استوار ہوئیں۔ تقلید شخصی اور مذہبی فرقہ بندی کے التزام اور تعصب نے اسی زمانے میں پورا پورا زور پکڑا۔ تاتاریوں کو سب سے پہلی دعوت حنفیوں اور شافعیوں کی باہمی پیکار ہی نے دی تھی[1]۔ نومسلم حکمران مذہب و علم سے نا آشنا تھے۔ اس لئے مذہبی حکومت تمام تر علماء و فقہاء مذاہب کے ہاتھ آگئی۔ ہر مذہب کے لئے الگ الگ قاضی، الگ الگ مدارس، اوقاف، ائمہ جمعہ اور مذہبی عہدے قرار پائے۔ یہی چیز صدہا مفاسد و معائب کا باعث ہوئی۔ ایک طرف علماء دنیا و فقہاء دولت کا ایک گروہ عظیم پیدا ہوگیا[2]۔ دوسری طرف باہمی تعصب و تفرقہ کی آگ روز بروز زیادہ بھڑکنے لگی۔ حتّیٰ کہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام

---

[1] یہاں ایک طول طویل فٹ نوٹ تھا اور ان اسباب کی تشریح کی تھی جو تاتاریوں کے حملے کا اصلی باعث ہوئے۔ اختصار کے خیال سے میں نے نکال دیا۔ ممکن ہوا تو آخر میں بطور ضمیمہ کے درج کر دوں گا۔ (پبلشر)۔

[2] حضرت شاہ ولی اللہؒ نے انصاف میں ابن زیاد یمنی کے حوالہ سے ابو زرعہ کا قول نقل کیا ہے۔ "ایک دن میں نے اپنے استاد امام بلقینی سے پوچھا ما یقصر بالشیخ تقی الدین السبکی عن الاجتهاد وقد استکمل آلیه وکیف یقلد یعنی تقی الدین سبکی کو اجتہاد سے کیا بات روکتی ہے حالانکہ ان میں تمام شرائط اجتہاد جمع ہیں؟ یہ پوچھنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ خود امام بلقینی کی نسبت بھی یہی سوال پیدا ہوتا تھا۔ خیال کیا کہ جو عذر وہ سبکی کی نسبت کہیں گے اسی کو ان کے لئے بھی سمجھ لوں گا۔ لیکن انہوں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس پر میں نے کہا ماهو الا للوظائف التی قدرت للفقهاء علی المذاهب الاربعة وان خرج عن ذالك واجتهد لم ینله شئ وحرم ولایة الفقهاء وامتنع الناس من افتائه ونسب للبدعة۔ یعنی میں تو اس کا سبب یہی سمجھتا ہوں کہ ان سرکاری عہدوں کے لئے جو فقہاء مذاہب اربعہ کے لئے مقرر ہیں۔ اگر کوئی دائرۂ تقلید سے قدم باہر نکالے گا تو ان عہدوں سے محروم ہو جائے گا۔ فقہاء کی ریاست جاتی رہے گی، عوام اس سے فتویٰ لینا چھوڑ دیں گے، اور لوگوں میں بدعتی کہلائے گا۔" ابو زرعہ کہتے ہیں کہ "امام بلقینی یہ سن کر متبسم

نے بھی کبھی اہمیت نہ دی تھی، ان کی بنا پر اب خواص و فقہا ایک دوسرے کی تضلیل کرنے لگے، اور جس گروہ کو حکومت میں زیادہ دخل ہوا، اس نے دوسرے کو قید خانوں اور جلا وطنیوں کی مصیبت تک پہنچا کر چھوڑا۔ عوام کا فتنہ اسی زمانے میں اس درجہ تک پہنچا جہاں آج نظر آرہا ہے۔ شریعت کے اعتقاد و عمل کی ساری پادشاہی انہی کے ہاتھ ہے۔ جو بات چاہیں علمائے سے کہلوا دیں، اور جس بات کو اپنے ہوائے نفس کے خلاف پائیں اس پر اس قدر ہنگامہ مچائیں کہ بالآخر کسی کو زبان کھولنے کی مجال باقی نہ رہے[1]۔ علم و عمل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۸) ہوئے اور مجھ سے اتفاق کیا"۔ انتہیٰ۔ ابوزرعہ و امام بلقینی کا یہ خیال قاضی سبکی کی نسبت صحیح تھا یا نہیں؟ اس سے یہاں بحث نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ ابوزرعہ کو یہ خیال پیدا ہوا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علوم دینیہ کے تنزل اور منع باب نظر و فقاہت فی الدین کے اسباب میں عجمی و ترکی حکومتوں کے دور اور ان کے ملکی انتظامات کو کس قدر دخل ہے؟ اور کس طرح آٹھویں صدی ہی میں یہ معاملات آخری درجہ تک پہنچ چکے تھے، اور عوام کا فتنہ کس طرح نظر و فکر کے سارے دروازوں کو روکے کھڑا تھا؟ جب یہ حال اس عہد کا تھا تو بعد کا کیا پوچھنا؟ اور پھر آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کا کیا ذکر؟

یا دل پہ کوئی زخم نہ تھا جز نمود داغ
یا اب یہ بڑھ گیا ہے کہ ناسور ہو گیا

امام ابوحفص عمر بن ارسلان بلقینی نے ۸۰۵ھ میں انتقال کیا۔ قاضی تقی السبکی اور شیخ ابوحیان کے شاگرد، اور اپنے عہد کے شیخ الاسلام و مرجع و مستند اکابر و اعلام تھے۔ اکثر علمائے نے ان کو مجتہد العصر تسلیم کیا۔ سیوطی نے بعض اقوال حسن المحاضرہ میں نقل کیے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے مجدد تھے۔ ان کی شرح بخاری نے مخصوص قبولیت پائی۔ حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں ابواب بخاری کے ربط و ترتیب کی نسبت ان کا مقالہ نقل کیا ہے۔

[1] اس عہد کے ان حالات کے لئے حافظ ذہبی کی تاریخیں اور درر کامنہ ابن حجر اور ضوء اللامع سخاوی، مطالعہ کافی ہے۔ کتنے ہی اکابر علم و عمل ہیں جن کی زندگیوں کا خاتمہ یا تو قید خانے میں ہوا یا جلاد کی تلوار کے نیچے۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ کسی ایک مسئلہ میں عوام کے معتقدات و اعمال کے خلاف قدم اٹھایا تھا۔ اس عہد میں ایک خاص قابل ذکر بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ گو فقہائے مذاہب اربعہ میں باہم نہایت سخت تعصب تھا۔ لیکن جب کبھی کسی مصلح حق کے خلاف شورش پیدا ہوتی، تو تمام فقہا شافعیہ و حنفیہ اس کا معاملہ قاضی مالکی ہی کے سامنے پیش کراتے

کی وہ ساری بدعتیں جو آج مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہیں۔ حتیٰ کہ باب اجتہاد مسدود، ان سب کا شیوع اور جماؤ اسی زمانے میں ہوا۔ تعلیم و تعلم کی تمام مجتہدانہ قوتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب صرف پچھلے ذخیرہ کی مزید آرائش و تزئین میں ہمتیں مصروف تھیں۔ اسی چیز نے متون و شروح اور تلخیص و تعلیق وغیرہ کے طریقہ کو رواج دیا جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ اس کے سوا اور تمام راہیں نظر و فکر کی بند ہو گئیں۔ مذہبی عہدوں کا ذریعہ صرف فروع فقہ کا علم تھا، اس لئے علوم دینیہ میں صرف اسی پر قناعت کر لی گئی۔ رفتہ رفتہ علوم اصلیہ قرآن و حدیث متروک و مہجور ہو گئے۔ یہ بات پہلے سے ہو چکی تھی (جیسا کہ امام غزالی وغیرہ نے لکھا ہے) لیکن اب بحد غایت پہنچ گئی۔ عملیات میں اہل کتاب اور عجمی اقوام کے اختلاط و امتزاج کا معاملہ آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس لئے بدعات و رسوم کا فتنہ بھی اپنی پوری قوت اور احاطہ تک پہنچ گیا اور بڑے بڑے علماء کی نظریں اس کے نفوذ و احاطہ کے اندر گم ہو گئیں۔ ایک بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر نازل ہوئی، تصوف کے علم و عمل کا تنزل اور جہل و فسق کی کثافتوں سے اس جوہر پاک کا امتزاج اور اہلِ صلاح و طہارت کی جگہ خانقاہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۹) اس موقع پر باہمی تعصب باقی نہ رہتا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ مالکیہ کے مذہب میں تعزیر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ حبس و تشہیر کے علاوہ قتل بھی کیا جا سکتا ہے پس قاضی مالکی سے فتویٰ لیا جاتا تاکہ انتہائی سزا دلائی جا سکے۔ علامہ محمد بن مری البعلی اور امام ابن دقیق العید کا جرم یہ تھا کہ ابن تیمیہ کی حمایت کرتے ہیں اور امام بخاری کی کتاب خلق افعال العباد کو استناداً پیش کرتے ہیں۔ شورش کا اصلی باعث قاضی حنفی تھا۔ لیکن خود فیصلہ نہیں دیا۔ معاملہ قاضی مالکی کے سامنے پیش کرایا۔ اس نے علامہ بعلی کو پہلے تازیانوں سے پٹوایا۔ یہاں تک کہ زمین خون سے تر ہو گئی۔ پھر گدھے پر الٹا سوار کرا کے تمام شہر میں تشہیر کی۔ دور کامنہ میں پوری تفصیل موجود ہے۔

باقی رہا اس عہد کے بدعات و رسوم و موالات کفار تتار و سوء علم و عمل و باہمدگر تعصب و عناد فقہاء تو اس کا مفصل حال خود امام ابن تیمیہ کی تصنیفات سے ملتا ہے۔ مثلاً اقتضاء الصراط المستقیم، مجموع الفتاویٰ، الدلیل، مجموع الرسائل وغیرہا۔

اور معصوموں کی عمارتوں کی حکومت کا قائم ہو جانا ہے۔ یہ چیز اس عہد میں پوری طرح نشو و نما پا چکی تھی۔ علی الخصوص دیار مصر و شام میں کہ بقیۃ السیف مسلمانوں کا مامن و ملجا تھے، صرف رسمی خانقاہوں اور خرقہ پوشوں کی شہنشاہی تھی۔ خود ملوک و سلاطین بھی انہی کے معتقد تھے، اور حکومت کے زور سے ان کی بدعتیں پھیلاتے تھے۔ جس گروہ کے قبضہ میں وقت کا بادشاہ اور عوام کا غول ہو، اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ ملک بے برس چاشنی گر جس کے عہد میں نہ صرف ابن تیمیہ بلکہ تمام ائمہ عہد مثلاً امام ابن دقیق العید و حافظ مزی و علم الدین برزالی وغیرہم مبتلائے محن ہوئے۔ شیخ نصیر المنبجی صاحب خانقاہ دمشق کا حلقہ بگوش معتقد تھا۔ اسی نے بے برس کو ابن تیمیہ کے خلاف بھڑکایا تھا۔ غرضیکہ ملت و شریعت کی سیزدہ صد سالہ زندگی میں جو سخت سے سخت انقلابی زمانے گزر چکے ہیں، ان سب سے زیادہ سخت و مہلک زمانہ تھا، اور ایک انقلابی برزخ تھا کہ اصلاح کی تمام پچھلی قوتیں ختم ہو چکی تھیں، اور فساد کے تمام تخم آیندہ کے لئے پھل پھول رہے تھے۔ وقت نہ تو بڑے بڑے مدرسوں کا طالب تھا نہ بڑی بڑی خانقاہوں کا، بلکہ صرف ایک ایسی زبان و قدم کے لئے تشنہ و بے قرار تھا جس میں "عزم" ہو اور عازمانہ دعوت و امامت۔ سینکڑوں ہزاروں اعاظم وقت میں سے کسی کو بھی یہ منصب نہ ملا۔ صرف امام ابن تیمیہ ہی تھے جو زمانے کو پلٹ دینے اور ملکوں اور جماعتوں کو بدل دینے کے لئے اٹھے، اور ایک ہی وقت و زندگی میں وقت کی ہر طلب و سوال کا جواب دیا۔ تاتاریوں کے مقابلے میں حفظِ ملت و بلاد کی ایک نئی زندگی تمام بلاد مصر و شام میں پیدا کر دی۔ علم ہی میں نہیں، بلکہ میدان جہاد و قتال میں بھی ان کا گھوڑا سب سے آگے رہتا تھا۔ ذہبی نے کہا: "اما شجاعتہ فبھا تضرب الامثال وبشبہ اکابر الابطال حتی کانہ لیث حروب" ایک صدی کے قتل و غارت نے تمام ملک کو جرأت و ہمت سے کورا کر دیا تھا۔ بے غیرتی و بزدلی سے سب کے دل مردہ ہو گئے تھے۔ مگر اب وہی آبادیاں تھیں جو خود منزلوں آگے بڑھ کر تاتاریوں کا مقابلہ کرتیں، اور

سورج کی روشنی سے زیادہ اس حقیقت پر ایمان رکھتیں کہ مسلمان اگر مسلمان ہو تو اس کو کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی[1]۔ ان کی زندگی کے حالات امام ذہبی کی زبانی سنو تو معلوم ہو کہ دل کی جگہ سیماب اور ہمت و عزم کی جگہ ایک پہاڑ تھا۔ دل کی بے قراریوں نے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ مگر ہمت کی کوہ وقاری نے جہاں جمایا، بغیر فتح و نصرت کے منہ نہ موڑا۔ ساتھ ہی علوم و عقائد کی تجدید و اصلاح کا عظیم الشان کام بھی اس اہتمام سے انجام دیا کہ بڑی بڑی جماعتوں سے بھی انصرام نہ پاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دین حق و توحید کی وحدت، اصل ملت کے ہر حال و ہر شکل میں ایک ہو نے خیر القرون کے علم و عمل کی از سر نو تجدید، دین الخالص اور سنت خالصہ و محضہ کے اعتصام، اور تمام تفرقوں اور فرقہ بندیوں اور بدعتی راہوں کے خلاف قولاً و عملاً دعوت اولیٰ کی صدا اس قوت و نفوذ کے ساتھ بلند کی کہ وقت کا کوئی شور و غوغا اس پر غالب نہ آسکا، اور گو ہمیشہ دبانے کی بڑی بڑی قاہر و جابر کوششیں کی گئیں، مگر اس کی گونج رہ رہ کر اٹھتی، اور دب دب کر ابھرتی رہی۔ حتیٰ کہ آج بھی اگر مختلف گوشوں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں تو یہ بھی اسی گونج کی بازگشت ہے۔ متنبی نے کیا خوب کہا ہے:

وما الدھر الامن رواۃ قصائدی   اذا قلت شعرًا، اصبح الدھر منشدًا

دشمنان حق کے پاس سب سے بڑا آلۂ تعذیب قید خانوں کی کوٹھریاں ہیں مگر یہ چیز بھی ان کی عزیمت و دعوت کے مقابلہ میں بے کار تھی۔ مصر میں جب قید کئے گئے تو

---

[1] یہی وجہ ہے کہ بالآخر وہ بھی اس فتنہ سے دوچار ہوئے جو اکثروں کو اس کام میں پیش آیا ہے یعنی سیاسی دعوت اور سلطنت و امامت کبریٰ کی بدگمانی۔ علمائے سوء کو ان کی مخالفت میں بڑی کامیابی اسی لئے ہوئی کہ پولیٹیکل خطرہ دکھلا کر اور تمام ملک میں ان کے حاکمانہ و شاہانہ اقتدار کو دلیل میں پیش کر کے حکام وقت کو بھی مخالف بنا دیا۔ حافظ ابن حجر درر میں لکھتے ہیں "ونسبہ قوم الیٰ انہ یسعی للامامۃ الکبریٰ فانہ کان یلھج بذکر ابن تومرت ویطریہ فکان ذالک مؤکدًا لطول سجنہ" اور ابن کثیر لکھتے ہیں "ومن جملۃ اسباب حبسہ خوفھم انہ ربما یدعی ویطلب الامارۃ فلقی اعداؤہ علیہ طریقًا من ذالک وحسنوا للامراء حبسہ لسد تلک المسالک"

تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ جب قلم دوات بھی چھین لی گئی تو قید خانے کے اندر قیدیوں پر نظر ڈالی۔ ان کا بڑا حصہ ڈاکوؤں رہزنوں اور قاتلوں کا تھا۔ لیکن چند دنوں کے اندر ان کو شیطان سے فرشتہ بنا دیا۔ علم وعمل کی جو برکتیں خانقاہوں اور مدرسوں کو نصیب نہ تھیں، وہ جیل خانے کے اندر ہر طرف نظر آنے لگیں۔ صاحب کواکب لکھتے ہیں

حتیٰ سار المحبس بالاشتغال بالعلم والدین خیراً من کثیر من الزوایا والربط والخوانق والمدارس

یہ معنی ہیں ایمان کامل، اور مقام عزیمت علم وعمل کے۔ چراغ جہاں کہیں رکھا جائے گا اجالا ہو جائے گا۔ اور پھولوں کا گلدستہ طاق کی جگہ کوڑے کرکٹ کی ٹوکری ہی میں کیوں نہ ڈال دو لیکن اس کی خوشبو ضرور پھیلے گی۔ مور نے کہا میرا چمن میرے ساتھ ہے۔ باغ و بہار کا محتاج نہیں۔ جہاں کہیں پروں کو کھول دوں گا ایک تختہ چمن کھل جائے گا۔ یہی حال مومن کامل اور صاحب علم وعمل حق کا ہے۔ وہ کسی زمان ومکان کا محتاج نہیں جہاں کہیں بھی جائے گا روشنی پھیلائے گا، اور جس جگہ سے گزرے گا، ہوا کی عطر بیزی بتلا دے گی کہ کوئی گزرنے والا یہاں سے گزرا ہے:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　　کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

امام ابن تیمیہ کے تذکرہ میں بوجہ ضمنی مباحث کے بہت طول ہو گیا۔ بایں ہمہ جس قدر لکھا گیا، اس سے کہیں وہ چند قابل ذکر امور چھوڑ دئے گئے۔ حافظ ذہبی کو بھی ایسی ہی صورت پیش آئی تھی۔ جن لفظوں پر انہوں نے ان کا ذکر ختم کیا تھا، میں بھی کر دوں گا۔

ومن خالطه وعرفه وقد ینسبنی الی التقصیر فیه۔ ومن نابذه وخالفه قد ینسبنی الی التغالی فیه "قاله فی المعجم۔ یعنی جو لوگ امام ابن تیمیہ کے مقامات ومراتب کے جاننے والے ہیں، وہ تو مجھے الزام دیں گے کہ جس قدر مدح وتوصیف کرنی تھی نہ کی، اور جو بے خبر اور مخالف ہیں وہ میرے بیان کو غلو ومبالغہ قرار دیں گے۔ انتہیٰ۔ قلت:

واذا لم تر الہلال، فسلم　　　لاناس رأوه بالابصار!

فصل

مقصود اصلی اس تذکرہ سے یہ تھا کہ "دعوت" کا مقام دوسرا ہے، اور "عزیمت دعوت" کا دوسرا۔ ضرور نہیں کہ ہر رہرو کی یہاں تک رسائی ہو۔ عہد ظہور دعوت میں ہزاروں اصحاب علم وکمال موجود ہوتے ہیں مگر دروازہ کا کھولنے والا صرف مجدد العصر ہی ہوتا ہے، اور اس کے ظہور کے لیے ضروری نہیں کہ عامۂ اصحاب علم وحق بکلی معدوم ہو گئے ہوں۔ یہ چند متفرق مثالیں تو دور کی تھیں۔ خود ہندوستان ہی کی تاریخ دیکھ لو۔ ہمیشہ ایسا ہی معاملہ نظر آئے گا۔ شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماؒ ومشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے؟ لیکن مفاسد وقت کی اصلاح وتجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا[1]۔ معلوم ہے کہ اس عہد میں بڑے بڑے علماؒ واصحاب خانقاہ موجود

---

[1] ان سطور کے لکھتے ہوئے خیال آیا کہ حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ کا وجود گرامی بھی منجملہ ان اکابر امت کے ہے جن کی تعظیم وتوقیر تو حسن اعتقاد کی بنا پر بہت کی جاتی ہے۔ لیکن ان کی زندگی کے اصلی کارناموں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ بڑے بڑے معتقدین تک کو خبر نہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان کی تجدید محض رد بدعات جہال صوفیہ، وتحقیق بعض معارف تصوف واعلان واشتہار توحید شہودی میں منحصر ہے۔ حالانکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ خود ان کی زندگی میں بھی بہت کم لوگوں کی وہاں تک رسائی ہوئی تھی۔ اسی لیے بار بار اپنے مکتوبات میں یہ شعر لکھتے ہیں اور ابنائے عصر کی کوتاہ فہمیوں پر فغاں سنج ہیں

فریاد حافظ ایں ہمہ آخر بہرزہ نیست
ہم قصۂ عجیب وحدیثِ غریب ہست

اصل یہ ہے کہ مجددین امت کا ظہور بھی معاملات نبوت کے ماتحت ہے جس طرح انبیا کرام کی تعلیم و دعوت ہمیشہ اسی رنگ میں جلوہ افروز ہوتی ہے جس کا ان کے عہد میں غلبہ ہو۔ اسی طرح مجددین امت کا ظہور بھی ہمیشہ اپنے رنگ روپ میں وقت کے مقتضا و داعیہ کے مطابق ہوتا ہے۔ کبھی امراء و سلاطین میں سے ظہور ہوتا ہے، کبھی علماء و اصحاب درس و تدریس میں سے، کبھی اصحاب سلوک و طریقت میں سے۔ اور یہ تنوع اس لئے ہوتا ہے کہ ان وقتوں کے حالات انہی بھیسوں کے مقتضی ہوتے ہیں۔ اور چونکہ غلبہ وقت کے رنگ کا ہوتا ہے، اس لئے اور تمام رنگتیں اس کی چمک دمک کے سامنے پھیکی پڑ جاتی ہیں۔ صرف باریک بین نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ عام طور پر شہرت و غلغلہ صرف ایک ہی معاملہ کا ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب تفہیمات میں لکھتے ہیں "وکذالک امر المجددین والاوصیاء فان صورۃ التجدید وتاویل الشریعۃ یکون مختلفاً باختلاف الزمان والمکان"

یہ حالت اکثروں کو پیش آئی۔ بہرحال خیال ہوا کہ حضرت موصوف کی سیرۃ کا لکھنا بھی ضروری ہے۔ اس بارے میں تمام مواد ذہن میں موجود تھا۔ حاجت مطالعہ و مراجعت کی نہ تھی اس لئے پچھلے ہفتے اس طرف توجہ ہوئی، اور آج ۱۳۔ اگست ۱۹۱۶ء کو پورے ایک ہفتہ میں اتمام کو پہنچی فالحمد للہ علی ذالک شمار کیا تو متوسط تقطیع کے ۱۷۳ صفحے ہوئے۔ چونکہ اس تذکرہ کی تسوید کے محرک باعث مرزا فضل الدین احمد صاحب سے وعدہ تھا کہ تذکرہ کی ضمن میں جو کچھ لکھا جائے گا، انہی کے سپرد ہوگا، اس لئے یہ بھی انہی کے حوالے کرتا ہوں۔ خواہ چھپ جائے خواہ پڑا رہے۔ ع

حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

سیرت حضرت مجدد لکھتے ہوئے کچھ عجیب انشراح خاطر اور انبساط طبع بہم پہنچا جس کی کیفیت حد بیان سے باہر ہے، اور یہ یقیناً اس ارادت و نسبت کا نتیجہ ہے جو حضرت ممدوح سے اس عاجز اور اس عاجز کے خاندان کے تمام اکابر کو نسلاً بعد نسل حاصل رہی ہے

وما ذاک الا ان ھند عشیۃ تمشت وجرت فی جوانبہ بردا!

حتیٰ کہ اس کو اپنے خمیر طینت میں ممزوج پاتا ہوں، اور اس وقت سے برسر نفوذ و ظہور دیکھتا ہوں کہ مقبل ان اعراف الھویٰ"

فصادف قلبا خالیاً فتمکنا!

یہی نسبت و ارادت کی ایک دولت ہے جو شاید ہم بے مایگان کار اور تہی دستان راہ کے لئے توشۂ آخرت اور وسیلۂ سعادت ثابت ہو۔ اگر اس کے دامن تک ہاتھ نہ پہنچ سکا تو اس کے دوستوں کا دامن تو پکڑ سکتے ہیں، اللہ اس راہ میں ثبات و استقامت روزی فرمائے اور اس کے

تھے۔ بدایونی و طبقات اور روضۃ العلماءُ و اخبار الاخیار وغیرہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے اور کوئی نہیں بستا۔ کوئی شہر و قریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔ علماء میں شیخ وجیہہ گجراتی، شیخ علی متقی، شیخ جلال تھانیسری، ملا محمود جونپوری، مولانا یعقوب کشمیری، ملا قطب الدین سہالوی، شیخ عبدالحق محدث، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا عبدالہداد جونپوری وغیرہم، اپنے وقتوں کے مالک اور علم و تعلم کے بادشاہ تھے۔ بایں ہمہ دوسرے دوسرے گوشوں اور کاموں میں وقت بسر کر گئے۔ اس راہ میں تو ایک قدم بھی نہ اٹھ سکا۔ شیخ عبدالحق محدثؒ کو تو حضرت مجدد کے بارے میں سخت لغزش بھی ہوئی۔ اگرچہ آخر عمر کے اعتراف و رجوع سے تلافی کر دی۔ اصحاب طریقت میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے عارف کامل خود دہلی میں بعہد اکبری مقیم رہے۔ لیکن وہ خود کہتے تھے کہ میں چراغ نہیں ہوں۔ چقماق ہوں آگ نکال دوں گا۔ چراغ شیخ احمد سرہندی ہے۔ جو حالت اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام کابل و ترکستان و خراسان کی ہو رہی تھی، ان سب کے سامنے تھی۔ سب اس پر آہ و فغاں بھی کرتے ہیں، مگر اس سے آگے معاملہ نہیں بڑھتا۔ ہندوستان میں سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ تمام عوام و خواص پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ بحدے کہ اس کے سوا علماً و عملاً کوئی بات مقبول نہیں۔ لیکن تصوف صالح کا جوہر پاک جہل و بدعت کی آمیزش سے یکسر مکدر ہو چکا تھا۔ بلکہ ایک طرح کی اباحتہ و مطلق العنانی تھی جس کو طریق باطن و اسرار سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ملک کا ملک شریعت و علوم شریعت سے بیگانہ محض اور اصل حقیقت یک قلم معدوم۔ صرف خانقاہوں اور سجادہ نشینی کے سلسلوں کے جال میں پوری اقلیم جکڑبند تھی۔ دوسری طرف عہد اکبری کی بدعات تخت و تاج حکومت کے زور سے ہر طرف پھیل چکی تھیں، اور علماءُ سوء و مشائخ دنیا پرست خود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۵) دوستوں کی محبت و ارادت سے ہمارے قلوب ہمیشہ معمور و آباد رہیں۔ اللھم ارزقنا حبك، وحب من یحبك، والعمل الذی یبلغنا حبك، واجعل حبك احب الینا من انفسنا واھلنا ومن الماء البارد!

ان کے احداث واشاعت کے نقیب تھے۔کون تھا کہ اس وقت امن وعافیت کے مدرسوں اور سلطانی وفرمانروائی کی خانقاہوں سے نکلتا اور دعوت واصلاح کی امتحان گاہوں میں قدم رکھتا؟ اور پھر نصرت الٰہی کے لشکروں اور نفوذ باطنی کے سامانوں سے ایسا مسلح ہوتا کہ نہ شہنشاہ ہند کا تاج وتخت اس کی راہ روک سکتا اور نہ وقت کی حکمرانی وفرمانروائی اس کے سلطان حق وسطوت الٰہی پر غالب آسکتی؟ خود حضرت موصوف ایک مکتوب میں اپنے فرزند کو لکھتے ہیں: "اے فرزند! ایں وقت آنست کہ درامم سابقہ دریں طور وقتی کہ پر از ظلمت ست، پیغمبر اولوالعزم مبعوث می گشت، وبنائے شریعت جدیدہ می کردہ۔ دریں امت کہ خیر الامم ست وپیغمبر ایشاں خاتم الرسل، علماء را مرتبۂ انبیاءؑ دادہ اند، واز وجود علماء بوجود انبیاءؑ کفایت فرمودہ اند۔ دریں وقت عالمے عارفے تام المعرفت ازیں امت درکار است کہ قائم مقام انبیاءؑ اولوالعزم باشد۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد!

کچھ شک نہیں کہ توفیق الٰہی نے حضرت ممدوح کے وجود گرامی ہی کے لئے یہ مرتبہ خاص کر دیا تھا۔ انبیاءؑ اولوالعزم کی نیابت وقائم مقامی یعنی مقام عزیمت دعوت کا خلعت صرف انہی کے جسم پر چست آیا۔ باقی جس قدر تھے یا تو مدرسوں میں پڑھاتے رہے یا موٹی موٹی کتابیں اور نئی نئی شرحیں اور حاشئے لکھتے رہے، یا پھر ان کی تضلیل وتکفیر کے فتوؤں پر دستخط کرتے رہے۔ وقت کا جو اصلی کام تھا اس کو کوئی ہاتھ نہ لگا سکا۔ دوسری جلد کے چوتھے مکتوب میں لکھتے ہیں: "از حق الیقین وعین الیقین چہ گوید؟ واگر گوید کہ فہم کند؟ ایں معاملات از حیطۂ ولایت بیرون است۔ ارباب ولایت بہ رنگ علماء ظواہر از ادراک عاجز اند۔ ایں کار مقتبس از مشکوٰۃ نبوت است کہ بعد از تجدید الف ثانی بہ تبعیت ووراثت تازہ گشتہ۔ صاحب ایں علوم ومعارف مجدد ست" الخ۔ یہ جو بار بار کہہ رہا ہوں کہ وقت کا سلطان اور خزینہ دار ایک ہی ہوتا ہے۔ خواہ کوئی ہو اور کیسا ہی ہو

مگر اس سے الگ رہ کر کچھ نہیں پا سکتا۔ تو یہ وہی حقیقت ہے جس کو بار بار حضرت ممدوح فرماتے رہے ہیں اور ان سے پہلے بھی تمام محرمانِ راہ نے اشارات کئے: "مجدد آنست کہ ہرچہ دراں مدت از فیوض بہ امت رسد، بتوسط او رسد۔ اگرچہ اقطاب و اوتاد آں وقت باشند"۔

خامش کند بندۂ مصلحت اندام را

پھر بارہویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور۔ علوم و معارف دیکھیے زمین بنجر ہو چلی تھی۔ پھر بھی کھیتوں کی سبزی اور چمنیوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام کار و بار علم و طریقت کے اکابر و اساتذہ اسی صدی میں سر برآوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسل درس و تدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں۔ جیسے خاندان مشہور فرنگی محل۔ اور ہندوستان سے باہر بلاد عربیہ و عثمانیہ میں اکثر مشاہیر علم و ارشاد، جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی النجدی، سید عبدالقادر کوکبانی، شیخ عمر فاسی تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسماعیل یمانی، شیخ عبدالخالق زبیدی، علامہ فلانی صاحب ایقاظ، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم کہ شاہراہ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے شناسا یا حق آگاہ تھے۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دورۂ آخر کے "فاتح" اور سلطان عصر ہونے کا مقام تھا اور قطبیت وقت کا، وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ (رضی اللہ عنہ) ہی کے لئے تھا۔ اور لوگ بھی بے کار نہ رہے۔ کام کرتے رہے۔ مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف یہیں کے لئے تھا:

فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را

تفہیمات میں اس معاملہ کے معارف لکھتے ہوئے کہیں تو اپنی طرف بیگانہ وار اشارہ کر جاتے ہیں۔ کہیں کہیں جوش قلبی کی بے اختیاریوں میں صاف صاف بھی لکھ گئے ہیں۔ اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں، "نعمتِ عظمٰی بریں ضعیف آنست کہ اورا خلعت فاتحیت دادند و فتح

دورۂ بازپسیں بر دستِ وے کردند"۔ تفہیمات میں لکھتے ہیں" بہ سرم درداوند کہ ایں خقیقت بمرومِ برسال۔ امروز وقت وقتِ تست، وزمان زمانِ تو۔ واے برکسے کہ زیر لوائے تو نہ باشند"۔ ایک اور تفہیم میں یہ کیفیت زیادہ سرمستی کے ساتھ کھلی ہے" فھمنی ربی انا جعلناك امام ھذہ الطریقۃ وسددنا طرق الوصول الی حقیقۃ القرب کلھا الیوم غیر طریقۃ واحدۃ وھو محبتك والانقیاد لك۔ فالسماء لیس علی من عاداك بسماء۔ ولیست الارض علیہ بارض فاھل الشرق والغرب کلھم رعیتك وانت سلطانھم علموا اولم یعلموا فان علموا فازوا وان جھلوا خابوا" ایک اور تفہیم میں لکھتے ہیں" ومن نعم اللہ علی ان اخبرنی او جعلنی ناطق ھذہ الدورۃ وحکیمھا، وقائد ھذہ الطبقۃ وزعیمھا۔ فنطق علی لسانی، ونفث فی نفسی فان نطقت باذکار القوم واشغالھم، نطقت بجوامعھا۔ وان تکلمت علی نسب القوم فیما بینھم و بین ربھم، رویت لی مناکبھا وقبضت علی جوامع خطابھا۔ وان خطبت باسرار اللطائف وغوامض الحقائق، تعوضت قاموسھا، وتلمست ناموسھا، وقبضت علی جلابیبھا واخذت تلابیبھا، وان بحثت عن علم الشرائع والنبوات، فانا لیث عرینھا، وحافظ جرینھا ووارث خزائنھا، وباحث مغانیھا۔ اتیتھم بعجائب لا تحصی، وغرائب لا اکتناھھا یرجی۔ شعر:

وکم للہ من لطف خفی

یدق خفاہ عن فھم الذکی

ایک اور موقع پر کہتے ہیں "لما تمت بی دورۃ الحکمۃ، البسنی اللہ تعالی خلعۃ المجددیۃ، فعلمت علم الجمع بین المختلفات" الخ۔ اس باب میں ان کے اشارات بیشمار ہیں۔ علی الخصوص تفہیمات ہیں کہ متعدد رسائل و مقالات اسی مقام کی شرح و تحقیق میں لکھے ہیں، اور ان سب کے آخر میں ذوقِ باطن کے التہاب و اضطراب سے بیخود ہو کر اپنے معاملات کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں۔ گویا ابوالعلا معری کا یہ شعر جابجا نئے نئے پیرایوں میں ان کی زبان مترنم اور کلکِ تحدیث تک آ آ کر رہ جاتا ہے:

وانی، وان کنت الاخیر زمانہ لات بما لم تستطعہ الاوائل

اور پھر چند قدم اور آگے بڑھو۔ مقام عزیمت و دعوت کی کیسی کامل اور آشکارا مثال سامنے آتی ہے۔ ساری مثالوں سے آنکھیں بند کر لو۔ صرف یہی ایک مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کے لئے کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل ہے؛ بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ و مجدد و شہید رضی اللہ عنہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا

می خواست گل ترنج زعالم برآورد … آں باغباں کہ تربیتِ ایں نہال کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔ حضرت پیر انصاری کا قول یاد رہے: "من مرید خرقانی ام لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود، باوجود پیریش مریدئ من می کرد"۔ شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عدم تحمل و استعداد سے مجبور ہو کر بحکم

بہ رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں … سر سبو بکشادند و در فرو بستند

دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دئے تھے، اب اس سلطان وقت و اسکندر عزم کی بدولت شاہجہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا، اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب برسر بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں، اور خونِ شہادت کے چھینٹے حرف و حکایات کو نقوش و سواد بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم … حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے؟ خود اسی خاندان عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذۂ علم و عمل موجود تھے؟ حضرت شاہ عبد العزیز کے درس و

تدریس کی پادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لئے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا؟ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لئے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔ دنیا اس کے لئے خلعتِ عظمت اور تشریف قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ امیدواروں پر امیدوار یکے بعد دیگرے گزرتے رہے۔ مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا:

بار غمِ او عرض بہر کس کہ نمودم　　　عاجز شد و ایں قرعہ بنامم زبر افتاد

تو یہ وہی حقیقت ہے جو کتنی دیر سے تمہارے ذہن نشین کر رہا ہوں۔ یعنی اس وادی کا مرد کار ہر صاحب علم و عمل نہیں ہو سکتا

مرد ایں رہ را نشانے دیگرست

استادی و شاگردی، نو عمری و کہولت، خانقاہوں کی دھوم دھام، اور مدرسوں کا ہنگامہ یہ ساری باتیں یہاں کے لئے بیکار ہیں۔ ان سارے عہدوں میں دیکھو۔ باعتبار علم و عمل ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود تھا، اور بقدرِ طاقت دعوت و تذکیر و ارشادِ خلق میں ساعی۔ تاہم دعوت دوسری چیز ہے اور عزیمتِ دعوت کا مقام دوسرا ہے۔ اس کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ گڑھیوں کا محاصرہ کر لینا آسان ہے۔ مگر قلعوں اور ملکوں کی تسخیر کی دھن دوسری ہے۔ ایک شخص کتنا ہی بڑا امیر الامراء ہو، لیکن پھر امیر ہے۔ پادشاہوں کا عزم اور محلِ شاہی میں پلے ہوؤں کا دماغ کہاں لا سکتا ہے؟

نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست　　　کلاہ داری و آئینِ سروری داند

بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سر و سامان و اسبابِ کار

فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سر و سامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے طیار کر لوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیئے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیئے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہو گئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیئے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ، درختوں کو دوڑنا چاہیئے۔ اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔ اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا کہ راہ صاف نہیں کرتے؟ وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے، اور زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا، بلکہ زمانہ آتا ہے اس کی جنبش لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لئے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھر لوں؟ وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کر دوں۔ اس کا مایۂ خمیر بخشش و نوال ہے، طلب و سوال نہیں۔ اس کی نظریں طاق کی بلندی نہیں ناپتیں۔ ہمیشہ اپنے ہاتھ کی رسائی اور قد کی بلندی دیکھتی رہتی ہیں۔ اس کا فغان عجز و نا امیدی یہ نہیں ہوتا

کمند کوتہ، و بازوئے سست، بام بلند
بہ من حوالہ، و نومیدیم گنہ گیرند

بلکہ ہمیشہ اس نشید کامرانی و رجزیۂ ملوکی سے غلغلہ انداز عالم و عالمیاں ہوتا ہے۔

کما قال القاضی السعید بن سناء الملک رحمتہ اللہ:

وانک عبدی یا زمان، واننی — علی الرغم منی أن أری لک سیدا
وما انا راض اننی واطئ الثری — ولی همة لا ترتضی الافق مقعدا
ولو علمت زهر النجوم مکانتی — لخرت جمیعًا نحو وجهی سجدا
أری الخلق دونی اذ أرانی فوقهم — ذکاء و علماً واعتلاء و سؤددا
ویأبی اباءی ان یرانی قاعدا؟ — وانی أری کل البریة مقعدا

ولو مد نحوی حادث الدهر کفه　　　لحدثت نفسی ان أمد له یدا

ستاروں سے تمام فضائے سمائی بھری پڑی ہے، لیکن مدار ستارے ہمیشہ طلوع نہیں ہوتے یہی حال اصحاب عزائم کا بھی ہے۔ وہ کائنات ہستی کا ایک بالکل الگ گوشہ ہے اور وہاں کے احکام وقوانین کو دنیا کے اعمال عادیہ پر قیاس کرنا غلطی ہے۔ ان کی توفیق الٰہی، ان کے وسائل غیر مختتم ان کی ترقیاں لازوال، اور ان کے تمام طریقے غیر مختتم ہوتے ہیں اللہ کی حکمت و ربوبیت ان کو تمام خلق اللہ میں سے چن لیتی اور "یختص برحمته من یشاء" اپنی رحمتوں اور ربوبیتوں کے عجائب وخوارق ان کے لئے مخصوص کر دیتی ہے۔ پھر ان کے معاملات میں نہ تو کسی دوسرے کا ساجھا ہوتا ہے، نہ کسی مدعی کی وہاں تک رسائی۔ اولائك قوم لما دعوا اجیبوا، ولما اجیبوا احبوا، ولما احبوا اخلصوا ولما اخلصوا استخلصوا، صدقت منهم الضمائر، فصفت منهم السرائر وصاروا صفوة اللّٰه فی ارضه، ففاضت علیهم انواره، وامتلأت قلوبهم من اسراره:

الا ان وادی الجزع اضحی ترابه　　　من المسك کافورا واعواده رندا

وما ذاك الا ان هند عشیه　　　تمشت وجرت فی جوانبه بردا

فلا تجهد نفسك فی کشف مراتبهم، وذوق حقائقهم، حتی تتصل منهم بسبب، وتمسك من هدیهم بطرف، فلسان حالهم ینشدك:

وکم سائل عن سر لیلی رددته　　　بعمیاء من لیلی بعین یقین

یقولون خبرنا فانت امینهم　　　وما انا ان خبرتهم بامین[1]

---

[1] اسکے بعد طول طویل چار فصلیں تھیں جن میں مقام مجددیہ وعزیمت دعوت کے تمام خصائص وآثار اور علائم ونتائج پر ایک اصولی بحث کی ہے۔ اور آخر میں لکھا ہے "یہ وہ معارف ہیں جن کی طرف فرداً فرداً اشارات تو سب نے کئے ہیں مگر شاید بطریق قواعد واصول وانضباط مبحث اور کہیں نہ پاؤ گے۔" چونکہ کتاب کی ضخامت بہت بڑھتی جاتی ہے اس لئے مجبوراً ان فصلوں کو الگ کر دیا۔ انشاء اللہ ایک مستقل رسالہ کی شکل میں عنقریب شائع کر دیا جائے گا۔ (پبلشر)

فصل

مقام "عزیمت دعوت" اور "احیاء و تجدید امت" کی نسبت یہ جو کچھ بلا قصد زبانِ قلم پر آ گیا، تو اگرچہ اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہ تھا، لیکن زیادہ تر یہ خیال باعث ہوا کہ شاید ان حالات و وقائع کا مطالعہ اصحاب صلاح و استعداد کے لئے کچھ سود مند علم و عمل ہو، اور بحکم "ان لم تبکوا فتباکوا" اور

فتشبھوا ان لم تکونوا مثلھم　　ان التشبہ بالکرام کرام

کسی کے قلب بصیرت و دیدۂ اعتبار کو ان مجددین ملت اور مصلحین حق کے اتباع و تشبہ کی توفیق ملے۔ شاید کوئی مرد کار اور صاحب عزم وقت کی پکار پر لبیک کہے اور زمانہ کی طلب و جستجو کا سراغ بنے۔ آج اگر کام ہے تو یہی کام ہے، اور ڈھونڈھ ہے تو صرف اسی کی وما ذالک علی اللہ بعزیز:

داویم نزاز گنج مقصود نشاں　　گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

یہ حکائتیں ان عہدوں کی تھیں جو موجودہ زمانہ کے مقابلہ ہیں گویا عہد اقبال تھے، موجودہ وقت اور اس کی تاریکیوں کو دیکھو، اور پھر ہر طرف روشنی اور روشنی دکھلانے والوں کی نایابی پر ماتم کرو۔ خدمتگزاروں کی پکار اور ہر طرف مزدوروں کی ڈھونڈھ ہے مگر مزدور کہیں نہیں ملتے۔ آج ایک مٹی کے ٹوکرے اور گری ہوئی دیوار پر ایک اینٹ رکھ دینے کے معاوضے میں اشرفیوں اور ہیروں کی قیمت مل رہی ہے۔ کیونکہ کام کرنے والے جتنے کم ہونگے، اتنی ہی کام کی مزدوری بھی بڑھ جائے گی۔ خزانۂ سعادت لٹنے کے لئے کھل چکا اور شرف و مراتب کا دروازہ ہر رہرو کیلئے باز۔ کون ہے جو اس کے خزانوں کو لوٹتا اور اس دولت و کامرانی سے مالا مال ہوتا ہے۔ جس کیلئے نہیں معلوم اچھے وقتوں میں کیسے کیسے ارباب طلب بیقراریوں کے آنسو بہا چکے ہیں اور آرزوؤں کے بھری ہوئی دعائیں مانگ چکے ہیں

فما لک والتردد حول نجد　　وقد غصت تھامۃ بالرجال

فصل

حضرت امام احمد بن حنبل کے تذکرہ میں ضمناً اُن احادیث کا ذکر آچکا ہے جن میں ظہور و عروجِ اسلام کی خبر دی گئی تھی۔ شاید کسی جگہ نقل کر چکا ہوں۔ "واللہ لیتمن ھذا الامر حتیٰ یسیر الراکب من صنعا الی حضرموت۔ لا یخاف الا اللہ۔ ولکنکم تستعجلون" خدا کی قسم دعوت اسلام کا جو کام شروع ہوا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ صنعائے یمن سے حضرموت تک ایک سوار چلا جائے گا اور امن و اسلام کے سوا راہ میں کچھ نہ پائے گا۔ اسی طرح حدیث حضرت عدی بن حاتمؓ "لتفتحن کنوز کسریٰ" ضرور ہے کہ عنقریب کسریٰ کے خزانے تمہارے لئے کھل جائیں گے۔

اس صادق و مصدوق کی زبان حق سے جس وقت یہ پیشین گوئی نکلی مسلمانوں کی بے کسی کا یہ حال تھا کہ خود ان کے وطن کے دروازے بھی ان پر بند تھے۔ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا نام سن کر کس قدر حیران و متعجب ہوئے ہوں گے؟ عدی بن حاتمؓ ضبط نہ کر سکے۔ حیران ہو کر پوچھا "کون کسریٰ؟ کسریٰ بن ہرمز شہنشاہ ایران؟" فرمایا "ہاں! وہی اور کون؟" "لئن طالت بک حیاۃ، لترین الرجل یخرج مل ء کفہ من ذھب یطلب من یقبلہ فلا یجد احدا"۔ یعنی اس پر تمہیں تعجب کیوں ہے؟ اگر تم زندہ رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ مسلمانوں کی دولت مندیوں کا یہ حال ہوگا کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا لے کر نکلے گا کہ کسی مسکین کو دیدے۔ مگر کوئی لینے والا نہ ملے گا۔ سب آسودہ حال ہوں گے۔ عدی کہتے ہیں۔ میں زندہ رہا اور پہلی بات آنکھوں سے دیکھ لی۔ "وکنت فی من افتح کنوز کسریٰ"۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے فتح ایران کے بعد کسریٰ کا خزانہ کھولا۔ رہی دوسری بات۔ یعنی قومی دولت کی اس قدر فراوانی کہ مسلمانوں کی آبادیوں میں صدقہ لینے والا مسکین نہ ملے

تو اگر تم زندہ رہے تو اسے بھی دیکھ لو گے۔ (رواہ البخاری) یہ تمام واقعات ہجرت سے پہلے کے ہیں۔ حرف بحرف سب پورے ہوئے اور سننے والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ فصلی اللہ علی الصادق المصدوق الذی لایخبر عن شی الاو یأتی مثل فلق الصبح!

آج اس تذکرہ کی بقیہ فصول لکھنے کے لئے بیٹھا تو یکایک خیال ہوا جس صادق و مصدوق نے اسلام کی پہلی غربت میں آنے والے اقبال و عروج کی یہ خبریں دی تھیں، اسی کی زبان حق نے عین غلبہ و ظہور کے وقت یہ بھی تو فرمادیا تھا، بدءَ(۱) الاسلام غریبا و سیعود کما بدءَ فطوبیٰ للغرباء یعنی اسلام کی ابتدا بے کسی اور پردیسی کی مصیبتوں میں ہوئی اور قریب ہے کہ پھر ویسی ہی حالت اس پر طاری ہو جائے۔ سو کیا ہی خوشی اور مبارکی ہے پردیسیوں کے لئے! یہ مسلم کے الفاظ ہیں بروایت ابوہریرہ۔ لیکن ترمذی میں بروایت عمرو بن عوف زیادہ تفصیل ہے "ان الدین بدءَ غریبا و سیعود غریبا کما بدءَ فطوبیٰ للغرباءِ ھم الذین یصلحون ما افسد الناس من بعدی من سنتی" دین کی ابتدا غربت سے ہوئی اور قریب ہے کہ پھر اسی کی طرف پلٹ آئے۔ پس کیا ہی مبارکی ہے پردیسیوں اور بے یاروں کے لئے! یہی لوگ ہیں جو ان خرابیوں کو دور کر دیں گے جو لوگوں نے میرے بعد میری سنت میں پیدا کر دی ہوں گی۔ اور احمد و طبرانی نے مرفوعاً روایت کی "طوبیٰ للغرباء قلنا وما الغرباء؟ قال قوم صالحون قلیل فی ناس سوء کثیر من یعصیھم اکثر ممن یطیعھم" یعنی فرمایا مبارکی ہے "غربا" کے لئے۔ ہم نے پوچھا "غربا" کون ہیں؟ کہا صالحون کی ایک جماعت۔ برے لوگوں میں تھوڑے سے اچھے۔

اس حدیث میں "غربۃ" اور "غریب" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں پردیسی اور بے خانہ و وطن کے۔ مقصود یہ ہے کہ اسلام کی ابتدا ہجرت کی مصیبتوں اور مظلومیوں سے ہوئی تھی۔ عروج و اقبال کے بعد پھر ویسا ہی زمانہ آنے والا ہے۔ اس وقت حق مغلوب

---

(۱) قال ملا علی القاری فی الازھار "بدا بلا ھمزۃ۔ ای ظھر" قال النواوی ضبطناہ بالھمزۃ "رفی شرح الطیبی "قال محی السنہ بدءَ بالھمزہ من الابتداء"

ہو جائے گا۔ لوگ قرآن وسنت کی راہ چھوڑ دیں گے۔ ظلم وفساد اور بدعات ومنکرات کا ہر طرف دور دورہ ہوگا۔ حق پر چلنے والے اور قرآن وسنت کی سچی اور خالص پیروی کرنے والے بوجہ قلت و بے چارگی کے ایسے ہو جائیں گے، جیسے پردیسی، بے یارو مددگار مسافر۔ سارا شہر خوشحالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہر شخص اپنے عیش کدۂ وطن میں آرام و راحت کے مزے لوٹ رہا ہے۔ مگر اس کے لئے نہ تو گھر ہے جہاں سر چھپائے۔ نہ کوئی عزیز آشنا ہے جسے درد دل سنائے۔ پرایا دیس اور پرائے لوگ۔ نہ یہ ان کی بولی جانے نہ وہ اس کی زبان سمجھیں۔ ایک ایک کا منہ تکتا ہے اور جی ہی جی میں رو دھو کے چپ ہو رہتا ہے۔

کس زبان مرا نمی فہمد ۔۔۔ بعزیزاں چہ التماس کنم؟

ہر لحاظ سے غربت و بے کسی ہوگی۔ ایک طرف تو یہ ہوگا کہ کفار کی بھیڑ ساری دنیا پر چھا جائے گی۔ ان کے مقابلے میں مسلمان پردیسیوں کی طرح اکے دکے نظر آئیں گے۔ دوسری طرف خود مسلمانوں کے اندر سچے حق پرستوں اور دین الخالص کے پیروؤں کی تعداد بہت تھوڑی رہ جائے گی۔ گویا ایک پورے شہر میں باہر کے چند مسافر۔ "قوم صالحون قلیل فی ناس سوء کثیر" غربۃ اولیٰ میں یہی حال غرباء اسلام کا تھا۔ پہلے حبش میں اور پھر مدینہ میں۔ بے چارگی کے بستر پر بے قراری کی کروٹیں بدلتے۔ حضرت ابوبکر کی زبان بخار کی شدت میں کھلتی تو پکارتے۔ بخاری میں بروایت حضرت عائشہ پڑھا ہوگا۔ وکان ابوبکر اذا اخذتہ الحمی یقول:

کل امرئ مصبح فی اھلہ ۔۔۔ والموت ادنیٰ من شراک نعلہ[1]

آنحضرت یہ حالت دیکھتے اور دعا فرماتے "اللھم حبب الینا المدینہ کحبنا مکہ" خدایا! یہ دیس ہمیں ایسا جی لگا دے کہ وطن بھول جائیں! طائف سے جب سرورعالم

[1] ہر آدمی کے لئے صبح اس کے گھر والوں میں ہوتی ہے۔ اور موت تو اس کے جوتیوں کے تسمے سے بھی قریب تر ہے۔

اس حالت میں لوٹے کہ قبیلہ ثقیف کی سنگ باری سے پیشانیٔ اقدس کا خون پائے مبارک کو رنگین کر رہا تھا تو بے اختیار یہ جملے زبان پر طاری ہو گئے "اللھم الیک اشکو ضعف قوتی وقلۃ حیلتی" خدایا! اور کس کے آگے کہوں؟ تیرے ہی سامنے بے چارگی کی فریاد ہے اور بے سروسامانی کا شکوہ!

تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

تو معلوم ہوا کہ ایسا ہی حال اس دوسری غربت میں بھی ہونے والا تھا جس کی اس حدیث میں خبر دی گئی[1] - اور اسی کا ارشاد تھا "ان ربی قال لی اذا قضیت قضاء فانہ لایرد انی اعطیتک لامتک ان لا اھلکھا بسنۃ عامۃ، وان لا اسلط علیھم عدوا من سوی انفسھم فیستبیح بیضتھم ولو اجتمع علیھم باقطارھا، حتی یکون بعضھم یھلک بعضا ویسبی بعضھم بعضا وانما اخاف علی امتی الائمۃ المضلین، واذا وضع السیف فی امتی لم یرفع عنھا الی یوم القیامۃ، ولا تقوم الساعۃ حتی یلحق قبائل من امتی بالمشرکین، وحتی تعبد قبائل من امتی الاوثان، وانہ سیکون فی امتی کذابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین، ولا تزال طائفۃ من امتی علی الحق (او قال ظاھرین علی الحق) لا یضرھم من خالفھم حتی یاتی امر اللہ" "بعضھم بعضا" تک مسلم نے ثوبان سے روایت کیا ہے - ورواہ ابوداؤد والبرقانی بتمامہ عن ابی اسماء عن ثوبان رضی اللہ عنہا یعنی میں نے اللہ سے اپنی امت کے لئے دعا

---

[1] یہ حدیث بھی منجملہ جوامع الکلم نبویہ کے ہے۔ جس طرح اس میں اوائل کا سارا حال کہہ دیا، اسی طرح اواخر کی بھی کوئی بات نہ چھوڑی۔ ان سطور کے لکھتے وقت خیالات میں بے اختیار جنبش ہوئی اور ایک مفصل شرح اس کی مرتب ہو گئی۔ حافظ ابن رجب نے بھی چند صفحوں میں ایک شرح لکھی تھی، لیکن اس میں صرف ایک ہی پہلو پر نظر ڈالی ہے، یہ شرح سو صفحوں سے زائد میں ختم ہوئی۔ شرح حال غربۃ ثانیہ، وتفصیل اسباب غربۃ، وبحث وتحقیق احادیث فتن کے باب میں انشاء اللہ جامع ونافع ہوگی۔ اگر اشاعت سے پہلے نظر ثانی کا موقع ملا تو بعض مطالب بڑھا دیئے جائیں گے جو بہ سبب عدم موجودگی کتب بالفعل سرانجام نہ پا سکے۔

کی تھی کہ خود ان کے سوا ان پر اور کوئی دشمن مسلط نہ ہو، اور کوئی ایسی عام ہلاکت نہ چھائے کہ قوم کی قوم ہلاک ہو جائے، تو اللہ نے فرمایا ایسا ہی ہوگا۔ تیری امت پر کبھی ایسی عام و ہمہ گیر ہلاکت نہ آئے گی، اور نہ کبھی ان پر کوئی دشمن اس طرح مسلط ہوگا کہ ان کی بیخ و بنیاد اکھاڑ ڈالے[1]۔ اِلّا یہ کہ وہ خود ہی اپنے دشمن ہوں گے اور خود ہی اپنے آپ کو دشمنوں کی طرح تباہ کریں گے۔ یعنی ایک گروہ ان میں سے دوسرے گروہ کو قتل کرے گا۔ (وذالك لكثرة اختلافهم وتفرقهم وتمذهبهم) اور آپ نے فرمایا۔ مجھ کو بڑا خوف گمراہ کرنے والے پیشواؤں سے ہے، اور جب ایک مرتبہ میری امت میں باہمی خونریزی شروع ہو گئی تو پھر قیامت تک نہ رکے گی۔ پھر فرمایا۔ ایسا ہوگا کہ میری امت میں سے کئی گروہ مشرکوں سے جا ملیں گے، اور ایسا ہوگا کہ کئی گروہ بتوں کو پوجیں گے۔ اور ضرور ہے کہ تیس جھوٹے

---

[1] اس حدیث میں اور نیز بعض دیگر روایات میں بھی "فیستبیح بیضتهم" کا لفظ آیا ہے یعنی مسلمانوں پر ان کی بدحالیوں کی وجہ سے دشمنوں کا تسلط اور غلبہ تو ہو جائے گا۔ مگر ایسی حالت کبھی نہ ہوگی جس پر "یستبیح بیضتهم" کا اطلاق ہو سکے۔ جوہری نے کہا "بیضة كل شئ حوزته وبيضة القوم ساحتهم" اور نووی نے لکھا ہے قیل بیضتهم معظمهم وجماعتهم وان قلوا پس "یستبیح بیضتهم" کے معنی یہ ہوئے کہ اگرچہ اس امت پر دشمنوں کا غلبہ و تسلط ہو جائے گا مگر ایسا تسلط کبھی نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی قومی ہستی بالکل مٹا دیں۔ اور دنیا میں ان کی قومیت کے نشوونما کے لئے کوئی بنیاد اور تخم باقی نہ رہے۔ چنانچہ اب تک جو کچھ ہو چکا ہے وہ اس وعدۂ الٰہی کی تصدیق کے لئے بس کرتا ہے۔ تاتاریوں کا حملہ یاجوج ماجوج کا فتنہ تھا "من كل حدب ينسلون" اور جو کچھ اس وقت تمام عالم اسلامی پر گذرا معلوم ہے۔ تاہم یہ تو نہ ہو سکا کہ "یستبیح بیضتهم" اٹھارہویں صدی عیسوی سے یورپ کے استیلاء و تسلط کا فتنہ شروع ہوا۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں۔ تاہم اب تک "یستبیح بیضتهم" کی قدرت دشمنانِ اسلام کو نہیں ملی ہے۔ اور اگر اللہ کا وعدہ سچا ہے تو کبھی نہیں ملے گی۔ تا آنکہ غربت ثانیہ کے بعد نشاۃ و غلبۂ ثانیہ کا وقت موعود آجائے، اور وہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہے کہ لیظهره على الدين كله ولو كره المشركون اور وہ آخری عہد سعادت کہ لایدری اولها خیر ام اخرها یعنی اس امت کی ابتدا اور انتہا، دونوں کی برکتوں اور کامرانیوں کا یہ حال ہے کہ نہیں کہا جا سکتا، اس کا اول زیادہ شاندار ہے یا آخر؟

کس نمی گوید م از منزلِ آخر خبرے ۔ صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش ست

مدعی نبوت کے پیدا ہوں، حالانکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ آخر میں فرمایا۔ بایں ہمہ ایک جماعت اس امت میں ہمیشہ حق پر باقی رہے گی۔ مخالفین حق اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ یہاں تک کہ امر الٰہی ظاہر ہو۔

اور اسی صادق مصدوق کا ارشاد ہے "لتتبعن سنن من کان قبلکم حذو القذۃ بالقذۃ (او حذو النعل بالنعل) حتی لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ قالوا الیہود و النصاریٰ؟ قال فمن؟" اخرجاہ عن ابی سعید۔ تم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں ضرور ہے کہ تم ان کے سارے طریقوں اور چالوں کی ہوبہو پیروی کرو۔ یعنی ان کی ساری گمراہیاں اختیار کر لو گے۔ صحابہ نے کہا۔ کیا یہود و نصاریٰ کی؟ فرمایا ہاں اور کون؟

اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں ہے "قالوا کما صنعت فارس والروم واھل الکتاب قال ابو ہریرہ "اقرؤا ان شئتم کالذین من قبلکم کانوا اشد منکم قوۃ" الخ یعنی صحابہ نے عرض کیا۔ کن پچھلی قوموں کی چال چلیں گے؛ فارس و روم اور اہل کتاب کی؛ فرمایا ہاں وہی لوگ ہیں اور کون؛ حضرت ابو ہریرہ نے اپنی عادت کے مطابق قرآن سے تطبیق دی' اور کہا۔ جی چاہے تو اس آیت کو اس موقعہ پر یاد کر لو: "وہ قومیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں اور بالآخر اپنی گمراہیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئیں، حالانکہ تم سے کہیں زیادہ طاقت ور اور متمدن تھیں۔" حاصل یہ کہ اس امت میں اہل کتاب کی مغضوبیت اور عجمی و رومی اقوام کے مہلک و گمراہ علوم و تمدن' دونوں کی نقالی اور پوری پوری ریس ہو گی۔ اور

---

* عن ابن عباس رضی فی ھذہ الایہ۔ قال ما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ، ھؤلاء بنو اسرائیل شبھنا بھم" وعن ابن مسعود رضی انہ قال "انتم اشبہ الامم بنی اسرائیل سمتا وھدیا تتبعون عملھم حذو القذۃ بالقذۃ غیر انی لا ادری اتعبدون العجل ام لا؟" وقال سفیان بن عیینہ من فسد من علمائنا ففیہ شبہ من الیہود، ومن فسد من عبادنا ففیہ شبہ من النصاریٰ"۔

اور یہ جو حضرت ابن مسعود نے فرمایا: یہودیوں کی ساری گمراہیاں اختیار کر لو گے۔ البتہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی طرح گوسالہ کی پوجا بھی تم میں ہو گی یا نہیں۔" تو افسوس کہ یہ بھی ہو چکا اور حذو النعل بالنعل کی پیشین گوئی ساری باتوں میں پوری ہوئی۔

مسلمانوں کے اندر ضلالت کی ان دونوں قسموں سے پوری مشابہت و مماثلت پیدا ہو جائے گی (تفصیل اس کی رسالہ شرح فتنتین عظیمتین میں دیکھنی چاہیئے)۔

اور اسی کا ارشاد تھا "فتنا کقطع اللیل المظلم، یصبح الرجل فیھا مومنا ویمسی کافرا (رواہ الترمذی وابوداؤد)۔ آخری زمانے میں فتنے ہیں ایسے جیسے اندھیری رات کی اندھیاری۔ صبح کو ایک آدمی مومن ہوگا، شام کو کافر" یعنی ایمان میں ثبات و استقامت باقی نہ رہے گی۔ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ۔ مسلم میں یہی حدیث بروایت ابوہریرہ ہے یمسی مومنا ویصبح کافراً۔ یبیع دینہ بعرض من الدنیا رات کو ایک آدمی مومن سوئے گا۔ صبح اٹھے گا تو کفر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اپنے دین کو دنیا کے بدلے بیچ ڈالے گا۔ "یبیع دینہ" نے یمسی مومنا ویصبح کافراً کے معنی بتلا دیئے۔

اور اسی صادق و مصدوق کا فرمان تھا "یوشک ان تتداعی علیکم کما تتداعی الاکلۃ الی قصعتھا۔ قال قائل من قلۃ نحن یومئذ؟ قال لا، بل انتم یومئذ کثیر ولکنکم غثاء کغثاء السیل، ولینزعن اللہ من صدور عدوکم المھابۃ منکم، ولیقذفن فی قلوبکم الوھن قیل وما الوھن؟ قال حب الدنیا وکراھۃ الموت" اخرجہ ابوداؤد۔ ایسا ہوگا کہ دنیا کی قومیں تم سے لڑنے کیلئے اکٹھی ہو جائیں گی، اور ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جیسے بھوکے ایک دوسرے کو کھانے پر بلاتے ہیں۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ یہ اس لئے ہوگا کہ ہم اس وقت تھوڑے ہوں گے اور دشمن بہت؟ فرمایا نہیں، مسلمان تو اس وقت بہت ہونگے مگر ایسے ہو جائیں گے جیسے دریا کے بہاؤ پر کا کوڑا کرکٹ۔ جس طرف بہ رہا ہے بہ جائے گا۔ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکل جائے گی تذھب ریحکم اور تمہارے دلوں میں "وھن" پیدا ہو جائے گا۔ کسی نے پوچھا "وھن" کیا ہے؟ فرمایا دنیا کا عشق اور راہِ حق میں موت کو ناخوش جاننا اور اس سے بھاگنا"۔

اور اسی نے یہ بھی فرمایا تھا "ان من کان قبلکم من اھل الکتاب افترقوا علی ثنتین وسبعین ملۃ، وان ھذہ الامۃ ستفترق علی ثلاث وسبعین فرقۃ" اخرجہ ابوداؤد والترمذی

یہود و نصاریٰ ٹوٹ پھوٹ کر بہتّر فرقے ہو گئے تھے۔ ضرور ہے کہ یہ امت بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تہتّر فرقوں میں بٹ جائے۔

اور اسی کا قول تھا "لایذھب اللیل والنھار حتی تعبد اللات والعزی قلت ان کنت لاظن حین انزل لیظھرہ علی الدین کلہ ان ذلک تام؟ قال انہ سیکون من ذلک ماشاء اللہ" اخرجہ مسلم او البخاری "قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ پھر لات اور عزیٰ کی پوجا ہو۔ حضرت عائشہ نے کہا جب یہ آیت اتری کہ لیظھرہ علی الدین کلہ (دین توحید اس لئے آیا تاکہ سارے دینوں پر غالب آئے)، تو میں نے خیال کیا تھا کہ اب دین توحید ہی آخر تک رہے گا۔ پھر یہ بات کیونکر ہوگی؟ فرمایا ہاں یہ رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔"

اور اسی نے یہ خبر بھی دے دی تھی۔ "اذا کانت امراؤکم خیارکم واغنیاؤکم سمحاؤکم، وامورکم شوری بینکم، فظھر الارض خیر لکم من بطنھا، واذا کانت امراؤکم شرارکم، اغنیاؤکم بخلاؤکم وامورکم الی نسائکم فبطن الارض خیر لکم من ظھرھا" رواہ الترمذی "جب تک تم میں سے بہتر اور نیک لوگ تمہارے امیر ہونگے، اور تمہارے مالدار سخی، اور تمہارے معاملات حکومت باہم مشورہ سے انجام پائینگے (یعنی عجمیوں کی سی شخصی حکومت و فرمانروائی نہ ہوگی۔ خلافت راشدہ کے منہاج نبوت پر حکومت شوریٰ ہوگی)، تو زمین کا ظاہر تمہارے لئے بہتر ہوگا اسکے باطن سے یعنی دنیا میں رہنا تمہارے لئے عزت و کامیابی کا موجب ہوگا۔ لیکن جب ایسا ہو کہ تمہارے امیر بدترین لوگ ہوں، تمہارے مالدار بخیل ہو جائیں اور تمہاری حکومت عورتوں کے اختیار میں چلی جائے، تو پھر زمین کا اندر تمہارے لئے زیادہ اچھا ہوگا بمقابلہ اس کی سطح کے۔" یعنی زندگی میں عزت باقی نہ رہے گی۔ مرجانا ہی بہتر ہوگا۔ وامورکم الی نسائکم سے یہ مقصود نہیں ہے کہ عورتیں بادشاہ ہوں، نہ یہ مقصد ہے کہ عورتوں کے مشورے سے کام انجام پائیں، بلکہ یہ اشارہ ہے شاہان نفس پرست اور امراء و عمال کی حرم سراؤں کی زندگی کی طرف۔ گویا سر رشتۂ حکومت مجلس شوریٰ اور اصحاب حل و عقد کی جگہ حرم سرا کے عشرت خانوں کے ہاتھ میں چلا جائیگا۔

عورتیں جس چال چاہیں گی چلائیں گی۔

اللہ پھر اسی لسان حق و صدق پر یہ پیشین گوئی بھی جاری ہوئی تھی کیف بکم اذا فسق فتیانکم وطغی نساؤکم؟ قالوا وان ذلک لکائن؟ قال نعم واشد۔ کیف انتم اذا لم تامروا بالمعروف ولم تنھوا عن المنکر؟ قالوا وان ذلک لکائن؟ قال نعم واشد۔ کیف انتم اذا امرتم بالمنکر ونھیتم عن المعروف؟ قالوا وان ذلک لکائن؟ قال نعم واشد۔ کیف انتم اذا رئیتم المعروف منکراً والمنکر معروفا؟ قالوا وان ذلک لکائن؟ قال نعم" اخرجہ...

کیا حال ہوگا تمہارا جب تمہارے نوجوان لڑکیاں بتلائے فسق ہوں اور تمہاری عورتیں سرکش؟ (یعنی جبکہ تمہارے گھر کے اندر کی زندگی بھی خراب ہو جائے اور عورتیں تک بتلائے فسق و فجور ہوں) لوگوں نے عرض کیا۔ کیا یہ بات بھی ہونے والی ہے؟ فرمایا ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ کیا حال ہوگا تمہارا جب تم بھلائی کا حکم نہ دو گے اور برائی سے نہ روکو گے۔ لوگوں نے کہا کیا ایسا بھی ہونے والا ہے؟ فرمایا۔ ہاں بلکہ اس سے بھی سخت۔ کیا حال ہوگا اس وقت جبکہ تم برائی کا حکم دو گے اور حق کو روکو گے؟ عرض کیا۔ کیا یہ بھی ہوگا؟ فرمایا ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیا حال ہوگا اس وقت جبکہ تم نیک بات کو برا سمجھو گے اور برائی کو اچھا۔ عرض کیا۔ کیا یہ بھی ہوگا؟ فرمایا ہاں: یعنی قوموں کی ہلاکت کے بتدریج تین درجے ہیں۔ ہر پچھلا درجہ پہلے سے اشد۔ پہلا یہ کہ خود تو نیکی کا شوق باقی ہو لیکن دوسروں کو نیک بنانے کا ولولہ جاتا رہے۔ یہ ہلاکت کا بیج ہے۔ اس کے بعد دوسرا دور آتا ہے۔ اب ایسا ہوتا ہے کہ نہ تو خود نیک راہ چلتے ہیں نہ دوسروں کو چلنے دیتے ہیں۔ اور حق کو علانیہ روکتے ہیں۔ یہ تخم فساد کے پھول پتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا دور آتا ہے۔ اب نیک و بد اور حق و باطل کا نظام بالکل الٹ جاتا ہے۔ باطل کو حق سمجھا جاتا ہے اور حق کو باطل۔ یہ تخم فساد کا آخری پھل ہے۔ اور اس کا زہر تمام قوم کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اور پھر بھی وہ لوٹ لوٹ کر آنے والی نحوستیں اور رہ رہ کر ابھرنے والی ہلاکتیں تھیں جن کی نسبت حضرت حذیفہ نے (کہ سب سے زیادہ فتنوں فسادوں کے جاننے والے تھے)

پوچھا تھا "کنا فی جاھلیة وشر فجاءنا اللہ بھذا الخیر، فھل بعد ھذا من شر؟" ہم جاہلیت کے شر میں مبتلا تھے۔ اللہ نے اسلام کی روشنی پھیلائی۔ پھر کیا اس خیر کے بعد بھی شر ہوگا؟ فرمایا ہاں مگر اس کے بعد خیر کا بھی ایک دور ہے، لیکن "فی دخن" یعنی میل خیر مثل خیر اول کے نہ ہوگا۔ کچھ کدورتیں بھی ملی ہوں گی۔ پوچھا وہ کدورت اور میل کیا ہے؟ فرمایا "قوم یستنون بغیر سنتی، ویھتدون بغیر ھدی، تعرف منھم وتنکر" میری سنت چھوڑ کر اوروں کے طور طریق پر چلیں گے۔ میری ہدایت سے ہٹ کر دوسروں کی چال اختیار کرلیں گے۔ کچھ باتیں ان کی اچھی پاؤ گے کچھ بری۔ پھر پوچھا اس خیر کے بعد بھی شر ہوگا؟ فرمایا۔ ہاں "دعاة علی ابواب جھنم" دوزخ کی طرف بلانے والے! آخر میں بتلایا کہ راہ سلامتی کی اس وقت یہ ہوگی کہ جماعت اور امام کا ساتھ دو۔ اور جب وہ وقت آجائے کہ جماعت بھی باقی نہ رہے اور مختلف فرقوں اور مذہبوں میں مسلمان بٹ جائیں تو "فاعتزل تلک الفرق کلھا ولو ان تعض باصل شجرة، حتی یدرکک الموت وانت علی ذلک" ان تمام فرقوں سے الگ ہوکر رہو (یعنی صرف دین خالص واول کے ہوکر رہو کہ اسلام ہے، اور تمام بناوٹی فرقوں اور مذہبوں میں سے کسی کو بھی اختیار نہ کرو، کیونکہ فرقہ بندی اور تمذہب وتعین خود سب سے بڑا شر اور سب سے اشد فتنہ ہے) اگرچہ ایسا کرنے میں تمہاری غربت اور بے کسی کا یہ حال ہو جائے کہ درخت کی جڑ چبا کر وقت کاٹنا پڑے، پھر بھی ان سے الگ ہی رہو۔ یہاں تک کہ موت آجائے" اخرجه الشیخان۔

اور یہی وہ آنے والے پے در پے فتنے تھے جن کا حال عبداللہ بن عمرو العاص خانہ کعبہ کے سایہ میں بیٹھ کر بیان کیا کرتے تھے۔ اور جن میں سے ہر پچھلا فتنہ پہلے فتنہ کو بھلا دینے والا تھا۔ "وان ھذہ امتکم جعل عافیتھا فی اولھا وسیصیب اخرھا بلاء وامور تنکرونھا، فتجئ فتنة فیزلق بعضھا بعضا، فیقول المؤمن ھذہ مھلکتی! ثم تنکشف وتجئ فتنة، فیقول المؤمن ھذہ ھذہ! اس امت کی ابتدا میں عافیت ہے اور آخری عہدوں میں مصیبتیں اور برائیاں ایسا ہوگا کہ ایک فتنہ آئے گا اور مومن کہے گا کہ اس میں میرے لئے ہلاکت ہے، لیکن جب

وہ دور ہو جائے گا اور دوسرا فتنہ شروع ہو گا تو پچھلے فتنے کو بھلا دیگا اور مومن پکار اٹھے گا کہ فتنہ تو یہ ہے! فتنہ تو یہ ہے! (یعنی پے در پے فتنے آئیں گے۔ ہر پچھلا فتنہ پہلے سے سخت و اشد ہو گا۔ یہاں تک کہ ان میں سے ہر فتنہ کو دیکھ کر ارباب حق و ایمان بول اٹھیں گے کہ سب سے بڑا فتنہ یہی ہے۔ حالانکہ پھر اس کے بعد وہ فتنہ آئے گا جس کا شر و فساد دیکھ کر پچھلے فتنے بھول جائیں گے!) رواہ مسلم

اور یقیناً ایسے ہی وقتوں کی نسبت وہ خبر بھی تھی جس کو حضرت امیر علیہ السلام اپنے یاروں کے سامنے بار بار فرمایا کرتے تھے، اور یہ کہہ کر اپنی روایت کی صداقت پر یقین دلاتے تھے واللہ لان اخر من السماء احب الی من ان اقول علیہ مالم یقل "قسم خدا کی! مجھے یہ پسند ہے کہ آسمان سے گرا دیا جاؤں لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ کے نام سے ایسی روایت کروں جو انہوں نے نہیں فرمائی!" انی سمعت یقول: سیخرج قوم فی آخر الزمان حدثاء الاسنان، سفہاء الاحلام، یقولون من خیر قول البریہ، یقرؤن القرآن لا یجاوز ایمانھم حناجرھم، یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیہ" یعنی آنحضرت نے فرمایا۔ آخری زمانے میں ایک قوم ظاہر ہو گی۔ نوخیز اور ناقص العقل لوگوں کی، بظاہر ان کی باتیں بڑے ہی اچھے لوگوں کی سی ہوں گی، قرآن پڑھیں گے مگر ایمان ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا۔ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار پر سے نکل جاتا ہے۔ یعنی گو اپنے تئیں مسلمان سمجھیں گے لیکن ان میں اسلام نہ ہو گا اخرجہ الشیخان والنسائی

کوئی وجہ نہیں کہ اس روایت کو صرف خوارج سے مخصوص کر دیا جائے، اور لفظ "آخر الزمان" کی تاویل کی جائے۔ صاف بات یہ ہے کہ اس میں آخری زمانے ہی کے مبتدعین و اہل ہوا کی نسبت خبر دی گئی ہے "سفہاء الاحلام" خاص طور پر اس لئے فرمایا کہ ان لوگوں کو اپنی عقل و رائے اور قیاس و درایت پر بڑا گھمنڈ ہو گا۔ کہیں گے کہ ہم عقلاء و حکماء کی سی باتیں کرتے ہیں "اعجاب کل ذی رای برایہ" ایسے ہی لوگوں میں پہلی بڑی جماعت خوارج کی بھی تھی جنہوں نے رائے کو دین میں دخل دیا، اور امام کی اطاعت سے باہر ہو گئے۔

اور اسی لئے حضرت امیر اور اکثر صحابہ انہی لوگوں کو اس کا مصداق اولیٰ سمجھتے تھے۔ مسلم کی حدیث زید بن وہب، اور صحیحین و ابو داؤد کی روایت ابو سعید و انس ہیں گو "آخر الزمان" کا لفظ نہیں ہے مگر حرف استقبال قرب و بعد دونوں پر حاوی، اور انبیائے کرام کے لئے سینکڑوں برس بعد ہونے والی باتیں بھی بوجۂ کمال یقین و مشاہدۂ معنوی ایسی ہوتی ہیں، جیسے ہمارے لئے صبح شام کی بات ان اللہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا و مغاربھا کے معاملات جہاں پیش آتے ہوں اور "انی وجد تھا قریبا ان انتم تجد ونھا بعیدا" جہاں کی صدائے علم ہو، وہاں کے لئے "سیکون" اور "کان" اور مستقبل و ماضی دونوں ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ قرب و بعد کا کیا سوال ہے، حتیٰ کہ بعض پیشین گوئیاں تو زبان نبوت پر بصیغۂ ماضی ہی واقع ہوئیں۔ مسلم کی روایت ابو ہریرہ میں عراق و شام کی نسبت فرمایا منعت العراق قفیزھا و منعت الشام مدیھا" عالم یقین و حقائق میں تفرقۂ ماضی و استقبال نہیں ہوتا۔ کیا نہیں دیکھتے کہ قرآن حکیم عالم آخرت و معاد کے معاملات ہر جگہ بصیغۂ ماضی بیان کرتا ہے۔ اور گو ساٹھ برس بعد بابل تباہ ہونے والا تھا مگر یرمیاہ نبی نے یہ نہیں کہا کہ ہو جائے گا، بلکہ کہا کہ ہو چکا اور "شہروں کی دلہن کی اوڑھنی اس کے سر سے چھین لی گئی"۔

بہر حال جس صادق و مصدوق نے فرمایا تھا کہ کسریٰ کے خزانے کھل گئے اور یمن سے حضرموت تک اسلام پھیل گیا، اور "واللہ لیتمن ھذا الامر و لکنکم تستعجلون" تو اسی نے یہ سب کچھ بھی فرما دیا تھا، بلکہ بقول حضرت حذیفہ کے ماترک من قائد فتنۃ الیٰ انقضاء الدنیا الا سماہ لنا باسمہ و اسم ابیہ کسی فتنے اور فتنہ انگیز کو نہ چھوڑا۔ سب کی ٹھیک ٹھیک خبریں دیں، سننے والے ہر آن اور ہر گھڑی ان وقتوں کی دہشت اور خوف سے مضطر اور اداس رہتے تھے۔ باہم کر ایک دوسرے سے پوچھا کرتے کہ وہ وقت تو نہیں آگیا، حضرت عمر حذیفہ سے بار بار کہتے۔ اس فتنہ کی بابت تو کہو التی تموج کموج البحر؟ اور پھر یہ سن کر مطمئن ہو جاتے کہ ابھی دیوار نہیں گری کہ خود انہی کا وجود تھا سو کیا مبارک،

وخوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے پہلی خبر کی تصدیق کی اور اس کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا دکنت فی من افتتح کنوز کسریٰ" اور کیسی بدنصیبی اور ہلاکی ہے ہمارے لئے کہ ان پچھلی خبروں کی تصدیق کرنے والوں میں اور ان کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھنے والوں میں سے ہیں۔ بلکہ خود ہمارا وجود ہی از سرتاپا ان خبروں کا ظہور اور ان میں سے ہر بات کی ٹھیک ٹھیک مجسم تصدیق ہے! حضرت عدی بن حاتم نے اول امت میں وعدہ کی تصدیق کی تھی۔ ہم آخر امت میں وعید کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کے حصے میں بشارتوں کا دیکھنا آیا تھا۔ ہمارے حصے میں نذارتوں کا۔ انہوں نے بھی تصدیق کی اور ہم نے بھی۔ انہوں نے پاکر۔ ہم نے سب کچھ کھو کر۔ فصدق اللّٰہ العلیم الحکیم، وصدق رسولہ الکریم، ونحن علیٰ ذالک من الشاھدین!

در مجلسے کہ یاراں شرب مدام کردند
چوں نوبتے بما شد آتش بجام کردند

فصل

ان ساری باتوں میں سے ایک ایک بات پوری ہو چکی "بدأ الاسلام غریبًا و سیعود کما بدأ" کا دور غربت کب کا شروع ہو چکا اور وہ سب کچھ ہو چکا جس کا حال اس حدیث کی شرح میں پڑھ چکے ہو۔ اب انتظار کرنے والوں کے لئے بجز انتظار غفلت کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ یہودیوں کی مغضوبیت، نصاریٰ کی ضلالت، مشرکین کی بت پرستی، ائمہ مضلین کی کثرت، دجاجلہ فتن و دعاۃ بدعت کا احاطہ، اقتدا بغیر سنت، اہتدا بغیر ہدی الانبیاء تفرق و تمذہب مثل یہود، اور غلو و اطرا مثل نصاریٰ، فتنۂ شبہات یونان، اور فتنۂ شہوات عجم فتنۂ تماثیل عبدۃ الاصنام، اور فتنۂ قبور عاکفین کنائس، ان میں سے کوئی نحوست اور بلا کی ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں پر نہ چھا چکی ہو، اور کوئی گمراہی نہیں جو اپنے کامل سے کامل اور شدید سے شدید درجہ تک اس امت میں بھی نہ پھیل چکی ہو۔ اہل کتاب نے گمراہی کے جتنے قدم اٹھائے تھے، گن گن کر مسلمانوں نے بھی وہ سب اٹھائے "حتیٰ کہ لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ" کا وقت بھی گذر چکا اور آج ہم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں، وہ وقت بھی کب کا آ چکا کہ "یلحق قبائل من امتی بالمشرکین" اور "حتی تعبد من امتی الاوثان" اور "حتی تعبد اللات والعزیٰ" ہماری جانیں اور ہماری روحیں اس صادق مصدوق پر قربان کہ واقعی اور سچ مچ مسلمان مشرکوں سے ملحق ہو گئے اور دین توحید کا دعویٰ کرنے والوں نے بت پرستی کی ساری ادائیں اور چالیں اختیار کر لیں، اور جس لات اور عزیٰ کی پوجا سے دنیا کو نجات دلائی گئی تھی، اسی کی پوجا پھر سے شروع ہو گئی! عدتم من حیث بدأتم! ہم اپنی آنکھوں سے ان فتنوں کو "کقطع اللیل المظلم" بھٹے دیکھ رہے ہیں۔ فی الحقیقت ایسا ہی ہو رہا ہے کہ رات کو ایک انسان ایمان لے کر سوتا ہے

اور صبح نہیں ہوتی مگر ایمان کھو چکا ہوتا ہے" یبیع دینه بعرض من الدنیا" حضرت حذیفہ نے ان فتنوں کا حال کہا تھا کہ "کالحصیر عوداً عوداً" مسلمانوں کے دلوں کے لئے فتنوں کی ایسی بھر مار ہوگی، جیسے چٹائی بنتے وقت ریشے پے در پے آتے ہیں۔ سو ان فتنوں کی بارش بھی ہر طرف ہو چکی اور ہو رہی ہے۔ وہ وقت بھی گذر چکا جب مومنوں کو کہنا تھا "هذه مهلكتي" اب تو وہ فتنہ درپیش ہے جس کے سامنے تمام پچھلے فتنے مات ہو گئے۔ "فیقول المومن هذه هذه" کا عالم ہو رہا ہے۔ وہ بھی تو کب کا ہو چکا کہ "تتداعی علیکم کما تتداعی الاکلة الی قصعتها" دنیا کی ساری قومیں اکٹھی ہو کر تم پر چڑھ دوڑیں گی۔ اور تم کو ہلاک کرنے کے لئے باہم ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جیسے بھوکے کھانے کی قاب پر ایک دوسرے کو دعوت دیں۔ تو کیا یہ پکار اب تک بلند نہیں ہوئی؟ اور کیا ایک قوم نے دوسری قوم کو بلانے کے لئے ٹھیک اسی طرح نہیں چیخا جس طرح بھوکے گدھ لاش دیکھ کر شور مچایا کرتے ہیں؟ ہماری ہزار جانیں اور لاکھوں روحیں اس زبان حق پر قربان جس نے فرمایا تھا "بل انتم یومئذ کثیر" تم اس وقت تعداد میں کم نہ ہو گے۔ لیکن "لیقذفن فی قلوبکم الوهن" تمہارے دلوں میں "وھن" پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کوڑے کرکٹ کی طرح بہہ جاؤ گے۔ پھر "وھن" کے معنی بتلائے "حب الدنیا وکراهة الموت" دنیا کی محبت اور عزت کی موت کو برا جاننا اور اس سے بھاگنا۔ اس ایک لفظ میں قوموں کی موت وحیات کا سارا بھید بتلا دیا! اور یقیناً یہی وہ وقت تھا کہ "بطن الارض خیر لکم من ظهرها" تمہارے لئے زمین کے اوپر سے اس کا اندر بہتر ہوگا۔ یعنی زمین کے اوپر تمہارے لئے عزت اور سعادت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے مرجانا جینے سے بہتر ہوگا۔ تو یہ بھی تو ہو چکا، اور اس طرح یقینی ہو چکا کہ اس سے زیادہ یقین نہ تو سورج کی روشنی میں ہے اور نہ چاند کے وجود میں۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ زمین کے کیڑوں کے لئے زندگی میں عیش اور جنگل کے درندوں کے لئے جینے میں راحت، مگر ایک مسلمان کے لئے اب زمین کی پیٹھ پر کوئی خوشی باقی نہ رہی۔ الا یہ کہ اپنی ذلتوں اور رسوائیوں کا بوجھ

اٹھائے اس کے نیچے چلا جائے!

نہ گلم نہ برگ سبزم، نہ درختِ سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت ما را؟

پھر کس قدر عقل سے کورے اور بصیرت سے محروم ہیں وہ بندگانِ غفلت جو ان روایتوں کو پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ کسی ایسے آنے والے زمانے کی نسبت ہیں جو قیامت سے چند برس پہلے دنیا پر آئے گا۔ اور ابھی اس کی آمد کا ہم کو صدیوں انتظار کرنا چاہیئے۔ اب تک نہ تو "یصبح مومنا ویمسی کافرا" ہوا ہے، اور نہ "حتی تعبد الاوثان"، اور نہ "حتی تعبد اللات والعزی"، اور نہ وہ وقت کہ "بطن الارض خیر لکم من ظھرھا"، تو کیا وہ کسی ایسے وقت کے منتظر ہیں جب صبح کو ایک شخص مومن ہوگا اور شام کے وقت اس کی پیشانی پر قلم اور سیاہی سے لکھا ہوگا کہ یہ کافر ہے؟ یا ایمان و کفر کی بھی الگ الگ صورتیں ہوتی ہیں کہ صبح کو مومن کی صورت ہوگی، شام کو کافر کی شکل؟ یا اس کے یہ معنی ہیں کہ صبح کو ایک شخص مومنوں کی بستی میں ہوگا، شام کو اس کا گھر یہودیوں کے محلے میں خود بخود اٹھ جائے گا؟ وہ خود سڑکوں اور گلیوں میں پکارتا ہوا دوڑیگا کہ میں یہودی ہوگیا، میں یہودی ہوگیا؟ اور کیا مشرکین سے "اتصال والحاق" کا وہ یہ مطلب سمجھے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کی جماعتیں مردم شماری کے کاغذات میں اپنا نام مشرکوں کے خانے میں لکھوا دیں گی یا خود اپنے منہ سے کہیں گی کہ ہم مشرک ہوگئے؟ اور کیا "تعبد الاوثان" کی پیشین گوئی کا اسی وقت ظہور ہوسکتا ہے جبکہ مسلمان کالی اور مہادیو کا بت اپنے ہاتھوں سے تراشیں مگر اس کی پوجا شروع کردیں؟ اور کیا اس کے سوا اور کوئی بات بت پرستی کی نہیں ہوسکتی؟ اور پھر کیا "تعبد اللات والعزی" کے ظہور کے لئے وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ جو ایام جاہلیت میں پتھر کی مورتیں تھیں جن کو اسلام نے ٹکڑے ٹکڑے کردیا تو اب پھر ان ٹکڑوں کو ڈھونڈھ کر مسلمان جمع کریں اور کعبہ کے طاقوں میں دھر کر ان کے آگے سجدے کرنے لگیں؟ اور جب تک اسی "لات و عزی" کی پوجا نہ ہوگی، اس وقت تک

یہ بات بھی پوری نہ ہوگی، تو اگر ان لوگوں نے ان خبروں کا یہی مطلب سمجھا ہے اور اسی انتظار میں ہیں، تو ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کا انتظار کبھی پورا نہ ہوگا۔ اور اگر کسی امت کی گمراہی اور بلا کی کا یہی مطلب ہے، اور موحدین کا شرک و بت پرستی میں پڑ جانا بغیر اس کے نہیں ہو سکتا، تو آج تک دنیا میں نہ تو کوئی امت ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہوئی، نہ یہود و نصاریٰ نے اس زمین پر کبھی شرک کیا، اور نہ ان تمام الزاموں میں سے ایک الزام بھی سچا ہے جو قرآن حکیم نے مشرکین جاہلیت اور یہود و نصاریٰ پر لگائے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر گمراہی اور عبادت اوثان و الحاق بالمشرکین و ترک حق و توحید بغیر ان باتوں کے نہیں ہو سکتی جن کا ان بندگان غفلت و اوہام کو انتظار ہے، اور انبیا کرام کی پیشین گوئیوں کے پورا ہونے کے یہی معنی ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں، تو آغاز خلقت عالم سے لے کر آج تک نہ تو کوئی امت گمراہی میں پڑی نہ کسی قوم نے کبھی توحید و ہدایت کو چھوڑا، نہ کسی رسول نے انسانوں پر ان کی گمراہی و شرک کے بارے میں سچا الزام لگایا، اور نہ آج تک کسی نبی کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ یہودیوں نے کب کہا تھا کہ ہم مشرک ہوگئے، اور خدا ایک نہیں ہے بلکہ پتھروں اور مورتوں کے اندر بہت سے ہیں؟ اور یہ کہ تورات نامی کتاب کو ہم نہیں مانتے؟ عیسائیوں نے کب اس کا اقرار کیا تھا کہ ہم موحد نہیں، اور کب فرشتوں نے ان کی پیشانیوں پر آگ اور خون کے حرفوں میں لکھ دیا تھا کہ یہ بت پرست دوزخی ہیں؟ اور کب انہوں نے شرک اس معنی میں کیا کہ کسی پتھر یا مورت کو کہہ دیا ہو کہ یہی خدا ہے؟ اور پھر خود مشرکین عرب نے بھی بجز لیقولن اللہ اور ھاؤلاء شفاؤنا اور ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ کے یہ کب کہا تھا کہ ان پتھروں کے اندر فاطر السموات والارض بیٹھا ہے؟ خود پتھر اور اس کی مورت کو تو کبھی کسی قوم نے الٰہ و معبود نہیں مانا۔ پوجا کی مورتیں بھی کسی نہ کسی انسان اور طاقت ہی کی ہوا کرتی تھیں۔ فمالھا ولاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا؟ سبحان اللہ! اس صادق و مصدوق کا ارشاد کس طرح حرف بحرف پورا ہو رہا ہے! یہ تربص جہل و انتظار غفلت بھی تو عین اسی پیشینگوئی کا ظہور ہے کہ لتتبعن سنن من کان قبلکم" اور "یاتی علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل

حذو النعل بالنعل " میری امت بھی وہ سب کچھ کرے گی جو یہودیوں نے کیا یہی تو پوری پوری یہودیت ہے کہ پیشین گوئیوں پر پیشین گوئیاں ظاہر اور پوری ہوتی جاتی تھیں مگر یہودیوں کا انتظار ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ کہتے تھے کہ ابھی وہ وقت کہاں آیا؟ حتیٰ کہ آج تک مسیح کے ظہور اور اسرائیل کی آخری بادشاہت کا انتظار کر رہے ہیں! فطال علیهم الامد فقست قلوبهم وکثیر منهم فاسقون!

اور یہ جو مسلم کی روایت حضرت عائشہ ہیں فرمایا "حتیٰ تعبد اللات والعزیٰ" یہاں تک کہ لات اور عزیٰ پھر پوجے جائیں۔ اور جس کے ظہور کے لئے لوگ کسی آنے والے وقت کا انتظار کر رہے ہیں، تو پہلے ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ "لات" اور "عزیٰ" عرب جاہلیت میں کون تھے؟ اور کیونکر ان کی پرستش ہوتی تھی؟ جو حال اس "لات وعزیٰ" کا تھا۔ وہی آخر امت کے "لات وعزیٰ" اور ان کے پرستاروں کا بھی ہوگا۔ امام ابن جریر نے مجاہد سے افرأیتم اللات والعزیٰ کی تفسیر میں روایت کی ہے "کان یلت لهم السویق فمات فعکفوا علی قبره" اور بخاری میں ابوالجوزا حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کان اللات یلت السویق للحاج" اور ایک دوسری روایت میں ہے "فیطعم من یمرمن الناس، فلمامات عبدوه وقالوا هو اللات" اور ابن خزیمہ نے کہا "وکذ العزیٰ" اور حافظ ابن قیم ہدی میں لکھتے ہیں "وکانت شجرة علیها بناء واستار بنخله بین مکه والطائف کانت قریش یعظمونها کما قال ابوسفیان یوم احد۔ لنا العزی ولاعزیٰ لکم" پس عرب جاہلیت کے "لات وعزیٰ" کی حقیقت یہ تھی۔ اور اسی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ آخری زمانے میں پھر ایسا ہی ہوگا۔ سو اگر آنکھیں باقی ہیں اور بصیرت معدوم نہیں ہوگئی تو دیکھ لو اس طرح کے "لات وعزیٰ" کی پرستش کب کی شروع ہو چکی ہے۔ بلکہ حدیث میں تو دو ہی نام آئے۔ اب تو گوشے گوشے میں لات وعزیٰ ہیں اور چپے چپے پر پرستش گاہیں۔ مسلمانوں کی کوئی بستی اور آبادی نہیں جو ان تمام پیشین گوئیوں کے ظہور ونمود کا مجسم نمونہ ہو اور پرستش ماسوی اللہ کی کوئی قسم ایسی نہیں جو پیٹ بھر کر انہوں نے نہ کر لی ہو اور نہ کر رہے ہوں۔ نفس

کو وہ پوج چکے، وہم و راہے کی وہ پرستش کر چکے، چاندی سونے کو انہوں نے پوجا، انسانوں کی چوکھٹوں کی دھول انہوں نے چاٹی، ہر پیشوا کو ارباب من دون اللہ انہوں نے بنایا، اور ہر بڑے انسان کے لئے ان کے دل اور پیشانی نے سجدے کئے۔ وہ شرک بھی جی بھر کر کر چکے جو اخفی من دبیب النمل" تھا، اور کھلا کھلا شرک بھی بر سر عام ہو چکا۔ حتیٰ کہ کفار و اعداء حق کی بھی پوجا ہر طرف ہوئی۔ بادشاہوں اور حکومتوں کے طواغیت بھی ہر جگہ پوجے گئے، اور مٹی اور پتھر کی پوجا کی منزل بھی کب کی گذر چکی فو اللہ انھم اتبعوا سنن من کان قبلھم، و سلکوا سبیلھم، حذو القذة بالقذة والنعل بالنعل، وغلب الشرك علی اکثر النفوس فصار المعروف منکراً والمنکر معروفا، والسنة بدعة والبدعة سنه، وطمست الاعلام، و اشتدت غربة الاسلام، وقل العلماء، وغلب السفھاء، وتفاقم الامر، واشتد الباس، وظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس۔ ولکن لاتزال طائفة من العصابة المحمدیه بالحق قائمین ولاھل الضلالة والبدع مجاھدین، ینفون عن دین اللہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین۔ لایضرھم من خالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم غالبون۔ اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون! کسے کہ محرم باد صباست می داند ۔۔۔ کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

فصل

استدارک

حضرت مولانا جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق چند باتیں رہ گئیں:۔

اس عہد کے حالات پڑھنے کے بعد الزام مہدویت کی حقیقت واضح ہو گئی ہوگی۔ اس الزام میں ان کے پیر حضرت شیخ داؤد بھی شریک تھے اور اس کا اصلی سبب وہی تھا جو بیان کیا جا چکا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی ظاہر ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر

علمائے دولت و مشائخ دنیا کا یہ حال تھا کہ صرف اپنی نفس پروریوں اور حکمرانیوں کی فکر رکھتے تھے۔ ہدایت وتذکیر امت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ولولہ باقی نہ رہا تھا۔ حضرت شیخ محمد جونپوری اور ان کے پیروؤں نے اپنی دعوت کی بنیاد اسی رکن اعظم شریعت کے احیاء پر رکھی، اور وقت کا مقتضیٰ دیکھ کر ساری طاقتیں اسی میں خرچ کر دیں۔ ان کے طریقہ کی پہلی شرط یہ تھی کہ جس حال میں ہو اور جہاں ہو، برائی کو روکو اور شریعت کے احکام کی تبلیغ کرو۔ چونکہ عام علماء کا حال اس سے بالکل برعکس تھا اس لئے رفتہ رفتہ یہ چیز مہدویت کی ایک بہت بڑی پہچان ہوگئی۔ جس کام کو سب نے چھوڑ رکھا ہو، ایک ہی جماعت کرنے لگے تو قدرتی طور پر وہ اس کی علامت اور خاصہ بن جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مصلحین حق کی اذیت ومخالفت کے لئے یہ معاملہ ایک بے خطا ہتھیار کا کام دینے لگا۔ جس عالم حق کو علمائے سوء نے اپنی ہوا پرستیوں کا مخالف اور دعوت حق میں مستعد پایا اور خلق اللہ کا رجوع دیکھا، جھٹ اس پر الزام لگا دیا کہ مہدوی ہے اور دلیل یہ پیش کر دی کہ اگر مہدوی نہ ہوتا تو اس سختی اور استقامت سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیوں کرتا؟ اور حق پرستی کی راہ میں فقر وفاقہ کیوں گوارا کر لیتا؟ ملا مبارک (پدر ابوالفضل وفیضی) پر جس قدر آفتیں لائی گئیں، بنیاد ان کی بھی یہی الزام مہدویت تھا، اور دلیل یہی بتلائی گئی تھی کہ دنیا پرستی اور حق فراموشی کے شیوہ میں علمائے دولت کا ہم آہنگ نہیں۔ امر بالمعروف و بےخوف و بے باک ہے۔ اس عہد کے اساتذہ علم میں سے ایک مشہور بزرگ میاں حاتم سنبھلی تھے اور علم وعمل میں استاد الاساتذہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ملا مبارک کا انکی مجلس میں ذکر آیا۔ میں نے ان کے علم وتقویٰ کی تعریف کی تو کہا۔ ہم نے بھی ایسا ہی سنا ہے مگر کہتے ہیں مہدویوں کا طریقہ رکھتا ہے۔ عرض کیا کہ بلاشبہ میر محمد کی بزرگی و ولایت کے معترف ہیں مگر ان کی مہدیت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ کہا۔ درکمالات میر چہ شک مت؟ اس پر سید محمد میر عدل[1] نے کہ مجلس میں حاضر تھے

---

[1] سید محمد امروہی میر عدل اس عہد کے ان مخصوص علمائے دولت میں سے ہیں جن کے ورع وتقویٰ اور شیوۂ حق پرستی پر ملا بدایونی تک شہادت دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ ان کا زمانہ میر عدلی عہد اکبری

پوچھا۔ ملا مبارک کو مہدوی کیوں کہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا "بتقریب امر بالمعروف و نہی عن المنکر" یہ سن کر میاں صاحب نے کہا۔ ایک دن میر عبدالحی[1] صدر جہاں خانخاناں کے سامنے ملا مبارک کی سخت مذمت کر رہے تھے۔ جانتے ہو اس کا سبب کیا تھا؟ سبب یہ تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۴

کا بہترین زمانہ احتساب شرح و عدالت تھا۔ ان کے بعد "میر عدل" کا عہدہ محض برائے نام رہ گیا۔ جب تک دربار میں ان کا اثر رہا نئے نئے مجتہدوں اور آزاد خیالوں کی ہوا نہ بندھ سکی۔ ۹۸۳ھ میں جب نکاح متعہ کو جائز کرنا چاہا تو میر کو بھکر بھیج دیا کہ ان کی موجودگی اس میں مخل تھی۔ شیخ ابراہیم سرہندی کہ نئی نئی تحقیقات میں ابوالفضل وغیرہ کے ہم زبان تھے، ایک مرتبہ ان کے ہاتھوں پٹتے پٹتے بچے۔ بدایونی سب سے بڑا کام ان کا یہ بتلاتے ہیں کہ قاضی القضاۃ عہد تک کو "خیانت و خباثت اور رشوت ستانیوں کی مہلت نہ دی۔ گویا یہ معاملہ قضاۃ کے لئے ایک معروف و مسلم معاملہ تھا!" "میر عدل" کے عہدہ سے مقصود صیغہ احتساب شرح کی افسری تھی (صفحہ ۷۵۔ جلد ۳ و ۲۱۔ جلد ۲)

[1] یہ وہی بزرگ ہیں جو کل ممالک محروسہ اکبری کی شیخ الاسلامی اور صدارت پر سرفراز ہوئے تھے۔ ابتدا میں دربار اکبری کی بدعات اور بے قاعدگیوں کے سخت مخالف رہے۔ جب علمائے دربار نے فتویٰ دیا کہ بادشاہ کو سجدہ کرنا جائز ہے تو پوری طرح مخالفت کی، لیکن جب دیکھا کہ حمام میں سبھی ننگے ہیں تو خود بھی کپڑے اتار دئے۔ بدایونی لکھتے ہیں اب مفتی کل بھی سجدہ طاعت بجا لاکر مقربان خاص میں داخل ہو گئے ہیں۔ پھر ۹۹۰ھ کے حالات میں لکھتے ہیں۔ مفتی ممالک محروسہ کو دیکھا سرتاپا ریشمی کپڑوں میں ملبوس۔ پرسیدم مگر روایتے دریں باب بنظر آمدہ؟ شاید کوئی روایت اس کے جواز میں بھی نکل آئی ہے؟ (کیونکہ وہاں تو نئے نئے فتوؤں کے لئے روز روائتیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ نکالی جاتی تھیں) فرمایا۔ ہاں جہاں لباس حریر عام ہو گیا ہو وہاں مضائقہ نہیں۔ گویا یہ بھی مایعم بہ البلوی میں داخل ہے! اسی سن کے وقائع میں لکھتے ہیں۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا کہ جشن نوروزی میں علماء، صلحا، قاضی، مفتی، سب وادی قدح نوشی میں آ گئے۔ بھر بھر کے جام اٹھاتے اور یہ کہہ کر تلچھٹ تک صاف کر جاتے کہ "بہ کوری فقہا مے خوریم"

محتسبت خبر ز عالم بے ہوشی آورد   اہل صلاح را بقدح نوشی آورد

ان حالات کے ساتھ کیا ممکن تھا کہ اکبر کو اہل مذہب سے حسن ظن باقی رہتا؟ اور وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوتا رہا؟ سیرت حضرت مجدد میں ان معاملات کی تفصیل ملے گی۔ اور بدایونی جلد ۲۔ صفحہ ۳۰۴۔ وغیرہا۔

کہ ملا مبارک نے ان کے نام ایک خط لکھا تھا۔ اس میں ترک حضور جماعت مسجد پر ملامت کی تھی۔ یہ بات ان پر سخت گراں گذری اور اس کو مہدویت پر محمول کیا۔ میر محمد نے کہا یہ استدلال تو اس مقدمہ پر مبنی ہے کہ شیخ امر بالمعروف کرتا ہے، اور جو شخص امر بالمعروف کرے مہدوی ہے۔ پس شیخ مہدوی ہے۔ اور معلوم ہے کہ اس کا کبریٰ ہی ممنوع ہے۔ تا بہ نتیجہ چہ رسد؟ (۳۔ صفحہ ۶۸)

اس عہد کے بہت سے واقعات ایسے ہیں، جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ گمراہی و غفلت کی انتہا ہے کہ شیوۂ حق و صدق پر چلنا گمراہی کی علامت سمجھی جائے۔ اور غفلت و ہوا پرستی نیکی و صداقت کی دلیل ہو۔ عجب نہیں کہ حضرت شیخ محمد داؤد اور شیخ جمال الدین پر بھی مہدویت کا الزام اسی بنا پر لگایا گیا ہو

حسد تہمت آزادی سروم بگداخت کین مرادیست کہ بر تہمت آں ہم حسد ست

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں تیغ بے نیام تھے۔ ان کی زندگی لا یخافون لومۃ لائم کی کامل تصویر تھی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں کسی عالم حق کے مہدوی ہونے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہو سکتی تھی؟ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ایک اشارہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ "شیخ قطب عالم می گفت کہ چوں بملازمت او رسیدم، بجہت غلبۂ طریقۂ وعظ و نصیحت بخاطر خطور کرد کہ مگر شیخ طریقۂ مہدویہ دارد۔ بمجرد ایں خطور بے سابقۂ تقریبی سر بر آوردہ و فرمود۔ مہدویہ فرقۂ ضالہ اند" (اخبار الاخیار۔ صفحہ ۱۹۹)

اصل یہ ہے کہ علمائے دنیا کو فقرائے حق کی اذیت و مخالفت کیلئے ہر عہد میں کسی نہ کسی آلۂ تضلیل و حیلۂ قتل کی تلاش رہتی ہے اور وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکال ہی لیتے ہیں۔ پھر جہاں کسی کو راہ حق و اصلاح میں سرگرم اور اپنی نفس پرستیوں کی راہ میں مخل دیکھا۔ جھٹ وہی الزام اس کے سر تھوپ دیا اور عوام و حکومت، دونوں کا فتنہ اس کے پیچھے لگا دیا۔ ہر زمانے کے حالات اور عوام کے میلان و اعتقاد کے مطابق یہ آلہ بھی ڈھلتا رہا ہے، اور گو ہتھیار بدلتے رہے لیکن کاٹ سب کی یکساں رہی۔[1]

---

[1] صرف ہندوستان ہی کی تاریخ دیکھ لی جائے۔ اوائل شیوع اسلام سے آخر تک کوئی اہل حق ان فتنوں

اس زمانے کے الزام مہدویت کا اندازہ تم اپنے زمانے کے بعض نام نہاد اور خود ساختہ مذہبی الزاموں سے کر سکتے ہو۔ گذشتہ نصف صدی میں علمأ سوء و دجاجلۂ آخر الزمان نے ان الزاموں کے ذریعہ کیسے کیسے مظالم و شدائد مصلحین امت و متبعین کتاب و سنت و داعیان دین الخالص پر نہیں کئے ہیں اور اس دنیا کی کونسی مصیبت ہے جو ان پر نہیں لائی گئی ہے؟ اب تو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۶

سے نہ بچا۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری، شیخ الاسلام ملتانی، خواجہ بختیار کاکی، خواجہ نظام الدین اولیاء رضی اللہ عنہم، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جن کو وقت کے فقیہوں اور قاضیوں نے چین سے بیٹھنے دیا ہو۔ کسی پر کوئی الزام لگا یا کسی پر کوئی الزام۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے عہد کے شیخ الاسلام نے جب دیکھا کہ کچھ نہیں چلتی اور خلق اللہ پروانہ ہو رہی ہے تو ایک فاحشہ عورت کو پانچسو دینار کی لالچ دلا کر آمادہ کیا کہ بر سر دربار خواجہ صاحب پر زنا کا الزام لگائے۔ لیکن جب موقعہ آیا تو ان کی ہیبت حق نے مہلت نہ دی اور خود اس عورت ہی نے اصلی واقعہ ظاہر کر دیا۔ بڑی جلن ان لوگوں کو اس بات کی ہوتی ہے کہ ہم شریعت کے مالک ہیں۔ جب تک مسئلہ نہ بتلائیں نہ کسی کا غسل ٹھیک ہو اور نہ وضو۔ پھر کیا ہے کہ دنیا ہمیں چھوڑ کر دوسروں کی طرف جاتی ہے؟ ہم نے بھیک کی روٹیاں کھا کر دنیا جہان کی کتابیں چاٹ لیں لیکن پھر وہی ملا کے ملا۔ شیخ الاسلام اور قاضی القضاۃ بھی ہو گئے تو کیا ہوا؟ لوگ سہم کر ڈرنے لگے مگر دلوں کی عقیدت و ارادت تو نہ ملی؟ یہ کیا اندھیر ہے کہ ایک فقیر بے نوا پھٹی کملی اوڑھ کر کسی کھنڈر میں بیٹھ جاتا ہے۔ ہدایہ کی چار سطریں سامنے رکھ دیں تو ہوش و حواس گم ہو جائیں۔ قدوری اور کنز بھی پوری نہیں پڑھی۔ اس پر عالمگیریوں اور جہاں ستانیوں کا یہ عالم کہ لاکھوں دلوں کا مالک! آبادیوں کی آبادیاں ہیں کہ سمٹی چلی آرہی ہیں۔ افسوس ان بندگان نفس کو کون سمجھائے کہ کارخانۂ الٰہی کے تعزز و تذلل کا صرف وہی قانون نہیں ہے جو تم نے مولویت و مشیخت کی مسندوں پر بیٹھ کر سمجھ رکھا ہے۔ مدرسوں کی دماغ سوختگیوں کے علاوہ بھی کچھ کرنے کے کام ہیں، اور شاید سارا دار و مدار انہیں پر ہے۔ اصلی طاقت عمل کی ہے نہ کہ مجرد علم کی۔ ابن ماجہ کی روایت یاد آگئی۔ "قلوبھم مفاتیح الھدیٰ۔ یخرجون من کل غبراء مظلمۃ"

زبندگی بنشینی بہ تخت سلطانی | اگر تو خدمت محمود چوں ایاز کنی
زناز کی نہ بروپے بمنزل مقصود | مگر طریق رہش از سر نیاز کنی
اگر بناز بماند، مرو کہ آخرکار | بصد نیاز بخواند ترا و ناز کنی

یہ فتنہ کچھ کچھ دب چلا ہے، لیکن گذشتہ ساٹھ ستر برس کے اندر نہ صرف ہندوستان بلکہ اکثر بلاد اسلامیہ میں جو حالت رہ چکی ہے، افسوس کہ تاریخ کا قلم اب تک اس سے آشنا نہ ہوا۔ ورنہ شاید پچھلے عہد فتن و مظالم کی کتنی ہی سرگذشتیں اس کے سامنے ہیچ نظر آتیں۔ اس فتنہ نے حق کی پامالی اور صلحائے امت کے قتل و غارت کے سارے ہتھیار اکٹھے کر دئے تھے۔ جہاں کسی کو کتاب و سنت کا داعی اور بدعات و منکرات سے کنارہ کش دیکھا جھٹ کہہ دیا کہ منہم۔ پھر مجرد اس الزام کے گویا اس بدنصیب کا خون مسلمانوں پر حلال ہو گیا۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو مسلمانوں کی بستیوں میں امن مل سکتا ہے لیکن اس بدبخت کے لئے کہیں پناہ نہیں۔ گھر سے بے گھر ان کو ہونا پڑا، مردود و مطعون خلائق وہ بنے، خدا کی عبادت گاہوں کے دروازے ان پر بند کئے گئے، کفر کے فتوؤں کا بے خطا ہتھیار ان کے لئے حرکت میں آیا، حکومت وقت کو ان کے خلاف بھڑکایا گیا۔ کفار نے نہیں، خود مسلمانوں نے ان کے خلاف سازشیں کیں۔ بغاوت کا الزام لگا کر کسی کی جان پھانسی کے تختے پر لی گئی، اور کسی کو مدت العمر کے لئے کالے پانی بھجوا کر مسلمانوں نے جشن کئے۔ حتیٰ کہ جن مظلوموں نے جوار بیت اللہ و بیت الرسول کو من دخلہ کان آمنا سمجھ کر کفر زار ہند سے ہجرت کی۔ انکو وہاں بھی پناہ نہ ملی۔ کبوتروں کے غول مسجد حرام میں بے غم اڑتے ہیں اور جانوران صحرائی کو اس دار الامن نے شکاریوں کی صید افگنیوں سے محفوظ کر دیا ہے۔ مگر افسوس کہ عشاق کتاب و سنت کے لئے وہاں بھی امن نہ تھا۔ وہی خود ساختہ مذہبی الزام ان پر لگایا گیا۔ عین جوار حرم میں کسی مہاجر الی اللہ کے تازیانے لگائے گئے، کسی کو قید کیا گیا، کسی کا تمام مال و متاع مسلمانوں کے لئے مباح کر دیا گیا۔ جن لوگوں نے کفر و ظلم کی آبادیوں سے نکل کر اللہ کے گھر میں پناہ لی تھی، ان کو وہاں سے بھی نکالا گیا:

درون خانہ چشم تو مرد ماں ہستند — کہ درمیان حرم مے زنند قافلہ را

اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ قرآن کے چاکر اور رسول و سنت رسول کے شیفتہ ہیں،

تمنت سلیمی ان نموت بحبها — واھون شیئ عندنا ما تمنت!

فصل

تذکرۃ الواصلین میں لکھا ہے کہ مولانا جمال الدین علم و طریقت اور ظاہر و باطن کے جامع تھے تمام علوم و فنون کے درس و تدریس میں استاد وقت تسلیم کئے گئے۔ علی الخصوص علم حدیث کے درس و اشاعت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ دہلی میں اس وقت صرف وہی ایک بزرگ تھے جن کے یہاں محدثین کے طرز پر[1] کتب صحاح کی تعلیم ہوتی تھی۔ طلباء دوسری جگہوں سے فراغت حاصل کر کے ان کی خدمت میں پہنچتے اور علم حدیث میں استفادہ کرتے۔ اس امر کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ مولانا ممدوح شیخ رفیع الدین سلامی شاگرد حافظ سخاوی کے شاگرد تھے، اور شیخ موصوف پہلے شخص ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان میں علم حدیث کے درس و نظر کا چرچا پھیلا۔

ہندوستان میں اسلامی علوم مغلوں کی حکومت کے ساتھ آئے۔ مغلوں کا وجود ہی اسلامی تنزل کی پیداوار تھا۔ اس لئے گویا یہاں علوم اسلامیہ کے درس و تدریس کی بنیاد ہی تنزل سے پڑی۔ اکبر کے عہد سے پہلے تک تعلیم زیادہ تر فقہ و اصول میں محدود تھی۔ ان وقتوں کے فقہی مناظرات، وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پیمانہ بھی چنداں بلند و وسیع نہ تھا۔ اسی اثناء میں علامہ تفتازانی کی درسیات کی عام مقبولیت و اشاعت کی ہوا چلی، اور ہندوستان میں بھی گھر گھر پھیل گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے پہلے مفتاح سکاکی بلاغت میں اور اصول بزدوی وغیرہ اصول میں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں۔ اب وہ بھی چھٹ گئیں۔ سارا دار و مدار علامہ موصوف کے مختصرات و شروح پر آکر رہ گیا۔ علامہ تفتازانی کی درسیات کی مقبولیت علوم درسیۂ اسلامیہ کے تنزل کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ پھر اکبر کے عہد میں ایران و ولایت سے معقولات کا نیا سیلاب

---

[1] اصل عبارت میں "بہ رنگ محدثین" ہے۔ یعنی اس عہد کے عامۂ علما اور فقہا کے طریقہ پر نہیں۔

اٹھا۔ میرزا فتح اللہ شیرازی وغیرہ نئے نئے حاشئے اور شرحیں لائے۔ میرزا جان وغیرہ کی کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ یہ لوگ امارت و وزارت کی حکمرانیاں بھی رکھتے تھے۔ وقت کا دربار مذہبی چیزوں سے بے میل تھا۔ اس لئے معقولات کی گرم بازاری کے سامنے فقہ و اصول کی بھی نہ چل سکی۔ اور رفتہ رفتہ درسیات نے وہ شکل اختیار کرلی جو اب درس نظامیہ کے نام سے تمام ملک میں رائج ہے اور جس کا غالب حصہ معقولات پر اور وہ بھی بطریق قدما نہیں بلکہ متون و شروح و حواشی متاخرین پر مشتمل ہے۔

لیکن اس عام حالت میں کبھی کبھی مستثنیات کے فلتات تبدیلی بھی پیدا کردیتے تھے۔ شیخ رفیع الدین سلامی لودھیوں کے زمانے میں ہندوستان آئے اور علامہ دوانی کی مصنفات کے ساتھ علم حدیث کا ذوق بھی اپنے ساتھ لائے۔ انہی کے شاگرد مولانا جمال الدین بھی تھے۔ ان بزرگوں نے علم حدیث کا ذوق علمائے ہند میں پیدا کیا۔ مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی۔ اور ان کی تدریس و تصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں قائم کردیا۔ ایسی ہی مستثنیٰ حالت ہندوستان کے ساحلی مقامات کی بھی رہی ہے۔ مثلاً گجرات وغیرہ جہاں شیخ علی متقی اور شیخ عبدالوہاب اور شیخ طاہر وغیرہ اصحاب حدیث پیدا ہوئے۔ شیخ عبدالحق انہی بزرگوں سے فیض یاب ہوئے تھے۔

مولانا جمال الدین کے ذوق حدیث کی نسبت ابتدا میں جو کچھ معلوم ہوا، اس کی بنیاد صرف تذکرۃ الواصلین اور والد مرحوم کا رسالہ تھا۔ لیکن اب منتخب التواریخ میں ان کے حالات دیکھے تو پوری طرح اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ ملا بدایونی نے ایک خاص باب میں صرف ان اکابر عہد کا ذکر کیا ہے جن سے وہ مل سکے ہیں اور تلمذ و اجازت حاصل کی ہے۔ اسی باب میں مولانا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"علم حدیث را خوب ورزیدہ۔ در صحبت اہل فقر و فنا رسیدہ۔ مدت مدید ست کہ لذت آں وادی دریافتہ۔ و توفیق استقامت و استدامت براں رفیق او گشتہ۔ با اہل دنیا کا رے

ندارد۔ وبافائدہ وافاضۂ طلاب علم مشغول ست۔" (جلد ۳۔ صفحہ ۱۱۳)۔

یہ شہادت دیکھ کر طبیعت کو نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرور قلب وکیف دماغ کا باعث ہوا کہ الحمدللہ علم حدیث وسنت کی خدمت وچاکری کی سعادت سے ہمیشہ یہ خاندان ممتاز رہا ہے، اور "برنگ محدثین" "ذوق سنت اور" بااہل دنیا کارے نہ داشتن" کی دولت ابتدا ہی سے ہم خاک نشینان فقر ونامرادی کے حصے میں آئی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ بادۂ کہن وقت کی خمار آلودگیوں کے علی الرغم پھر جام ومینا کی گردش تک پہنچے، اور یہ سرمستی پارینہ داروئے تازہ سے ترکیب پاکر ہنگامہ گذشتہ اور شورش رفتہ کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کا عالم پھر از سرنو تازہ کردے:

بہ بدمستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی

ہنوز از بادۂ پارینہ ام پیمانہ بو دارد

سبحان اللہ، عالم فقر ونامرادی کی عظمتیں، اور بوریائے استغنا وقناعت کی شہنشاہیاں اگر مولانا موصوف کے حالات میں ہم پڑھتے کہ وقت کے خانخاناں اور امیر الامرا تھے بلکہ تاج وتخت کے مالک اور ملکوں کے حکمران تھے، جب بھی یہ کیفیت وسرور کب حاصل ہوتا جو اس ایک جملہ میں موجود ہے کہ "بااہل دنیا کارے ندارد!" ان کی دنیوی عظمتوں کی نامہ نگاری میں اگر پوری آئین اکبری اور اکبرنامہ بھی مل جاتا، تو وہ بھی اس ایک شہادت کے آگے ہیچ تھا۔ دنیا بازی وحکومت پرستی کی ایک ایسی عالم آشوبی میں جیسی، کہ ان کے عہد میں تھی۔ اگر "بااہل دنیا کارے نہ داشتن" کا معاملہ رکھتے تھے، تو صرف اس واقعہ کی یاد ہی ہماری سرگرانیوں کے لئے کفایت کرتی ہے۔ زمانہ کی ساری ناموافقتوں اور بے مہریوں کے ساتھ بھی ایک بدمست زندگی بسر کردینے کے لئے اس جام کہنۂ استغنا کا ایک جرعۂ عالم فراموش کافی ہے:

هنيأ لارباب النعيم نعيمهم! وللعاشق المسكين مايتجرع

دوسری شہادت حضرت شاہ عبدالحق محدث کی ہے کہ ان کے معاصر ہیں اور ان کی

زندگی ہی میں لکھ رہے ہیں:

"جامع میان علم شریعت وطریقت۔ از اول فطرت بر نشاۃ عبادت وتقویٰ وصلاح بر آمدہ، وبر عصمت ذاتی نشو ونما یافتہ۔ بعد تحصیل علم دینی بہ تہذیب اخلاق وتبدیل صفات موفق شد۔ الحق دریں زمان در زمرۂ علما وفضلا ایں چنیں مردم در سلوک ایں طریق ورسوخ قدم در اتباع سنت حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نادر وعزیز الوجود اند۔"[1]

حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دور علم وتعلم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں کہ ملک کی عام زبان تھی، تصنیف وتراجم کی بنیاد ڈالی۔ خود شاہ صاحب نے مشکاۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے صاحبزادہ شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا۔ لیکن تذکرۃ الواصلین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ بھی مولانا جمال الدین ہی کا شروع کردہ ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری کی فارسی میں ایک شرح لکھی تھی جو کتاب النکاح تک مکمل ہوئی تھی، اور اس زمانے میں نہایت مشہور ومتداول تھی۔ ان کی دوسری تصنیف اصول بزدوی کی شرح ہے۔ صاحب تذکرہ نے شاہ عبدالحق صاحب کا قول نقل کیا ہے: "واز تصنیفات اوست شرح اصول بزدوی کہ امروز در تمام دیار ہند مشہور ست ودر طلبا مقبول"۔

شاہ صاحب کے اس جملہ سے، اور نیز دیگر مواد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں اصول بزدوی عام طور پر داخل درس تھی۔ اسی لئے متعدد علمائے ہند نے ان عہدوں میں اس کی شرحیں اور حاشئے لکھے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے بحث امر تک شرح لکھی تھی جس کو شیخ عیسیٰ جونپوری نے پورا کیا۔ حضرت مولانا منور الدین کے قلم سے لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے۔ شیخ وجیہ گجراتی کی شرح بھی عرصہ تک دیار دکن وگجرات میں متداول رہی۔ مولانا منور الدین کے حالات میں پڑھو گے کہ ان کے زمانے تک درسیات میں داخل

---

[1] شاہ صاحب کی یہ عبارت میں نے والد مرحوم کے رسالہ سے نقل کی ہے۔ والد مرحوم نے ان کے مکتوبات کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن مکتوبات کا جو مجموعہ "ارسال المکاتیب والرسائل" کے نام سے متداول ہے، اس میں یہ عبارت نہیں ملی۔ شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات کے تذکرہ میں متعدد مجموعہ ہائے مکاتیب کا ذکر کیا ہے۔

تھی۔ مولانا شمس الدین یحییٰ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مشہور خلفا میں سے ہیں شرح مشارق میں لکھتے ہیں کہ میں مولانا ظہیر الدین بھکری سے اصول بزدوی پڑھتا تھا۔ ایک دن خواجہ صاحب کی خدمت میں گیا تو پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ عرض کیا اصول بزدوی۔ فرمایا! اس کتاب کے فلاں مقام کا مطلب کیا ہے؟ میں کچھ جواب نہ دے سکا کہ وہ مقام خود میرے درس میں بھی صاف نہیں ہوا تھا۔ پھر خود انہوں نے نہایت عالمانہ تقریر کی اور اس مشکل کو حل کر دیا۔

بہرحال موجودہ عہد کے مقابلے میں وہ زمانہ پھر بھی غنیمت تھا کہ صرف شرح منار اور تلویح پر تو قناعت نہیں کر لی تھی؟ اصول فقہ حنفی کو سب سے پہلے پانچ شخصوں نے مرتب و منظم کیا اور کتابیں لکھیں۔ امام کرخی (متوفی سنہ ۳۴۰ھ) امام ابوبکر جصاص (سنہ ۳۷۰ھ) امام دبوسی صاحب تاسیس (سنہ ۴۳۰ھ) امام سرخسی (۴۸۳ھ) امام بزدوی (۴۸۲ھ) ان کے بعد جس قدر کتابیں لکھی گئیں، سب کی امہات یہی ہیں۔ پس متاخرین کی محدثات درسیہ کے مقابلہ میں امام بزدوی کی کتاب بدرجہا بہتر اور ارباب شروح کی تمام بدعات تحریر و بیان سے پاک ہے۔ یہ کتاب جب عام طور پر داخل درس تھی تو یقیناً ہمارے زمانے کے دماغ سوختگان نورالانوار و تلویح سے اس زمانے کا پایہ علمی بلند تر ہوگا۔ اب تو اکثر مقامات میں پوری تلویح کا پڑھنا پڑھانا بھی متروک ہے۔ حروف معانی کی بحث تک جس کے سبق ہو گئے، سمجھنے لگتا ہے کہ وقت کا اصولی اور فقہ کا امام ہو گیا۔

اصول بزدوی کا پڑھنا پڑھانا ایک طرف۔ اب تو یہ حال ہے کہ بہتوں کو اس کا اور اس کے مصنف کا نام بھی شاید معلوم نہیں۔ اسی ہفتہ ایک نیا نقشہ نصاب تعلیم میرے پاس آیا ہے جس کو ایک مشہور مدرسہ کے تمام مدرسین نے مل کر مرتب کیا ہے۔ اس میں بہ تقلید ندوہ درجہ تکمیل بھی رکھا ہے اور تکمیل اصول میں شرح اصول بزدوی منتخب کی ہے۔ لیکن اس کا نام یوں لکھا ہے "کشف للبزدوی" حالانکہ امام بزدوی کی "کشف" نامی کوئی کتاب سماء دنیا کے نیچے موجود نہیں۔ البتہ علاء الدین بخاری نے اصول بزدوی کی ایک شرح "کشف الاسرار" ضرور لکھی ہے

اور قسطنطنیہ میں چھپ گئی ہے۔ غالباً حضرات مجوزین نصاب نے اسی کا ذکر کہیں سن پایا ہے۔ خود تو کتاب دیکھی نہ تھی۔ سمجھ لیا کہ بزدوی کی کتاب ہی کا نام "کشف" ہوگا جب یہ حال ایک رسہ کے تمام مدرسین کی مجموعی معلومات کا ہے، تو فرداً فرداً جو حال ہوگا اس کا کیا پوچھنا؛

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

اس نصاب میں ایک خانہ دینیات شیعہ کا بھی ہے۔ کلام وعقائد میں سنیوں کیلئے شرح عقائد وغیرہ اور شیعوں کے لئے "تنزیہ الانبیاء" رکھی ہے۔ گویا "تنزیہ الانبیاء" مثل شرح عقائد وغیرہ کے شیعہ علم عقائد کی کوئی کتاب ہے۔ حالانکہ کتاب مذکور علامہ شریف علم الہدیٰ کی ہے اور اس کا موضوع علم عقائد و توحید نہیں ہے، بلکہ عقائد کا صرف ایک مسئلہ یعنی عصمت انبیاءؑ۔

فصل

صاحب تذکرہ لکھتے ہیں۔ سلیم شاہ کی درویش آزاریاں دیکھ کر حضرت شیخ داؤد نے فرمایا تھا اب پٹھانوں کے زوال وہلاکت کا وقت آگیا۔ اس پیشین گوئی کا چرچا گھر گھر پھیل گیا تھا۔ لوگوں کو اس قدر وثوق تھا کہ صبح شام اس کے ظہور کا انتظار کرتے تھے۔ چنانچہ بالآخر ایسا ہی ہوا۔ سلیم شاہ کے بقیہ دو سال حیات بڑی ہی بدحالیوں میں کٹے۔ موت ایک ایسے مرض سے ہوئی کہ کوئی حکیم تشخیص نہ کرسکا۔ پھر اس کا لڑکا فیروز قتل ہوا اور ہمیشہ کے لئے نسل منقطع ہوگئی۔ اسی طرح عدلی اور سکندر کا پورا زمانہ طوائف الملوکیوں میں بسر ہوا۔ بالآخر شیخ علائی کے واقعہ کے چار سال بعد ۹۶۱ سنہ میں ہمایوں سیلاب کی طرح خیبر کی بلندیوں سے اترا، اور دیکھتے ہی دیکھتے پٹھانوں کی حکومت خس وخاشاک بن کر بہہ گئی۔ انکی حکومت بہت سی خوبیاں بھی رکھتی تھی۔ عدلی وسکندر آخر تک اشرفیاں لٹاتے رہے، مگر کوئی بات بھی کام نہ آئی۔ شہیدان حق کا خون رنگ لائے بغیر نہ رہا:

چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند!

ان معاملات کو صاحب تذکرہ نے بہت تفصیل سے لکھا ہے، چونکہ عام تاریخی واقعات ہیں اس لیئے قلم انداز کرتا ہوں۔ باقی رہا حضرت موصوف کی پیشین گوئی کا معاملہ اور اس کا ظہور تو یہ بات اصحاب نظر کے لیئے ذرا بھی تعجب انگیز نہیں۔ اگر ایک تجربہ کار طبیب سات دن پہلے کہہ سکتا ہے کہ مریض جانبر نہ ہوگا، اور اگر ایک جاہل مگر سالخوردہ دہقان ہوائیں دیکھ کر اور موسم کے قدرتی آثار جانچ کر بتلا سکتا ہے کہ بارش ہوگی یا نہیں، تو پھر کیوں تعجب ہو اگر ایک طبیب امت اور موسم شناس عالم معنی وحقیقت حالات وعلائم دیکھ کر پکار اٹھے کہ حکومت ٹلنے والی ہے، اور امت کی نزع کا وقت آگیا، یا موسم جلد پلٹنے والا ہے، اور قریب ہے کہ طوفان افق پر چھا جائے؟ اور یہ مثال بھی اس لیئے دی تا کہ تمہارے فہم کی نارسائیوں پر گراں نہ گزرے۔ ورنہ اصل حقیقت کا نقشہ اس سے بھی بلند تر کھینچا جا سکتا ہے، اور جمال حقائق تمثیلوں کی حجاب آرائیوں کا متحمل نہیں۔ عرفی نے خوب کہا ہے:

تو خفاشی، ز نور مہ قیاس نور خور مے کن　　ترا سود این بود، گر نور خور بینی زیاں بینی

اس سے بھی آسان اور موٹی سی بات کہتا ہوں۔ اللہ کے قوانین وسنن معنویہ اسی طرح اٹل ہیں جس طرح مادیہ۔ اس کو تم مانتے ہو۔ لیکن چونکہ ان پر ویسا یقین نہیں رکھتے جیسا جسمانی قوانین مادہ پر ہے۔ اس لیئے جزم وقطع کے ساتھ کبھی کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ ہر شخص کہتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ جلد یا بدیر تباہی ہے لیکن چونکہ اس پر پورا یقین نہیں، اس لیئے کبھی تمہیں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ کسی ظالم کی نسبت جزم وتحدی کے ساتھ دعویٰ کرسکو کہ ظلم کا زہر عنقریب رنگ لائے گا۔ حالانکہ اگر ایسا کرو تو اس قانون حق کا بنانے والا کبھی تمہیں جھوٹا ہونے نہ دے۔ اور یہ بات بھی ویسی ہی بیّن اور بدیہی نکلے جیسے زہر سے موت اور آگ سے جلن۔ برخلاف اسکے جب ایک دانائے حقیقت وصاحب ایمان وایقان کبھی کبھار نکل آتا ہے، اللہ اس کے دل کو نور یقین کامل وعلم حقیقت سے معمور کر دیتا ہے۔ تو اس کو جس قدر یقین دن کی روشنی اور رات کی تاریکی پر ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ قانون حق وباطل وآئین صلاح وفساد پر ہوتا ہے۔ وہ حالات دیکھ کر بلا تامل بتلا دیتا ہے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے، کل کو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ اگر اجتہاد میں اس سے غلطی

نہ ہوئی تو دنیا دیکھ لیتی ہے کہ ٹھیک ٹھیک ویسا ہی ظہور میں آتا ہے۔ اس پر تم سب تعجب کرتے ہو۔ حالانکہ اگر ایمان کی طاقت سے کام لو اور قوانین الٰہی کو علم و نظر صادق کے ساتھ حالات و حوادث پر منطبق کرو، تو تم سب بھی ویسی ہی پیشین گوئیاں کر سکتے ہو جیسی ایک شخص خاص کرتا ہے۔ اور الہام حق کا دروازہ ایمان کامل کا ہاتھ تم سب پر کھول سکتا ہے۔ عرفی یہی حقیقت کہتا ہے:

این ہا ہمہ رازست کہ معلوم عوام ست　　　ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ

قرآن نے جا بجا بتلا دیا ہے کہ مصلحین حق و آمرین بالمعروف کا قتل کسی جماعت کی تباہی کا سب سے آخری کام ہوتا ہے ویقتلون الذین یامرون بالقسط من الناس (نساء) اور ظلم کے ساتھ کبھی فلاح جمع نہیں ہو سکتی: انہ لا یفلح الظالمون (یوسف)

ہیچ قومی را خدا لعنت نہ کرد　　　تا دل صاحبدلے نامد بدرد

مصلحین حق قتل ہو رہے تھے۔ ظلم کا بازار گرم تھا۔ یہ دیکھ کر اگر حضرت شیخ داؤد نے آنے والے نتائج کی پہلے سے خبر دیدی تو کونسی اچنبے کی بات ہے، اور کیوں تم اس کو خلاف عقل سمجھو؟ وہ ساری باتیں جن کا امکان انسانی دماغ میں آ سکتا ہے عقل کے مطابق ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی خلاف عقل نہیں۔ البتہ اس کا کیا علاج کہ خود تمہاری ہی عقل راہ خلاف میں گم ہے۔ تم نے تو آج تک یہ موٹی سی بات بھی نہ سمجھی کہ کسی بات کے ماورائے عقل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خلاف عقل بھی ہو:

بخواب خود در آتا قبلۂ روحانیاں بینی!　　　بسر روحانیاں داری ولے خود را ندیدستی

نوٹ: - اصل مسودہ میں اسکے بعد دوسرا باب حضرت شیخ محمد بن شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں تھا اور اس پر انہوں نے اپنے والد مرحوم کے مادری سلسلے کا حال ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد تیسرے باب میں ان کے جد امجد حضرت شاہ محمد افضل رحمۃ اللہ علیہ کے حالات ہیں، اور پھر مولانا منور الدین رحمۃ اللہ علیہ کے۔ چونکہ بعض وجوہ سے اب کتاب کو دو حصوں میں شائع کرنا مناسب نظر آیا اس لئے پہلے حصہ کو یہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ دوسرا حصہ باب دوم سے شروع ہوگا۔ اسی کے ساتھ خود مولانا کے حالات کا حصہ بھی ملا دیا جائے گا جو خاکسار نے مرتب کیا ہے۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خاتمہ کتاب کی ایک فصل جس میں مولانا نے اپنے انداز خاص میں خود اپنے حالات کی طرف چند اشارات کئے ہیں اور جن سے اس تذکرہ کے زمانہ تحریر کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اسی حصہ کے آخر میں درج کر دی جائے۔ تاکہ اس جلد کا اختتام بھی بالاجمال مولانا ہی کے حالات پر ہو۔ اگرچہ ان شاعرانہ اشارات سے ان عقیدتمندوں کی پیاس نہیں بجھے گی جو انکے مفصل حالات کے لئے تشنہ ہیں۔

فضل الدین احمد

فصل

گفتی کہ چرا حالِ دلِ زار نہ گوئی؟
من خود کنم آغاز، بہ پایاں کہ رساند

ان اوراق پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوست عزیز کا اصرار تھا۔ اب وہ مصر ہیں کہ خود اپنے حالات بھی قلم بند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے ان کا اصلی مقصد یہی تھا۔ ہر چند معذرت کی مگر مسموع نہ ہوئی۔ ناچار تعمیل فرمائش کے لئے مستعد ہونا پڑا۔ کئی سو صفحے روشن دلاں سلف کے تذکرۂ آثار و مناقب سے نورانی ہو چکے ہیں اب دو چار صفحے اپنی سیہ روئیوں اور سیہ بختیوں کے سوادِ تحریر سے بھی سیاہ کرتا ہوں کہ تعرف الاشیاء باضدادھا:

در مجلسِ وصالش تنہا کشیدہ مرداں   چوں دورِ خسرو آمد، مے در سبو نماندہ!

یہ غریب الدیار، عہد و ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت، کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے۔ سنہ ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا، اور تہمت حیات سے متہم۔ الناس نیام اذا ماتوا فانتبھوا۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم   دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ، غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا، اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا:

"جواں بخت و جواں طالع، جواں باد!"

سبحان اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی

و درماندگی میں بسر ہو چکی۔ بقیۂ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزل مقصود کا پتہ ہے۔ نہ شاہراہ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا۔ اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی۔ تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ لی۔ راہ دور اور نشان منزل گم۔ کیسۂ زاد خالی اور سرو سامان کار ناپید وقت جا چکا، اور ہر آن و ہر لمحہ کاروان مقصود سے دوری اور منزل مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس بھی مل جائے۔ پھر بھی وہ دولت وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لٹ چکی؟ اور وہ قافلۂ امید کب پسماندگان غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا؟

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی و جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے۔ یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ اصلی فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے، اور جواں بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اترے لِکُلِّ امریٔ منھم یومئذ شان یغنیہ! اگر وہاں روح وریحان وجنت النعیم او فوز عظیم کی فیروزی و کامرانی ہاتھ آئی، تو پھر بخت بخت ارجمند ہے اور طالع طالع بلند۔ لیکن اگر وجوہ یومئذ علیھا غبرۃ ترھقھا قترۃ اور لابشریٰ یومئذ للمجرمین کی رسوائی و مایوسی ملی تو پھر نہ اس حرماں نصیبی کے لئے کبھی امید ہے۔ نہ اس ماتم حسرت کے لئے کبھی خاتمہ۔ بخت اسکندری اور تخت جمشیدی بھی ہاتھ آئے تو لیکر کیا کیجئے؟

گر بدانم کہ وصال تو بدیں دست دہد دل و دین را ہمہ در بازم و توفیر کنم!

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے:

سلام علیٰ نجد، ومن حل بالنجد

مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ، و دار الہجرت سید الکونین، و شہرستان نبوت و وحی

ہے۔ قبلۂ عبادت گذارانِ عشق، وکعبۂ نیازمندانِ شوق علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ:

دارم دلے گرداں، کہ من قبلہ نمامی خواہش ‌‌ ‌ روسوے ابرویش کنند ہرچند می گرد انش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہیئے کہ بحکم "کن فی الدنیا کانک غریب" ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر۔ تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار، سب کو ایک ہی مستقر و موطن درپیش۔ البتہ کسی کے لیئے ساءت مستقرا و مقاما میں داخل، اور کسی خوش نصیب کے لیئے حسنت مستقرا ومقاما:

وابرح ما یکون الشوق یوما ‌ ‌ اذا دنت الخیام من الخیام

مولد ومنشأ طفولیت "وادی غیر ذی زرع" عند بیت اللّٰہ المحرم ہے۔ یعنی مکۂ معظمہ زاد اللّٰہ شرفاً وکرامۃ۔ محلہ قدوہ۔ متصل باب السلام:

بلاد بہا حل الشباب تمیمتی ‌ ‌ واوّل ارض مس جلدی ترابہا!

اس وقت کہ ۱۳۳۵ھ قریب الاختتام ہے: قافلۂ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا،

یقولون ھل بعد الثلاثین ملعباً؟ ‌ ‌ فقلت: وھل قبل الثلاثین ملعبا؟

قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے، اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں:

کس نمی گویدم از منزل آخر خبرے ‌ ‌ صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش است

جتنی زندگی گذر چکی ہے، اگر دان موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں، اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندہ تذکرہ و نگارش سے عاجز، اور فکر گم گشتہ حیران اظہار و تعبیر۔ اپنی سرگذشت و روئداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمود غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ حیات قلم بند ہو تو کیونکر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اڑتا ہے۔ طوفان نے درخت گرادیئے۔ سیلاب نے عمارتیں بہادیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کردی، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن کر تنکے جمع کیئے۔ خرمن و برق کا معاملہ آتش و خس کا افسانہ۔ ان سب کی سرگذشتیں لکھی جاسکتی ہیں تو لکھ لیجیئے۔ میری پوری سوانح عمری بھی انہی میں مل جائے گی۔ نصف افسانۂ امید اور نصف ماتم یاس!

عاشق نہ شدی، محنت الفت نہ کشیدی کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید؟

پہلے مجسم امید تھا۔ اب سرتا سر حسرت ہوں،

مختصر حال چشم و دل یہ ہے اس کو آرام، اس کو خواب نہیں

اس پر بھی اگر داستان سرائی کا شوق ہو تو ان پورے تیس برسوں کی سرگذشت سن لیجئے۔ حکایت برق و خرمن کوئی افسانۂ دراز نہیں جس کے لئے پوری رات آنکھوں میں کاٹی پڑے۔ صرف ایک نالۂ گرم اور آہ سرد میں پوری حکایت ختم ہے:

ہمسایہ شنید نالہ ام، گفت "خاقانی را دگر شب آمد!"

ایک صبح امید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئی:

ہم چو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت

ایک شام مایوسی تھی جس کی تاریکی کو امید کا کوئی چراغ روشن نہ کر سکا:

بجھا ہے دل جب سے مجھ حزیں کا، چراغ جلتا نہیں کہیں کا

یا امید و حسرت کے دو دن۔ ایک ہوس تعمیر میں بسر ہوا۔ ایک ماتم تخریب میں۔ ایک دن تنکے چنتے رہے، دوسرے دن دیکھا تو راکھ کا ڈھیر تھا جس پر خوب جی بھر کر آنسو بہائے:

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش ست زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش ست

ابو طالب کلیم نے چار مصرعوں میں پوری سوانح عمری لکھ دی:

بدنامی حیات دو روزے نہ بود بیش آنہم کلیم باتو چگویم چساں گذشت؟
یک روز صرف بستن دل شد بایں و آں روزے دگر بکندن دل زیں و آں گذشت

اور دراصل اس شعبدہ گاہ ہستی کی بڑی سے بڑی مہلتوں کا بھی یہی حال ہے لم یلبثوا الاعشیۃ اوضحاھا اور قالوا لبثنا یوما او بعض یوم۔ کلیم کو معلوم نہ تھا کہ اس سے پہلے یہی مضمون زیادہ ایجاز بلاغت کے ساتھ کہا جا چکا ہے:

ومتیٰ یساعد نا الوصال، ودھرنا

یومان، یوم نوی و یوم صدود!

عہد طفلی ایک خواب عیش تھا:

حیف صد حیف کہ ما زود خبردار شدیم!

آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی، اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستان ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبح فریب کے لئے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے۔ نہ ناامیدی و ناکامی کی شام۔ یہ سارا شہرستان امید اور نگار خانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدۂ و دل کی کامجوئیوں کے لئے بنا ہے، اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لئے چشم براہ ہے جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنی ہی گنبد غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی۔ یا نوگرفتاران طلسم شباب کی ہوشربائیوں کے لئے خود ساز ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے:

شہر یست پر ز خوباں، و ز ہر طرف نگارے یاران صلائے عام است گر می کنید کارے

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا، سرمستی و سرگرانی نے جام بھرے جنون شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھلائی، دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزل مقصود سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا۔ راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا:

ساقیا مرنج از من عالم جوانی ہاست

جس طرف نظر اٹھائی ایک صنم آباد الفت و پرستش نظر آیا جس میں مندروں اور مورتیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر مندر جبین نیاز کا طالب۔ ہر مورتی دل فروشی و جاں سپاری کے لئے وبال ہوش۔ ہر جلوہ برق تمکین و اختیار، ہر نگاہ بلائے صبر و قرار:

الفراق اے صبر و تمکین! الوداع اے عقل و دیں

جس راہ میں قدم اٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں پناہ لی، وہی زندان ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجئے۔ ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنئے۔ دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی مگر جلوؤں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی۔ ہر فسوں ساز نے اپنا افسون محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوشربا نے

صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراک اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا:

واے بر صیدے کہ یک بار نزد صیاد سے چند

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی۔ ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی۔ وہ برابر بڑھتی ہی گئی:

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پائے کار از دوا گذشتہ و افسوں نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی و سرفرازی کے لئے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار و خودپرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی۔ آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بےقیدی و بےتعینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب کبھی مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہ کی، اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا تو اپنی سنگینی و بےحسی بھی ضرور یاد آ گئی۔ غرضیکہ نہ تو اسباب میں کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی۔ بجلیاں کوندتی رہیں بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی:

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ سدا در قبول تو اس آرزو میں باز رہا

بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے:

ہاں! بانگ بلند است ایں، پوشیدہ نمی گوئم

گمراہیٔ عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہیٔ اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو، اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا عملی الحاد ہے:

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد شد تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے، بہتر ہے کہ خود آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں۔

اقرأ کتابك - کفیٰ بنفسك الیوم لدینا رقیباً حسیبا - اور ہم شہادت دیں یا نہ دیں، خود ہمارا وجود ہی سرتاپا شہادت ہے - بل الانسان علیٰ نفسه بصیرة ولو القیٰ معاذیره ہاتھ پاؤں کی شہادت پر تعجب کیوں ہو؟ جب اس دنیا ہی میں دیکھ رہے ہیں کہ اس کا ہر لمحہ یوم الاشہاد کا حکم رکھتا ہے، اور خود ہمارا قرین بغل ہی دم بدم شہادت دے رہا ہے لا اقسم بیوم القیامة ولا اقسم بالنفس اللوامة البتہ ساری ہلاکت اس میں ہے کہ ہنگامۂ غفلت و خود فراموشی میں نفس لوامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی ہے - اور پہنچتی ہے تو خود ہمارے ہی ہاتھ سرشاری و بدمستی کے نقاروں پر اس زور سے پڑ رہے ہیں کہ ان کے شور و غل میں یہ سرگوشی ملامت کب کام دے سکتی ہے؟ الا یہ کہ صیحة واحدة، فاذا هم خامدون کی گھڑی سر پر آجائے:

گوشت از بار درگراں شدہ است   نشنوی نالہ و فغان مرا

لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ:

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما   فکر ما در کار ما آزار ما

اور اس راہ کی نیرنگیوں کا کچھ عجیب حال ہے:

کہ علم بے خبر افتاد و عقل بے حس شد!

ہر چند راہ ایک ہی ہے لیکن کرشمے بیشمار ہیں - اور گو ہوش سب کھوتے ہیں مگر ایک ہی جلوہ سے نہیں،

اے ترا با ہر دلے رازے دگر   ہر گدا را بر درت نازے دگر!

کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا - کوئی بھاگتا ہے اور اس پر کمند پھینکے جاتے ہیں - قانون طلب و سعی سے انکار نہیں لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟ "ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات، الا فتعرضوا لھا"

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں   مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

غرضیکہ اپنی غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا لیکن ادھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ دوسرا ہی ہو چکا تھا:

بہ دور گردی من از غرور می خندد   حریف سخت کمانے کہ در کمیں دارم

ناگہاں باذنِ توفیقِ الٰہی پردہ عشقِ مجاز میں نمودار ہوا، اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی۔ چمکی۔ اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا:

می گذشتم زغمِ آسودہ کہ ناگہ زکمیں　　عالمِ آشوب نگاہے سرِ راہم بگرفت

اصل میں منزلیں تین ہی ہیں۔ ہوس، عشق، حقیقت:

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست　　خام بدم، پختہ شدم، سوختم

اور یہاں عشق سے مراد عشقِ محدود و ناقص یعنی مجاز ہے۔ نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے عشق ہی ہے۔ تمام کائناتِ ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے۔ زمین کا مدار و محور قائم ہے تو اسی کے دم سے۔ دنیا میں جس قدر ظاہر ہے یہی ہے۔ جس قدر باطن ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری نگاہ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمالِ حقیقتِ یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں۔ ورنہ

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں　　ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند!

بلاشبہ یہ بھی لغزش تھی۔ لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی رہنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں۔ لاکھوں ہشیاریاں اس پر سے نچھاور:

گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں　　خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

اصل یہ ہے کہ اس راہ کی کامیابی کا سارا دار و مدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے۔ اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بعد ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک میں جڑنے کے لئے سب سے کٹنا۔ اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دئے جائیں جو پہلے کھول لئے گئے تھے:

در قبولِ نظرِ عشق ہزاراں شرط ست　　اول از عافیت رفتہ ندامت باشد

انسان کی محبوبات و مالوفات کے اٹکاؤ ایک نہیں بیشمار ہیں۔ اس کی گردن الفتوں کی طوق کا بوجھ ہے۔ اس کے پاؤں علائق کی زنجیروں سے گرانبار۔ اس کا دل چاروں طرف سے صدہا قسم کی کششوں کا نشانہ۔ ہر زنجیر کے بندھن پہ مرتا اور ہر علاقہ کی الفت میں اسیر رہنا چاہتا ہے: زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ و الخیل المسومۃ والانعام والحرث۔ ذلک متاع الحیاۃ الدنیا (آل عمران) تو اب اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسوی اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لئے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کوئی ایسا طاقتور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی ہو کہ گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے۔ جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے۔ نہ ناخن گرہ کشا کی منت پذیری۔ نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کی انتظاری۔ ایک سوکھی لکڑی کے جلانے کیلئے ہزاروں تدبیریں کیجیے جب کہیں آگ سے دھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لئے بجلی کی ایک ہی نظر شعلہ بار کافی ہوتی ہے:

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ می کنی؟   از یک نگاہ کشت، جوابے دگر نہ داد

قطع علائق اور دفع موانع کی جتنی راہیں سعی و ہمت اور طلب و جستجو سے پیدا کی جاتی ہیں، سب پہلی صورت میں داخل ہیں، اور دوسری صورت جذب و عشق کی ہے۔ یہ قوت فرشتۂ عشق کے سوا اور کسی کے ہاتھ میں نہیں کہ ہزاروں نشتروں کا کام ایک ہی وار میں پورا کر دے:

دم شمشیر بود رہگذر عشق ولے   ہر کہ ایں رہ نورد، پے بہ در دل نبرد

اسی لئے عرفا طریق نے کہا عشق کی بری سے بری گرفتاری بھی بیدردی و بے سوزی کی آزادی سے ہزار درجہ بہتر ہے، اور اس راہ کی ناکامی بھی کم از فتح و فیروزمندی نہیں:

رہرواں را خستگی راہ نیست   عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست

گو اس کی گرفتاری بھی گرفتاری، اور اٹکاؤ بھی اٹکاؤ ہے، لیکن بہر حال یہی نفع کتنا بڑا نفع ہے کہ اس کی بدولت کام بہت آسان و مختصر ہو جاتا ہے۔ اور آنے والی منزل کے سارے کاموں کی مشق پہلے ہی سے ہو جاتی ہے۔ پہلے سو زنجیروں کو توڑنا تھا تو اس کی بدولت اب صرف ایک ہی زنجیر سے

چھوٹنے کا معاملہ باقی رہ گیا۔ پہلے ہزاروں چوکھٹوں کی جبہ سائیوں سے پیشانی داغدار تھی۔ کس کس داغ کو مٹائیے؟ کن کن پرستش گاہوں کو ڈھاتے؟ اب خودبخود سب مٹ گئے۔ صرف ایک ہی چوکھٹ کا نشان سجدہ رہ گیا۔ اور اصلی کام بھی یہی تھا کہ پیشانی ایک ہے تو سجدہ گاہ بھی ایک ہی ہو۔ جب یہاں تک معاملہ پہنچ گیا، اور ایک کے لئے سب کو چھوڑنے کا سبق مل گیا تو اس ایک کو بھی مسجود حقیقی کی خاطر چھوڑنا کیا مشکل ہے؟ ممکن ہے کہ ایک ہی جھٹکے میں یہ رشتۂ آخری بھی ٹوٹ جائے، اور پھر اس آذرکدۂ ہزار پرستش سے خلیل وار صدائے، انی وجھت وجھت للذی فطر السماوات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین بلند ہو:

بیفشاں زلف و صوفی را ببازی و برقص آور کہ از ہر رقعۂ دلقش ہزاراں بت بیفشانی

یہی وجہ ہے کہ اس سفر کی سب سے اقرب راہ منزلِ مجاز ہی سے ہو کر نکلی ہے:

بادہ گر خام بود، پختہ کند شیشۂ ما!

اور بعض صورتوں میں تو بغیر اس کے چارہ ہی نہیں۔ گو وہ خود بھی مرض ہے لیکن ہزاروں بیماریوں کا علاج بھی اس کے سوا کوئی نہیں:

گرچہ آشفتگی کارِ من از زلف تو بود حل ایں عقدہ ہم از روئے نگار آخرشد!

مانا کہ گرفتاریٔ عشق کی یہ ایک زنجیر بھی پابندیوں کی ہزاروں زنجیروں سے بوجھل ہوتی ہے، اور اس کی ترکش کا پہلا تیر پاؤں ہی پر لگتا ہے۔ وحشی کرمانی نے خوب کہا ہے:

عشق چوں برسرِ کس حملۂ بیداد آرد اولش قوت بگر بختن از پا بردد

لیکن عجب نہیں کہ کسی کے بام بلند تک پہنچنے کے لئے یہی زنجیر کمند کا کام دے جائے۔ کتنے ہی راہ کے خوش قسمت ہیں جن سے سیڑھیوں کا ایک ایک زینہ نہیں گنوایا گیا۔ کمند عشق نے ایک ہی جست میں قصر مطلوب تک پہنچادیا:

تو و قطع منازلہا، من و یک لغزش پائے

اور یہ تو منزل عشق کے معاملات ہیں۔ تجربہ کاران راہ کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اگر رندی و ہوس پرستی کی منزل میں بھی کچھ دیر کے لئے دم لے لیا جائے تو فائدہ سے خالی نہیں۔ کتنی ہی شاہراہیں ہیں جو

اسی خارزار سے نکلی ہیں:

کعبہ را ویراں مکن اے عشق، کانجا یک نفس ۔۔۔ گہ گہے پسماندگان عشق منزل می کنند

البتہ یاد رہے کہ سفر کی کامیابی نہ تو منزلوں پر موقوف ہے نہ مختلف راہوں پر۔ راہ کوئی ہو، قدم میں حرکت اور ہمت میں اقدام ہے تو کبھی نہ کبھی منزل مقصود تک پہنچ ہی جاؤ گے۔ خواہ راہ میں ہر درخت کے سائے تلے دم لو، خواہ ہر سرائے میں کمر کھولو۔ لیکن ساری نامرادی و بے حاصلی اس کے لئے ہے جس کے لئے راہ و منازل کے تماشے اس طرح دامنگیر ہو گئے کہ وہیں ہمیشہ کے لئے بستر جما دیا:

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر ۔۔۔ کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے، کوئی درمیانی منزل ہو۔ اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے، تو پھر وہی منزل بہت ہے اور رہرو اس کا پرستار۔ تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو۔

من شغلک عن اللہ فھو صنمک کامیابی چلتے رہنے اور بڑھتے جانے کا نام ہے کہ:

ٹک دیکھ لیا - دل شاد کیا ۔۔۔ خوش کام ہوئے اور چل نکلے

اور نامرادی نہیں ہے مگر اٹکنے اور رہ جانے میں:

یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

مطلوب اس راہ میں منازل و مراحل ہیں نہ کہ موانع و مہالک۔ اگر جاذبۂ توفیق الٰہی دستگیر ہے تو موانع وسائل بن جا سکتے ہیں، اور قریب ہے کہ بہتر سے بہتر وسائل محرومان راہ کے لئے موانع و مہالک کے حکم میں داخل ہو جائیں:

من لم یکن للوصال اھلا ۔۔۔ فکل طاعاتہ ذنوب

چنانچہ الحمد للہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچے کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے۔ کوئی گوشہ کوئی مقام باقی نہ چھوڑا۔ نہ مجنوں سے ہم عنانی کا سودا ہے نہ فرہاد سے مقابلہ کا دعویٰ۔ نہ یہ کہ:

شمۂ از داستان عشق شور انگیز ماست ۔۔۔ ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

البتہ یہ ضرور ہے کہ شیوۂ عشق و عاشقی و طریق آشفتگی و جانسپاری کی جتنی باتیں سننے میں

آتی تھیں وہ سب کر کے دیکھ لیں اور اس راہ کا کوئی حال اور معاملہ ایسا نہیں رہا جو کسی کی زبان پہ ہو اور اپنے اوپر نہ گذر چکا ہو:

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ — عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش۔ یا شمع کی خاموشی و سوزش:

وللناس فی مایعشقون مذاہب

اور تجربہ کاران طریق جانتے ہیں کہ دوسری راہ پہلی سے کہیں زیادہ نازک اور کٹھن ہے۔ اس میں بے قیدی و بے وضعی کی آزادی ہے۔ اس میں ضبط و احتیاط کی پابندی:

اے وضع احتیاط، یہ فصل بہار ہے — گلبانگ شوق زمزمہ سنج فغاں نہ ہو

اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے:

عریاں تنی خوش ست، ولے زیب دیگر ست — داماں چاک چاک و گریباں دریدہ را

اگر یہ سچ ہے تو پھر نہ مجنوں کی دشت پیمائیوں پہ رشک آتا ہے، نہ فرہاد کی شورش و کوہکنی پہ۔ اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ و زاری کی ہو تو کی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی ایک ایک لمحہ ایسا گزر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر پھنکی ہیں۔ ہزاروں شورشیں سینہ کے اندر ہی اندر جلی ہیں۔ آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی تو دل کے گوشے ہی میں طوفان اٹھاتے رہے:

انداز جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں — پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا، لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی۔ اسی ناکامی نے بالآخر کامیابی کی راہ کھولی۔ اسی مایوسی سے امید کا دروازہ کھلا۔ جو تاریکی اپنی سیہ بختیوں کی رات نظر آتی تھی، وہی صبح مقصود کے طلعت جہاں تاب کا آفتاب ثابت ہوئی۔ گو قدم بتکدہ کی راہ پر تھے، مگر غبار مجاز دور ہوا تو کعبۂ حقیقت سامنے تھا: یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی، ویحیی الارض بعد موتہا وکذالک تخرجون! (روم)

کفر آوردم و در عشق تو ایماں بودم

سارا کام پہلے سے ہو چکا تھا۔ چولھا مدتوں سے گرم تھا۔ ہوس بازی نے چنگاریوں کا کام دیا تھا۔ عشق نے شعلے بھڑکائے تھے۔ صرف اتنی بات باقی رہ گئی تھی کہ ایک دیگ اتار کر دوسری چڑھا دی جائے۔ یہ کام عشق کی امیدوں سے نہ ہو سکا تو کیا مضائقہ؟ عشق کی مایوسیوں نے تو پورا کر دیا:

آں نافۂ مراد کہ می خواستم ز غیب — در چین زلفِ آں بتِ مشکیں کلالہ بود

فصل

سبحان اللہ چارہ فرمائے غیبی کی کارسازیاں! اور رہنمائے آوارگان غفلت کی دستگیریاں! جاذبۂ توفیق کب سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا مگر غفلت کی درماندگی دامنگیر تھی۔ جمال حقیقت کب سے بے نقاب تھا مگر پردۂ کج نظری حائل تھا۔ کرشمہ عنایت کب سے پکار رہا تھا لیکن نفس کے ہنگاموں میں دل غافل تھا۔ ناکامی عشق نے آخری ضرب لگائی تو یکایک آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا تو ایک دوسرے ہی عالم کی ہوشربائیاں سامنے تھیں۔ نہ وہ آسمان تھا نہ زمین تھی۔ نہ وہ آفاق نہ وہ انفس۔ جس ہاتھ کی رہنمائی نے یہاں تک پہنچایا تھا خود اس کو بھی ڈھونڈا تو پتہ نہ تھا۔ گویا وہ ایک چراغ تھا کہ جب تک رات کی تاریکی میں چلتے رہے، دلیل راہ رہا۔ جب صبح ہو گئی تو ضرورت نہ تھی۔ بجھا دیا گیا:

نعرہ زد عشق، دین ما بگریخت — کفر نیز از کمین ما بگریخت

آنکھوں کا تو یہ حال تھا۔ کان لگائے تو اندر اور باہر، ہر طرف سے صرف یہی ایک صدا اٹھ رہی تھی:

ترا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر — ندانمت کہ دریں دام گہ چہ افتاد ست؟

وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے، اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں، اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ ہشیاری و بینش کا مرقع تھا۔ بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا۔ پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کیے۔ خاک پامال نے اڑ اڑ کر افسانیاں کیں

آسمانوں کو بارہا اترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں۔ فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے، سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اتار دیئے۔ سارے پردے چھلنی ہو گئے۔ سب کی ابروؤں میں اشارے تھے۔ سب کی آنکھوں میں حکائتیں بھری تھیں۔ سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لئے دراز تھے۔ بادل کو پکڑا تو ساز ہستی کا طنبورہ نکلا۔ بجلی کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا ایک تبسم آشکارا نکلی۔ ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آ گئے مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا۔ رات معدوم تھی۔ ظلمت کی بڑی ڈھونڈھ ہوئی مگر نہ ملی۔ خواب و غفلت کا لاکھ پتہ پوچھا مگر کسی نے نہ بتلایا جب کبھی آنکھیں بند کیں، تماشے دیکھے۔ جب کبھی کان بند ہوئے، صداؤں اور نواؤں سے بھر گئے۔ سورج نے کہا۔ دو لاکھ میل دور ہوں۔ قطب شمالی سے روشنی اتری اور بولی، ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ نوے ہزار میل طے کرتی ہوں۔ مگر آنکھوں نے کہا یہ تو تارنگاہ کی پہلی منزل ہے، اور دل ہنسا کہ اپنا پیام محبت جب شوق کے پروں پر اڑتا ہے تو بھلا روشنی کی لنگ پائی کب اس کا ساتھ دے سکتی ہے؟ غرضیکہ ہمت خوابیدہ جاگ اٹھی۔ اور دل رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے سامانوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ عالم آفاق و انفس میں جو کچھ ہے ان میں سے کوئی بھی نہ تھا جس کی ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو۔ سب کی زبانیں گویا، سب کے اشارے آشکارا، سب کی سطریں ابھری ہوئی تھیں۔ نہ کوئی لب بند رہا نہ کوئی جلوہ مستور۔ نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی نہ کانوں نے سننے میں۔ چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے؟

سخن عشق بدل در نہ و لب را مکشا   سرایں شیشہ فرو بند کہ بادے نہ خورد

اللہ اللہ دولت سعادت و قبولیت کی فراوانی، اور سبحان اللہ بخشش و لطف غیبی کی بے پایانی! سمندر اسکی وسعت فیض کا ایک قطرہ، مگر یہ بھی گستاخی ہے۔ سورج اسکے انوار کرم کی ایک شعاع، مگر یہ بھی نادانی ہے۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

بے خود از شعشعۂ پرتو ذاتم کردند   بادہ از جام تجلی بصفاتم دادند

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے | آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں | خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد | کہ بآں جور و جفا صبر و ثباتم دادند

دنیا کسی کے لئے کبھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن اگر تم خود بدل جاؤ تو اس کو بھی یک قلم بدلا ہوا پاؤ گے تمہاری دنیا تمہارے میکدۂ شباب میں ایسی تو نہ تھی جیسی اب بڑھاپے کی پامالیوں میں نظر آ رہی ہے۔ ہنگام ڈھال میں تمہاری یہی ہر روز والی دنیا جو رعنائیاں رکھتی تھی صبح وداع کی اداسیوں میں کب باقی رہیں؟

گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

جو اشارات کئے گئے، اگر تمہارے مذاق سخن سنجی پر گراں گزرے ہوں، تو بہ نسبت انکار کے یہ بہتر ہو گا کہ ان کو اسی حالت پر قیاس کر لو۔ ورنہ جو کچھ آنکھوں پر گزری اور جو کچھ دل کو پیش آیا خود اپنی ہی زبان و دماغ اس سے محرم نہیں۔ دوسروں کو کیا سنائیے؟ اگر بجلی کی جگہ تبسم اور ستاروں کی جگہ انشاں کہہ کر عہدہ برآ ہونا بھی چاہیں جب بھی سننے والے آسمان و زمین سے آئیں گے؟

یارب کجاست محرم رازے کہ یک زماں | دل شرح آں دہد کہ چہ دید و چہا شنید؟

غفلت ہر حال میں غفلت ہے۔ ایک لمحہ غفلت کے معاوضے میں عمر بھر کا ماتم بھی کافی نہیں۔ تاہم جو کچھ ہو چکا ہے، اب دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کارخانہ کی ہر چیز کی طرح وہ سب کچھ بھی ضروری تھا اور شاید ان میں سے ہر بات اس سفر کی ایک ناگزیر منزل تھی۔ اگر ہوس پرستی و رندی کی منزل پیش نہ آتی تو نہیں معلوم حقیقت پرستی کے کتنے ہی گوشے ہیں جن سے ہمیشہ بیخبر رہتے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ اس عالم کی کسی بات کو بھی برا نہ کہو۔ برائی محض ایک اضافی شے ہے۔ اصل بجز خوبی اور اچھائی کے کچھ نہیں۔ اعتبار ہر حال میں ثمرات و نتائج کا ہے نہ کہ ظواہر و اوائل کا۔ کتنے ہی راہ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں، اور کتنے ہی قدم ہیں کہ ٹھوکر نہ لگے تو ان میں تیزی و چالاکی بھی نہ آئے، اور راہ کے نشیب و فراز سے ہمیشہ غافل رہیں۔ کتنے ہی کفر ہیں جو وسیلہ ایمان ہوئے؟ کتنے ہی ایمان ہیں جن کا خاتمہ کفر پر ہوا؟ لم تذنبوا لذهب الله بكم وجاء الله بقوم آخرين يذنبون ويستغفرون

مولانا روم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

اوازقعرِ بحرگوہر آوَرد — اززیانہا سود بر سر آورد

چوں قبولِ حق بودآں مرد راست — دستِ اودرکارہا دستِ خداست

ہرچہ گیرد علتے علت شود — کفرگیرد کاملے ملت شود

عیب شد نسبت بہ مخلوقِ جہول — نے بہ نسبت باخداوند قبول

کفرہم نسبت بہ خالق حکمت ست — چوں بمانسبت کنی کفرآفت ست

یہی فائدہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ دماغ کی خشکی اور دل کی بیدردی کا پہلے ہی دن علاج ہوگیا، اور شیوۂ دردمندی و دلفگاری کی تعلیم ابتداہی میں مل گئی۔ جب ہوس پرستی کی منزل میں تھے، تو وہاں بھی ہمیشہ دل کو پہلو کی جگہ ہتھیلی ہی پر رکھنا پڑا

لختے بود از دل گذرد ہرکہ زپیشم — من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

منزلِ عشق نمودار ہوئی تو اس کا کیا پوچھنا؟ البتہ فرق اتنا تھاکہ پہلے ایک دل کے بہت سے ٹکڑے کر دیتے تھے۔ اب دل ایک، تھا تو گاہک بھی ایک ہی۔ بلکہ:

ليس الفواد محل شوقك وحدہٗ — كل الجوارح في هواك فواد!

پھراس کے بعد جو آخری منزل پیش آئی، وہاں تو بجز متاعِ دردودل بازی اور جنسِ جاں سپاری و جاں فروشی کے اور کوئی شے مقبول ہی نہ تھی، جئنا ببضاعة مزجاة فاوف لنا الكيل

جز محبت ہرچہ بودم سود درمحشر نداشت — دین ودانش عرض کردم کس بہ چیزے برنداشت

اس منزل سے پہلے جو کچھ ہو چکا تھا، اس کا ایک ایک معاملہ یہاں کام آیا۔ جیب ودامن کے ہر پرزہ نے اس طرح کام دیا، گویا خاص اسی لباس کی درستگی کے لئے قطع ہُوا تھا۔ ہر عیب نے ہنر کی خوبروئی پائی۔ ہر نقص نے کمال سے بڑھ کر ہمرہی کی۔ ہر چرکا جو نشترِ ہوس نے لگایا تھا، ہرزخم جو کمانِ عشق کے تیروں کا بےخطا نشان تھا، اور جس کو کیسی کیسی تمناؤں اور چاہتوں سے ہمیشہ سینے میں بچائے رکھا تھاکہ کہیں ناسور بننے کی جگہ مندمل نہ ہوجائے:

بہ تسکینِ دل نے لے لیا ہے غنیمت جان کر — وہ جو وقت نازکچھ جنبش تیری ابرو میں ہے

اس راہ میں اس طرح کام آیا کہ خدانکردہ اگر اس متاعِ زیاں سے اپنا کیسہ سود خالی ہوتا تو نہیں معلوم

بازارِ قبولیت میں کیسی محرومی و شرمندگی اٹھانی پڑتی ، مرہم گھٹ جاتا تو ہزار جگہ سے مل جاتا۔ زخم کہاں سے لاتے ، خون چکانی کس سے مانگتے ، اور مل بھی جاتی تو وہ گہرا ناسور چند گھڑیوں میں کیسے بن جاتا جو مدتوں کی زخم پروریوں کے بعد کہیں نصیب ہوتا ہے۔ اور وہ بھی ہر زخم اور ہر زخمی کو کہاں ؟

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق دکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں ؟

بس الحمد للہ کہ آخر میں جو کچھ پایا، اس کے لئے ابتدا کا ہر کھونا کام آیا۔ کوئی ہشیاری ایسی نہ ملی جس کے لئے اپنی کوئی نہ کوئی غفلت کام نہ آگئی ہو۔ چاک جیب تک گریباں تک ہے ناقص ہے لیکن اگر وہی دامن تک پہنچ جائے تو اس کے کمال میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ؟

تا دامن آ کے چاک گریباں نے دم لیا ہے دامن اور جیب میں رشتہ قریب کا !

جس حال میں رہے، نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید و روش عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے، کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی، اور دوسروں کے لئے اپنا نقش قدم رہنما چھوڑا۔ رندی و ہوسناکی کا عالم رہا تو اس کو بھی ناتمام نہ چھوڑا۔ عشق کی خود فراموشیاں رہیں تو وہاں بھی کسی وادی اور کسی گوشے سے اپنے قدم ناآشنا نہ رہے۔ لمحوں کے اندر برسوں کے کام انجام پائے :

کام تھے عشق میں بہت پر میر ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے !

اب جس حال و رنگ میں ہیں، تو یہاں بھی کمال ہی کی آرزو ہے، اور اتمام کار کیلئے بے قراری اور سارا معاملہ اسی کارساز غیب کے ہاتھ ہے جس نے گو ہر راہ میں ڈالا، لیکن اٹکایا کہیں نہیں! اور گو ہر وادی میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کیلئے سرگردانی ضرور ہوئی، لیکن یہ سرگردانی بھی ہدایت یابی سے خالی نہ تھی :

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم

العرض توفیق الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔ سب سے زیادہ آسان و پر امن راہ یہ ہے کہ رہنمایان طریق میں سے کسی صاحب ارشاد کی ہمت و صحبت حاصل ہو جائے لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اس بارے میں میری درماندگی ویسے کسی متعارف وسیلۂ ہدایت و ارشاد کی رہین منت نہیں ہے۔ حالات ابتدا سے جیسے اور جتنے رہے ہیں، سب کے سب اس حالت سے

یکسر متضاد تھے جن تک تدریج رسائی میسر آئی۔ قطع نظر اس معاملۂ خاص کے، عقائد، اعمال، عادات خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ پس اپنی شکستگی و خستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے، نہ کسی زبان کی، نہ خاندان کی، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی۔ جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے۔ جتنی رہنمایاں ملیں صرف اسی مرشد فیض و ہادی طریق سے ملیں۔ درد بن کر آیا تھا مگر درماں بن کر گیا۔ مرض بھی وہی تھا، شفا بھی اسی سے ملی:

تداویت من لیلی بلیلی عن الھویٰ　　　کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

علم کا دروازہ اسی نے کھولا۔ عمل کی حقیقت اسی نے بتلائی۔ معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے۔ حقیقت کے خزانے اس کے دستِ کرم میں تھے۔ شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا۔ قرآن کے بھید اسی نے بتلائے۔ سنت کے اسرار اسی نے کھولے۔ نظر اس نے دی، دل اس نے بخشا۔ کونسی مشکل تھی جو اس سے حل نہ ہوئی؟ کونسا الجھاؤ تھا جو اسکی ایک سلجھی ہوئی نظر سے سلجھ نہ گیا؟ کونسی بیماری تھی جس کی دوا اس کے دارالشفا سے نہ مل سکی؟

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما　　　اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

اور یہ جو کچھ کہا گیا، تو یہ نہ سمجھا جائے کہ اپنے عیبوں کو بھی ہنر بنا کر دکھلانا مقصود ہے۔ جس عالم میں ہنر کو بھی ہنر سمجھنا معصیت ہو، وہاں عیب کو حسن بتلانے کا وہم بھی گزرے تو کفر سمجھا جائے۔ مقصود صرف یہ تھا کہ:

وکم للہ من لطف خفی　　　یدق خفاہ عن فھم الزکی

ہاں، یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اول روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اس رندی و ہوسناکی کی تردامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کو عین اکیس بائیس برس کی عمر میں (کہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے۔ کتنی ہی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا۔ کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں۔ ولولوں امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے۔ جب کہیں جا کر اس کوچہ میں دم

لے سکے، جہاں آج اپنے کو پا رہے ہیں:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے

اور سچ پوچھئے تو فیصلہ وہی ہے جو لسان الغیب نے کر دیا:

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نشود — ز زہدِ ہمچو توئی، یا بہ فسقِ ہمچو منی

باوجودیکہ اس معاملہ پر کامل نو برس گذر چکے، اور رفتہ رفتہ وہ حالت پیش آئی کہ:

فلم یبق منی الشوق غیر تفکری — فلو شئت ان ابکی، بکیت تفکرا

لیکن الحمد للہ کہ جو درد پہلے داغ اور پھر زخم بن کر رہا تھا، اب ناسور بن کر نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہے، اور امید ہے کہ ہمیشہ محفوظ رہے گا:

الیس وعدتنی یا قلب انی — اذا ما تبت عن لیلیٰ تتوب

فہا انا تائب عن حب لیلیٰ — فما لک کلما ذکرت تذوب؟

فصل

۲۳- مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کی بنا پر حکم دیا کہ ایک ہفتہ کے اندر حدودِ بنگال سے باہر چلا جاؤں۔ اِن الحکم الا للہ!

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب — دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آگیا

۳۰- مارچ کو کلکتہ سے کہ سالہا سال کے متصل قیام کی بنا پر بیجا نہیں اگر وطن کہوں، نکلا اور رانچی پہنچا:

نگہم نقب ہمی زد بہ نہاں خانۂ دل — مژدہ یا اہلِ ریا را کہ ز میداں رفتم

اگرچہ اکثر احباب و اقارب آمادۂ ہمرہی تھے، لیکن دلِ ہمت خواہ نے گوارا نہ کیا کہ اس منزلِ انقطاع کی عزت کو شرکتِ رفقا کے داغِ ناتمامی سے بٹہ لگاؤں۔ معلوم نہیں دنیا کو چھوڑنا مشکل ہے یا آسان، لیکن الحمد للہ کہ ہم کو دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہونے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی، ہر چند دل کو ٹٹولا مگر کوئی علاقہ بھی دامنگیر نہ تھا۔ اور نہ جمعیتِ خاطر و فراغِ قلب نے ایک لمحہ کے لئے ساتھ چھوڑا۔ کم سے کم انقطاع

وتجرد کی ایک چھوٹی سی مشق ہوگئی۔ شائد آگے چل کر کچھ کام دے جائے:

بچہ گیرند عیار ہوس و عشق دگر — رسم بیداد مبادا ز جہاں برخیزد

اس وقت کہ یہ غم نامہ حسرت لکھ رہا ہوں، رانچی میں شہر سے باہر مورا باوی نامی ایک گاؤں کے قریب تنہا مقیم ہوں:

وبلدۃ، لیس بھا انیس — الا الیعافیر والا العیس

یہ تمام علاقہ ہندوستان کی وحشی اقوام کا مسکن ہے جو کول، اراؤں، منڈا وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں شاید اسی مناسبت سے اپنی وحشت نے بھی یہی مسکن منتخب کیا:

اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

اس گاؤں میں بھی تمام تر وہی لوگ آباد ہیں۔ صرف چار پانچ بنگلے چند بنگالیوں نے بنا لئے ہیں کبھی کبھی گرمیوں میں آکر رہتے ہیں۔ انہی میں سر رابندر ناتھ ٹیگور مشہور بنگالی شاعر کا خاندان بھی ہے اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر آباد ہے۔ کارساز قدرت کی بھی کچھ عجیب کرشمہ سازیاں ہیں، ایک مدت سے جس فراغ خاطر اور آزادی فکر و عمل کو طبیعت ڈھونڈتی تھی مگر اشغال و علائق کی کثرت سے نہیں ملتی تھی، حتیٰ کہ اس کی وجہ سے صحت جسمانی نے بھی جواب دیدیا تھا "اب ملی بھی تو کس بھیس میں؟" دنیا نے جلاوطنی اور نظربندی کی خبر سنی، اور دل نے خلوت گزینی و گوشہ گیری کی دولت و سعادت پائی: باطنہ رحمۃ وظاہرہ من قبلۃ العذاب

بیگانہ جہاں میں عزلت نے کر دیا — کچھ کچھ کسی کسی سے ملاقات رہ گئی

اسی اثنا میں رمضان المبارک کی برکات و نعائم کا ورود ہوا۔ اگرچہ نماز جماعت کی کیفیت انجمن طراز اور جماعت تراویح و سماع تلاوت کی لذت دل نواز سے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محرومی رہی۔ اور اس لئے ابتدا کے دو چار دن ایک گونہ انقباض و دل گرفتگی میں بسر ہوئے۔ لیکن اس کے بعد ہی مقام خلوت دانجمن کی کیفیتوں اور انجمن در خلوت کی خود رفتگیوں کا عالم کچھ اس طرح طاری ہوا کہ دنیا جہان کی ساری صحبتوں اور انجمنوں سے دل بے پروا ہو گیا۔ علی الخصوص عشرۂ اخیر کی شب ہائے تمنا اور روز ہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو جو سعادتیں پائیں، اور چشم و گوش نے لطف دید و ذوق سماع کی جو جو دولتیں لوٹیں، نہ دنیا کی کوئی زبان ان کی ترجمانی کر سکتی ہے، نہ سامع استعداد سماع رکھتا ہے

البتہ حسرت رہی تو یہ رہی کہ کاش پوری زندگی کی وسعت کسی طرح ان دس راتوں میں آجاتی، اور ساری عمر اسی عالم میں بسر کر جاتے:

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو   کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑہ شب جدائی کا

اس راہ کا ہر گوشہ ایک جداگانہ کیفیت رکھتا ہے۔ بزم وصحبت کی ادب آموزیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک ایک گھونٹ کی لذت لیکر جام خالی کیجیئے تو مے پرستوں کی سیہ مستیاں چاہتی ہیں کہ کسی گوشے چھپ کر پوری صراحی منہ سے لگا لیجیئے۔ بزم و انجمن کی پرسش نہانی و دزدیدہ نگاہی کا بھی ایک لطف ہے اور خلوت و تنہائی کے راز و نیاز کا بھی ایک عالم ہے۔ اگرچہ اس دوسری حالت سے بھی طبیعت کو بیگانگی و ناآشنائی نہ تھی۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ معاملہ بہت کچھ محتاج تکمیل تھا، اور توفیق الہی نے اب جلاوطنی کی منزل کو اس کا ذریعہ بنا دیا! الحمد للہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی صدا ذوق سماع میں مخل ہے اور نہ کوئی منظر مشغولیت میں حارج۔ غالب وقت تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا ہے کہ تمام تر کتاب عزیز و سنتِ مطہرہ کی شرح و تفسیر پر مشتمل ہیں۔ اس سے جس قدر مہلت نکلتی ہے، وہ بھی ضائع نہیں جاتی۔ میدان دور دور تک ہیں اور پہاڑ چاروں طرف:

واخرج من بين البيوت، لعلني   احدث عنك النفس في السر خاليا!

عجب کاروبار ہے کہ سعی و طلب کام نہیں دیتی اور لطف و بخشش ہی کی ہر طرف حکمرانی نظر آتی ہے! ان چند مہینوں کے اندر خود بخود کتنے ہی نئے دروازے کھلے، اور اکثر ایسا ہوا کہ احکام بدلنے پڑے اور کتنے ہی پچھلے فیصلے معطل ہو گئے۔ جن کاموں کو آج تک خدا پرستی سمجھ کر اپنی کامیابیوں پر ناز اں تھے اب دیکھا تو وہ بھی بت پرستی سے خالی نہ تھے۔ طاق و دیوار اصنام پرستش سے خالی ہو گئے، مگر جیب و آستین کی کبھی خبر نہ لی!

تا بعنایت ما ہنر پنداشتیم   عاشقی ہم ننگ و عارے بودہ است

زمانے کو کل تک جہاں پہنچانا چاہا تھا، الحمد للہ اب خود اس سے بھی منزلوں آگے بڑھ چکے ہیں۔ اور گو ہمراہانِ راہ ابتک اسی منزل میں کمریں کھولے بیفکر پڑے ہیں مگر اپنا کاروانِ طلب اب کسی دوسری ہی منزل کے آثار سامنے دیکھ رہا ہے

مئے کہ می رود امروز در گلوئے دو کون   کمینہ جرعۂ تہ شیشہ ہائے دوش من است

اس اثنا میں حکمِ جلاوطنی کی منسوخی کیلئے احباب و مخلصین نے کوئی دقیقہ سعی و تدبیر کا اٹھا نہ رکھا۔ بشاید اس قسم کی کوششوں کی یہ پہلی مثال ہے کہ ساٹھ ہزار سے زیادہ دستخطوں کے ساتھ میموریل بھیجا گیا۔ بعض ارکانِ حکومت بنگال کے خطوط پچھلے مہینے آتے رہے۔ اور معلوم ہوا کہ غلط فہمیوں کا اعتراف ہے۔ حال ہی میں ایک شخص سے ملاقات کرتے ہوئے خود لارڈ مائیکل نے بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا تھا۔ حتیٰ کہ شام تک منسوخی حکم کے اجرا کی امید دلائی تھی۔ ابتدا میں ان واقعات کا دل پر کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور پڑا لیکن پھر دیکھا تو دل کی آسودگی اور طبیعت کی وارستگی پر یہ تاثر بھی سخت شاق تھا۔

دانم کہ شفیق اند طبیباں ہمگی، لیک ۔۔۔ مرہم کہ نہ محبوب نہد دشمن ریش ست!

بظاہر حالات مشیت الٰہی کچھ اور ہی نظر آتی ہے اور شاید تکمیل کار کی ایک منزل ابھی باقی ہے۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے ۔۔۔ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں!

جس مقام پر مقیم ہوں شہر یہاں سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ رمضان المبارک میں جمعہ کے دن جامع مسجد گیا۔ چند صفوں سے زیادہ مجمع نہ تھا۔ لوگوں نے خطبہ و امامت کے لئے سخت اصرار کیا۔ مجبوراً خطبہ دینا پڑا۔ ان بیچاروں نے اب تک خطبہ کے یہی معنی سمجھے تھے کہ عربی کی کوئی چھپی ہوئی کتاب پڑھ دی جائے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ اچھی خاصی ہے مگر ایک گمنام گوشے میں پڑ جانے کی وجہ سے حد درجہ تباہی و بدحالی میں مبتلا ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد سے ایک قوی داعیہ قلب میں محسوس ہو رہا ہے کہ اگر حالات طول قیام کا باعث ہوئے تو یہاں بھی اپنا کام شروع کر دینا چاہئے۔ دنیا نے فراغ و آزادی کے زمانہ کے کاموں کا کچھ نہ کچھ نمونہ دیکھ لیا ہے۔ بہتر ہے کہ جلاوطنی و نظربندی کے بند و قید میں کام کرنے کا بھی ایک نمونہ دکھلا دیا جائے کہ اصلی آزمائش گاہِ عمل یہی ہے:

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز ۔۔۔ آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر!

فصل

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ڈاک ملی، اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ عزیزی مولوی محی الدین احمد بی۔اے کو قصور میں تلاشی کے بعد گرفتار کیا گیا ہے۔ شاید نظربندی کا معاملہ پیش آئے۔ ان تمام ایام جلاوطنی میں یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعہ کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں:

در دے کیں نامہ می کردم رستم　　کان یجرالدمع ممزوجا بدم

عزیز موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائص ایمانی و جوشِ اسلامی وایثار للہ و فی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات زندہ کرنے والا ہے۔ اور علی الخصوص اس عزیز کے طلب صادق اور استعداد کامل سے تو اپنی چند در چند امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس فتنۂ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا۔ مجھے اس سے کب انکار تھا کہ میرے پاؤں میں ایک کے بدلے دس زنجیریں ڈالدی جائیں، لیکن دوسروں کو اس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے؟ بظاہر عزیز موصوف کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھ خانماں خراب سے رسم و راہ رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ! اپنی آشنا پروری اور دوست نوازی بھی قابلِ تماشا ہے! جب تک کوئی اپنا دشمن نہ بن جائے ہمارا دوست ہی نہیں ہو سکتا!

اے ہم نفساں! آتشم! از من بگریزید　　ہر کس کہ شود ہمرہ ما دشمن خویش ست!

پرسوں ایک عزیز کو خط لکھتے ہوئے یہ رباعی ذہن میں آئی تھی:

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی!　　اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی!

میخانہ نے رنگ روپ بدلا ایسا،　　میکش میکش رہا، نہ ساقی ساقی!

فصبر جمیل۔ عسیٰ اللہ ان یاتینی بھم جمیعا۔ انہ ھو العلیم الحکیم!

یہ اوراق پریشان کہ دوست عزیز مسٹر فضل الدین احمد کے بیحد اصرار سے قلمبند ہوئے، اپنی پریشانی طبع و برہمی خاطر کی یادگار ہیں۔ اگرچہ کئی بار قصد کیا مگر جمعیت خاطر کا وقت ان کے لئے بہم نہ ہو سکا۔ ابتدا سے اب تک یہ حالت رہی ہے کہ جب کبھی اپنے ضروری اشغال سے کچھ وقت بچا، چند اجزا لکھ ڈالے اور عزیز موصوف کو بھیج دیئے۔ نہ پورا سلسلہ سامنے رہا، نہ ربط و ترتیب اور تقسیم و تبویب کی مہلت ملی کہ شیوۂ اصحاب تصنیف و تدوین ہے۔ تمام کتابیں کلکتہ میں پڑی ہیں۔ بجز اپنے قلمی مسودات و ایک نسخۂ مصحف کے اور کوئی کتاب ہمراہ نہیں۔ جب یہ تذکرہ لکھنا شروع کیا تو بعض حالات کے لئے صرف تذکرۃ الواصلین، اخبار الاخیار، اور طبقاتِ اکبری منگوائی اور بعد کو منتخب التواریخ بھی آگئی ان کے سوا کوئی کتاب پیشِ نظر نہیں رہی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے صرف اپنے حافظہ کے اعتماد پر لکھا ہے۔ حالانکہ

سچ یہ ہے کہ شائستہ اعتماد نہ تھا۔ جا بجا ضمنی مباحث فقہ اور حدیث اور تاریخ و سنین کے آگئے ہیں جن کی تنقیح بغیر رجوع کتب مشکل تھی علی الخصوص احادیث کی تخریجات و اسناد کہ اس میں سب سے زیادہ احتیاط مطلوب ولازم ہے۔ لیکن افسوس کہ کتابیں موجود نہیں اور نہ اس کی مہلت کہ اب ایک ایک حوالہ کی تصحیح اور ایک ایک حدیث کی تخریج کے لئے کتابوں کے منگوانے کا سر و سامان کروں۔ بس جو کچھ حافظہ میں محفوظ تھا۔ حوالۂ قلم کر دیا۔ بعض احادیث کے الفاظ کی نسبت حافظہ نے کمزوری دکھلائی تو وہاں اس کا اشارہ کر دیا گیا ہے اور شاید ایک دو جگہ تخریج کی جگہ خالی بھی چھوڑ دینی پڑی۔ بایں ہمہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے اس قدر توقع ضرور ہے کہ جہاں جہاں سند و تخریج درج کردی ہے، شاید تحقیق سے غلط نہ نکلے گی۔ آیات قرآنیہ کے اندراج میں اب تک یہ عادت رہی ہے کہ ہنگام تحریر جو آیات یاد آجاتی ہیں، درج کردیتا ہوں اور پھر پروف کی تصحیح میں مراجعت کے بعد سور و آیات کے نمبر بھی درج کردیئے جاتے ہیں لیکن فلوگل[1] والا نسخہ جس میں نمبر ہیں ساتھ نہیں اور نہ طبیعت مزید صرف وقت پر مائل۔ اس لئے محض حافظہ کی بنا پر سورتوں کا حوالہ دیدیا ہے۔ امید ہے کہ اکثر حالتوں میں صحیح ہوگا۔ سر دست محض ایک عزیز کی خواہش کی تعمیل پیش نظر ہے۔ انطباع و اشاعت مقصود نہیں۔ زمانے نے اگر مہلت دی تو نظر ثانی کے وقت مزید تصحیح و تہذیب ہوجائے گی۔ معہذا

اذا احسست فی لفظی قصوراً — وحفظی والبراعة والبیان

فلا تعجل الی لوی، فرقصی — علی مقدار ایقاع الزمان

دست از ہمہ کار شستہ ام، و چشم و گوش از عالم و عالمیان بستہ، و بر در دل نشستہ، تا چہ پیش آید و کدام در بکشایند عجب نیست کہ بحکم ما خاب من اناب۔ آن چارہ گر بیچارگان و راہ نمائے آوارگان بجانب خود طلبد، و من دیوانہ را سلسلۂ شوق در گردن افگندہ سوئے خود کشد، کہ دست امید بلند است، و پایۂ یقین ارجمند!

کانت لنفسی اھواء مفرقة — فاستجمعت اذ رأتك العین اھوائی

فصار یحسدنی من کنت احسدہ — وصرت مولی الوری اذ صرت مولائی

ترکت للناس دنیاھم و دینھم — شغلاً بحبك یا دینی و دنیائی!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین!

---

[1] ایک جرمن اورینٹلسٹ (Orientalist) کا نام